OSMANIA UNIVERSITY

جامعہ عثمانیہ

اصول معاشیات

سلسلۂ نصاب علمیہ جامعۂ عثمانیہ

اصول معاشیات

بی۔ اے کے لیے

مؤلفۂ

مولوی محمد الیاس صاحب برنی ایم۔ اے، ایل ایل۔ بی (علیگ)

سابق، پروفیسر معاشیات کلیہ جامعۂ عثمانیہ

حال، ناظم سررشتۂ تالیف و ترجمہ جامعۂ عثمانیہ

۱۳۵۴ھ م ۱۳۴۴ف م ۱۹۳۵ء

طبع دوم

دار الطبع جامعۂ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن
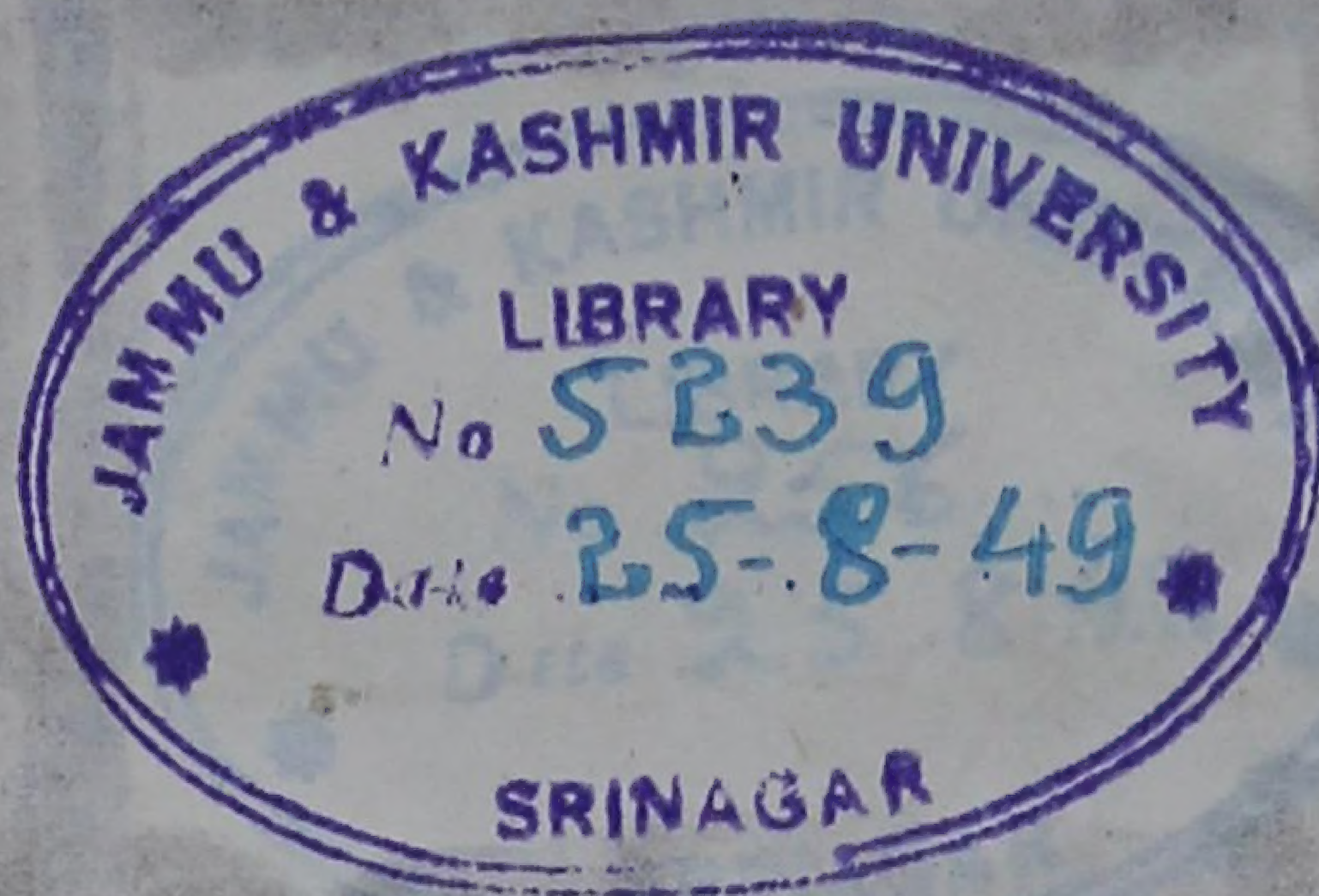
گزارش

(اشاعت ثانی)

بار دوم طبع ہوتے وقت اس کتاب پر نظر ثانی ہوگئی، کتابت کی غلطیاں رفع ہوگئیں، عبارت کی خامیاں درست ہوگئیں، اور بقدر ضرورت جابجا مضمون میں بھی اضافہ ہوا کہ تازہ معلومات شریک ہوجائیں یا بیان کی وضاحت بڑھ جائے الحاصل کئی لحاظ سے یہ دوسرا اڈیشن پہلے سے بہتر ہے فقط

جامعہ عثمانیہ
حیدرآباد دکن
اکتوبر سنہ ۱۹۳۵ء

محمد الیاس برنی

تمہید

(اشاعت اوّل)

معاشیات میں ایک کتاب "علم المعیشت" چھ سات سال قبل شائع ہو کر بہت مقبول ہو چکی ہے، مگر اس کتاب کے مخاطب عام ناظرین ہیں؛ اور اسی مناسبت سے اس میں مضمون اور بیان اختیار کیا گیا ہے۔ یہ کتاب "اصول معاشیات" اسی کا نصابی اڈیشن ہے جو خاص کر طلبہ کے درس کے واسطے مقصود ہے۔ عام دلچسپی کے مباحث میں بقدر مناسب تخفیف کر کے جا بجا طلبہ کے مفید مطلب مضامین اضافہ کر دیے گئے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ دونوں کتابوں میں بہت کچھ مشابہت اور کافی فرق نظر آتا ہے؛ مقابلہ کرنے سے اس کا پورا اندازہ ہو سکتا ہے، مزید تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد
اکتوبر ۱۹۲۲ء

محمد الیاس برنی

فہرست مضامین

حصۂ اوّل

مقدمہ

بابِ اوّل ۱—۲۷

معاشیات

بابِ دوم ۲۸—۴۷

معاشی تاریخ انگلستان

حصّہ دوم
پیدائش دولت

باب سوم
پیدائش کا مفہوم

باب چہارم
عاملین پیدائش

باب پنجم
زمین

باب ششم
محنت

باب ہفتم
اصل

باب ہشتم
طریق پیدائش

حصۂ سوم

تقسیم دولت

باب دوازدہم ۱۸۵-۱۹۶
ترقیات مزدوران

باب سیزدہم ۱۹۷-۲۲۲
سود

باب چہاردہم ۲۲۳-۲۳۶
منافع

باب پانزدہم ۲۳۷-۲۵۱
ترکیب عاملین پیدائش

باب شانزدہم

بلیمنڈ و افلاس

باب ہفدہم

امداد باہمی

باب ہیجدہم

ٹکس

حصہ چہارم

مبادلہ دولت

باب نوزدہم

قیمت

۳۷۶-۳۶۴

باب بستم

مقابلہ و اجارہ

۳۸۲-۳۷۷

باب بست و یکم

زر

۳۹۸-۳۸۳

باب بست و دوم

زر فلزی

۴۱۳-۳۹۹

باب بست و سوم

زر کاغذی

باب بست و چہارم

۴۱۴-۴۵۶

تجارت بین الاقوام

باب بست و پنجم

۴۵۷-۴۸۷

مبادلات خارجہ

باب بست و ششم

۴۸۸-۵۰۹

بنک

باب بست و ہفتم

۵۱۰-۵۳۲

قدر زر و مسئلۂ گرانی

حصۂ پنجم

باب بست و ہشتم ۵۳۳-۵۶۲

صرف دولت

تمت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حصّہ اوّل

مقدمہ

باب اوّل

معاشیات

(۱) علومِ عمرانی اور معاشیات (۲) وسعتِ معاشیات (۳) احتیاجات و افادہ (۴) مبادلہ پذیری (۵) مفہوم دولت (۶) اقسامِ دولت (۷) اشکالِ دولت (۸) قابلیت و خدمت کا فرق (۹) ملک پذیری (۱۰) معاشی جدّ و جہد (۱۱) علم معاشیات (۱۲) مباحثِ معاشیات (۱۳) نوعیت بحث (۱۴) معاشی قوانین (۱۵) معاشیات کا دیگر علوم سے تعلق (۱۶) طریق معاشیات (۱۷) معاشیات کی تاریخ (۱۸) معاشیات کی قدیم تصانیف (۱۹) معاشیات کی موجودہ ضرورت؛

علومِ عمرانی اور معاشیات

۱- انسان مدنی بالطبع مخلوق ہے۔ لوگ مل جل کے رہتے ہیں۔ اسی طرح زندگی خوب سہولت و راحت سے بسر ہوتی ہے۔ تمام دنیا میں بیشمار گاؤں قصبے اور بڑے بڑے شہر آباد ہیں۔ اور پھر ان کے درمیان بکثرت سلسلۂ آمد و رفت جاری ہے۔ آپس کے میل جول میں گوناگوں تعلقات قائم ہوگئے ہیں۔ ان تعلّقات کی باقاعدہ تدوین اور ان کی تشریح و توجیہ اول علم تمدّن سے شروع ہوئی۔ مگر ایسے وسیع مضمون کا

ایک علم میں سمانا دشوار تھا۔ بالآخر بنظر سہولت یہ کام چند عمرانی علوم میں تقسیم ہو گیا۔ لوگوں کی کیا کیا احتیاجیں ہیں اور وہ کیونکر پوری ہوتی ہیں۔ لوگ حصول معاش کیواسطے کس طرح جدّوجہد کرتے ہیں۔ باہمی مدد سے کس طرح کاروبار چلتے ہیں اور کیونکر ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ گویا کوئی جماعت کیونکر پرورش پاتی اور زندہ رہتی ہے۔ اور مرفہ الحالی کی کمی بیشی کے کیا اسباب ہیں۔ یہ تحقیقات اکنامکس یا معاشیات کا فریضہ ہے۔ اس علم کو جماعت انسانی سے وہی تعلق ہے جو عضویّات اور علم طب کو بدن افراد سے۔

اوپر کے بیان سے واضح ہوا کہ معاشیات میں انسان کی کوششوں اور کاموں کے ایک خاص پہلو پر نظر کی جاتی ہے۔ اس کو تمام انسان کاروبار میں مصروف اور اپنی اپنی ضروریات حاصل کرنے میں کوشاں نظر آتے ہیں۔ اسی طرح بعض دیگر علوم انسانی گروہ کے افعال پر دوسرے زاویہ نگاہ سے نظر ڈالتے ہیں مثلاً علم الاخلاق، مذہب یا عقل کی عینک لگا کر لوگوں کے باہمی سلوک کی بھلائی برائی دیکھتا ہے۔ علمِ قانون کی نظر سے تمام لوگ اپنے اپنے حقوق کی حفاظت اور حق تلفی کے معاوضہ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ علمِ سیاست کے خیال سے سب آدمی سلطنت کے نظم و نسق اور حکومت کی کل چلانے میں لگے ہوئے ہیں۔ علمِ معاشرت انسانی جماعتوں کے مختلف طرزِ بود و باش، ان کے عجیب رسم و رواج اور عادات و روایات کا منظر دکھاتا ہے۔ غرضکہ معاشیات، اخلاقیات، قانون، سیاسیات اور علمِ معاشرت یہ چند علوم عمرانی ایک ہی چیز یعنی گروہ انسان کے افعال کو مختلف نظروں سے دیکھتے اور ان کے مختلف پہلوؤں سے بحث کرتے ہیں۔ چونکہ انسانوں کے باہمی تعلقات ان تمام علوم کا مشترک موضوع ہے ان کو اصطلاحاً علومِ متجانسہ بھی کہتے ہیں۔ گویا ایک ہی جنس یعنی علمِ تمدّن کی مختلف نوعیں اور شاخیں ہیں ؛

یہ سب علوم آپس میں اس قدر رلے ملے ہیں کہ ایک بھول بھلیاں معلوم ہوتے ہیں اور ان کے درمیان حدّ فاصل قائم کرنا محال ہے۔ جس طرح کہ ہوا میں گرد و نواح کی چیزوں سے سردی، گرمی، نمی، خشکی، آواز اور بو پھیلتی ہے۔ علومِ متجانسہ کے آثار بھی ایک دوسرے علم کی بحث میں اسی طرح پیوستہ نظر آتے ہیں۔ جو کچھ تفریق کی جاتی ہے وہ بیشتر وضعی ہے کسی قطعی اصول کی پابند نہیں۔ تاہم سہولتِ مطالعہ سخت مقتضی ہے

کہ علم تمدن سا وسیع علم اور پیچ در پیچ بحث چند کم و بیش جداگانہ علوم میں تقسیم کیا جائے۔ چنانچہ اسی وجہ سے تفریق باوجود ناقص ہونے کے برقرار رکھی گئی۔ اور یہ تجربے سے بہت مفید ثابت ہو رہی ہے ؛

معاشیات میں بعض علوم غیر متجانسہ مثلاً نفسیات، منطق اور سائنس کے اصولوں سے بطور مسلمات کام لیا جاتا ہے۔ معاشیات کے علوم متجانسہ اور غیر متجانسہ سے جو کچھ بھی تعلقات ہیں، ہم آئندہ ان کی مزید توضیح کریں گے۔ علاوہ بریں معاشی مباحث اور مسائل پر غور و خوض کرنے سے خود بخود تفصیل اور تمثیل پیش نظر ہو جائے گی ؛

اس کا وسعت معاشیات

۲۔ کسی علم کی وسعت پر نظر کرنے میں تین امور پر توجہ کرنا ضرور ہے: نفس مضمون کیا ہے، بحث کی نوعیت کیا ہے، نیز یہ کہ اگر اس علم کا بعض دیگر علوم سے تعلق ہے تو کیا ہے۔ معاشیات کے متعلق ان تینوں امور کی مختصر تشریح یہاں ضروری معلوم ہوتی ہے ؛

احتیاجات و افادہ

۳۔ اوّل معاشیات کے نفس مضمون کو لیجئے۔ انسانی جماعتوں کی احتیاجیں کیا ہیں اور کیونکر پوری ہو رہی ہیں؟ معاشیات میں اسی دشوار سوال کا جواب دینا اصل مقصود ہے۔ گویا اس کے مباحث کا مرکز اور محور انسانی احتیاجات ہیں۔ ان ہی کو معاشیات کی جان سمجھنا چاہئے۔ چنانچہ آئندہ مطالعہ سے واضح ہوگا کہ اگر انسان احتیاجات کا پتلا نہ ہوتا تو یہ علم بھی نمودار نہ ہوتا۔ معاشیات میں احتیاج کا مفہوم نہایت وسیع ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ احتیاج حقیقی ہے یا وہمی ہے۔ دائمی ہے یا عارضی۔ قدرتی ہے یا رسمی۔ طبعی ہے یا غیر طبعی۔ قوی ہے یا ضعیف۔ قدیم ہے یا جدید۔ اختیاری ہے یا اضطراری۔ جائز ہے یا ناجائز۔ بھلی ہے یا بری۔ احتیاج کسی قسم کی بھی ہو اُس کا لحاظ کیا جاتا ہے، کوئی نظر انداز نہیں ہوتی۔ اور احتیاج پورا کرنے کی صلاحیت جو چیزوں میں پائی جاتی ہے وہ اصطلاحاً افادہ کہلاتی ہے۔ مثلاً پانی پیاس بجھاتا ہے۔ آگ گرمی اور روشنی دیتی ہے۔ چھتری دھوپ اور بارش کی تکلیف سے بچاتی ہے۔ عمدہ لباس اور زیور جسمانی آرائش کی خواہش پوری کرتے ہیں۔ پھولوں کی مہک اور باجوں کے سُریلے راگ دماغ کو فرحت اور دل کو سُرور بخشتے ہیں۔ بوسیدہ قلمی کتابیں، پھٹی پرانی تصویریں، ٹوٹے پھوٹے برتن، محققین آثار قدیمہ کے نزدیک بیحد قابل قدر ہوتے ہیں۔ دوا مرض کھوتی ہے۔ افیون اور

حصۂ اوّل
باب اوّل

کوکین جیسی مُضرِ صحت چیزوں سے بھی نشہ کے شائقین کو ایک خاص لذّت حاصل ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ زہر بھی جان ستانی یا خودکشی کی افسوسناک احتیاج پوری کر دیتا ہے غرضکہ معاشی نقطۂ نظر سے انسان کو گوناگوں احتیاجوں نے گھیر رکھا ہے اور وہ اکثر اوقات براہ راست یا بالواسطہ ان ہی کے پورا کرنے میں کوشاں اور منہمک رہتا ہے۔ بیشمار چیزیں اس کو اس کام میں مدد دیتی ہیں یعنی احتیاجوں کو پورا کرتی ہیں۔ اور ان کی یہ صلاحیت اور خاصیت کہ احتیاجوں کو پورا کر سکیں اصطلاحاً افادہ کہلاتی ہے صفتِ افادہ کی اہمیت آگے چل کر دولت کے بیان میں ظاہر ہوگی ؛

مُبادلہ پذیری

۴۔ معاشیات میں افادے کے علاوہ چیزوں کی ایک اور صفت بھی خاص توجہ چاہتی ہے یعنی مبادلہ پذیری۔ چند چیزیں تو ایسی ہیں کہ ہمارے کام آتی ہیں لیکن ہم اُن کا دوسری چیزوں سے کسی طرح مبادلہ نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ہمارے قبضے اور تصرف سے باہر ہیں۔ مثلاً چاند، سورج، ہوا، سمندر۔ اور بعض چیزوں کے مبادلے کو ہم فضول اور بیحاصل سمجھتے ہیں کیونکہ بکثرت دستیاب ہوتی ہیں اور کسی کی خاص ملک نہیں۔ مثلاً لبِ دریا پانی جنگلوں میں خودرَو پھل پھول اور لکڑی۔ لیکن بیشتر چیزوں کا ہم مبادلہ کر سکتے ہیں اور ایسا کرنا ضروری بھی سمجھتے ہیں۔ مثلاً غلّہ، کپڑا، مویشی، مکان اور ہر قسم کا سامان جس کی تجارت پھیلی ہوئی ہے۔ ایسی ہی چیزوں کو معاشیات کے مباحث سے خاص تعلق ہے۔ اور ان کی یہ صفت کہ مبادلہ ممکن ہو اور ضروری بھی سمجھا جائے اصطلاحاً استبدال یا مبادلہ پذیری کہلاتی ہے۔ ذیل میں اس کے متعلق چند ضروری نکات بیان کرتے ہیں :۔

اوّل افادے اور مبادلے کے باہمی تعلق کو ملاحظہ کیجئے۔ افادے کے واسطے تو مبادلہ شرط نہیں مثلاً چاند، سورج، ہوا اور بادل میں اگرچہ بہت کچھ افادہ موجود ہے تاہم ان کا مبادلہ ممکن نہیں لیکن مبادلے کے واسطے افادہ لازمی ہے۔ کیونکہ اگر اشیاءِ متبادلہ سے فریقین کی احتیاجیں ہی رفع نہ ہو سکیں گی تو پھر ان کے مبادلے کی تکلیف کوئی فضول کیوں گوارا کرنے لگا۔ ہر شخص جانتا ہے کہ صرف کارآمد چیزوں کا لین دین ہوتا اور ہو سکتا ہے۔ ردّی اور نکمی چیزوں کا مبادلہ کون کرتا ہے۔ المختصر مبادلہ افادے کی شرط نہیں ہے لیکن افادہ مبادلے کے واسطے لازمی ہے ؛

یہاں پر ایک اور نکتہ سمجھنا بھی ضرور ہے وہ یہ کہ چیزوں میں افادے کی محض موجودگی

مبادلے کے واسطے کافی نہیں بلکہ یہ بھی شرط ہے کہ انسان کو افادے کے علم اور چیزوں پر دسترس ہو۔ مثلاً جبتک کہ مشہور دوا کنین کے خواص معلوم نہیں ہوئے تھے وہ محض نکمّی چیز سمجھی جاتی تھی کوئی اس کا نام بھی نہیں لیتا تھا، اور نہ اسوقت کوئی اسکا مبادلہ کرتا تھا حالانکہ فی نفسہ وہ افادہ اس میں اس وقت بھی موجود تھا جس کے دریافت ہونے پر وہ بعد کو قابل مبادلہ ہوگئی۔ اس وقت کہیں مبادلے کی نوبت آسکتی ہے۔ مثلاً چاندی سونا جو نہایت ہی گہری کانوں میں دبا پڑا ہوگا ہمارے نزدیک ایسا ہی بیکار ہے جیسے مریخ کی خیالی دولت۔ گو ایسے چاندی سونے میں افادہ موجود ہے مگر دسترس سے باہر ہونے کی وجہ سے وہ ہمارے نزدیک مٹی بلکہ اس سے بھی گیا گزرا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان کا مبادلہ ممکن نہیں۔ پس علم و دسترس بغیر محض افادے کی موجودگی مبادلے کی بنا نہیں ہوسکتی؛

مبادلے کے واسطے افادے کے علاوہ ایک اور شرط بھی ضروری ہے۔ وہ یہ کہ کم از کم مابین فریقین اشیائے مطلوبہ کی مقدار محدود ہو اور وہ کسی کی ملک ہو۔ خود تملیک میں تعین مقدار مضمر ہے۔ کسی چیز کا غیر محدود مقدار میں دستیاب ہونا ظاہر کرتا ہے کہ وہ کسی خاص شخص کی ملک نہیں اور ہر کسی کو بلا تعرض دیگرے میسر ہوسکتی ہے مثلاً ہوا، دھوپ، چاندنی۔ یا نمونہ روہ جنگل میں لکڑی اور لب دریا پانی۔ گنگا کے کنارے نہ پانی کی کمی اور نہ وہ کسی کی ملک، جو جتنا چاہے پانی بہائے، پیئے اور گھر لے جائے، مبادلے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر دور افتادہ مقامات میں خوش اعتقاد ہندو دل کھول کر گنگا جلی کی قیمت اس وجہ سے دیتے ہیں کہ وہاں گنگا تو بہتی نہیں۔ صرف اتنا ہی تھوڑا سا پانی جو بیچنے والے کے پاس ہے دستیاب ہوسکتا ہے۔ لہذا بوجہ تعین مقدار و تملیک گنگا جلی قابل مبادلہ ہوجاتی ہے۔ تحقیق طور پر سنا ہے کہ سیب، انار، انگور جیسے قیمتی میوے افغانستان میں اس کثرت سے پیدا ہوتے ہیں کہ جو چاہے ہر روز دام ڈالے بغیر گرد و نواح کے درختوں سے جی بھر کر کھا لیتا ہے۔ گویا چونکہ کثرت پیدا وار کے سبب سے ان میں تعین مقدار اور تملیک کی صفت کم پائی جاتی ہے ان کا مبادلہ بھی کم ہوتا ہے۔ مبادلے کی اس شرط کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے ع لعل قیمت کو پہنچتا ہے بدخشاں چھوڑ کر

مفہوم دولت

۵۔ دولت کا مفہوم ان چند مباحث میں سے ہے جن پر معاشیات میں

بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ مگر اب تک کوئی قطعی تصفیہ نہ ہو سکا۔ بہت سی چیزیں ہیں کہ جن کی دولت شمار کرنے نہ کرنے پر ابھی تک اختلاف رائے موجود ہے۔ تاہم غالباً اس اصطلاح کے بہترین معنی مسٹر کینس نے اپنی لاجواب اور مشہور کتاب اسکوپ اینڈ میتھڈ آف اکنامکس (وسعت و طریق معاشیات) میں بیان کئے ہیں۔ اُن کے نزدیک دولت میں وہ تمام چیزیں اور صرف وہی چیزیں شامل ہیں جن میں افادہ اور مبادلہ پذیری کی دونوں صفتیں موجود ہوں۔ دولت کی اس قدر مختصر مگر جامع تعریف کی تشریح افادہ و مبادلہ پذیری کے مذکورۂ بالا بیان سے بخوبی ظاہر ہوگی ؛

اقسام دولت

۶۔ دولت کی مذکورۂ بالا تعریف سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشیات میں دولت سے مراد شخصی دولت ہے لیکن بمقتضائے ضرورت خود معاشیات نے اس کے اصطلاحی معنوں میں کچھ کچھ ترمیم بھی کی ہے۔ مثلاً انسان کے ذاتی خصائل و اوصاف جیسے شرافت، وجاہت، عزت، اعتبار، ہر دلعزیزی جو کاروبار میں بالواسطہ مدد دیتے ہیں ذاتی دولت کہلاتے ہیں۔ اسی طرح پہاڑ، جنگل اور دریا جو ملک کی آب و ہوا اور زرخیزی پر اپنا قوی اثر ڈالتے ہیں، خوشگوار موسم، دلکش مناظر، مہذب سوسائٹی، روشن خیال حکومت وغیرہ جو معاشی ترقیات کے لازمات ہیں، قومی دولت کہلاتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان میں گنگا اور انگلستان میں دریائے ٹیمس قومی دولت کا بیش بہا حصہ شمار ہوتا ہے۔ ہمالیہ پہاڑ بھی ہندوستان کی خاص قومی دولت ہے۔ معاشی حالات پر اس کا گوناگوں اثر پڑتا ہے۔ علاوہ بریں ساتوں سمندر جو بادبرشکال و جہازرانی کے ذریعے دنیا کی معاشی بہبودی میں بہت مدد دیتے ہیں، اقوامی دولت کہلاتے ہیں۔ اگرچہ ان تینوں آخری دولت کی قسموں میں سوائے افادے کے استبدال نہیں پایا جاتا تاہم معاشیات کو مجبوراً اُن کا لحاظ کرنا پڑا۔ کیونکہ براہِ راست یا بالواسطہ خاص معاشی دولت کی پیدائش میں ان سے قابل قدر بلکہ اکثر ناگزیر امداد ملتی ہے۔ نیز ہوا، چاند، سورج جن کا افادہ اظہر من الشمس ہے، عالمی دولت کہلاتے ہیں ؛

بالفاظ مختصر دولت کی دو عام قسمیں ہیں، معاشی اور غیر معاشی۔ شخصی دولت کو معاشی کہتے ہیں۔ غیر معاشی کی پھر دو قسمیں ہیں، داخلی و خارجی۔ ذاتی دولت کو داخلی کہتے ہیں۔ خارجی کی پھر تین قسمیں ہیں، عالمی، اقوامی، قومی، جن کی صراحت اوپر موجود ہے۔

قومی دولت کے دو مفہوم اور بھی ہیں۔ ایک تو قوم کے نائب اداروں کی دولت۔ مثلاً میونسپلٹی یا حکومت کی دولت، کہ یہ ادارے قوم کے نائب شمار ہوتے ہیں؛ قومی دولت کہلاتی ہے۔ دوسرے قوم کے تمام افراد کی مجموعی دولت کی بھی قومی دولت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اسی طرح گویا معاشیات میں قومی دولت تین معنی میں مستعمل ہے؛

۷۔ دولت کا اصلی مفہوم اور اس کے دوسرے اقسام بیان کرنے کے بعد اب اشکال دولت ان چیزوں کی تفصیل باقی ہے جو معاشی دولت میں شامل ہو سکتی ہیں۔ انکی حسب ذیل چار قسمیں ہیں:-

۱۔ مادی اشیاء منقولہ یا غیر منقولہ مثلاً غلہ، کپڑا، گھوڑا، مکان، باغ اور ہر قسم کی املاک جائداد؛

۲۔ مادی اشیاء کی ملکیت اور استعمال کے حقوق مثلاً کتاب کا حق تصنیف، آلات کا حق ایجاد، دخیلکار کاشتکار کا حق کاشت، کسی کارخانے کی نیکنامی۔ جدید قانون نے چیزوں کے علاوہ ان کے بعض متعلقہ حقوق کو جداگانہ طور پر قابل بیع و شری بنادیا ہے گویا ان میں افادہ و استبدال جمع ہو گیا ہے۔ لہٰذا یہ حقوق بجائے خود بھی دولت ہیں؛

۳۔ ذاتی خدمات خواہ ان کا نتیجہ مادی شکل سے نمایاں ہو یا نہ ہو۔ مثلاً لوہار، بڑھئی، معمار، درزی، باورچی اور حجام کا کام، یا تعلیم جو مدرسوں میں جاری ہے، اور یا مثلاً گانا، بجانا، ورزشی کرتب اور کھیل تماشے جو عموماً تھیٹر اور سرکس میں دکھائے جاتے ہیں؛

۴۔ ذاتی خدمات لینے کا حق۔ مثلاً ریلوے کمپنیوں کا اپنے ملازموں پر، تھیٹر یکل کمپنی کا ایکٹروں پر، ٹرسٹیان کالج کا پروفیسروں پر۔ جب کبھی ہم ان حقوق کے ذریعے نہ کہ براہ راست ان خدمات سے مستفید ہونا چاہتے ہیں تو اس حق کے معاوضے میں حقداروں یعنی مالکان کمپنی یا ٹرسٹیان کالج کو کچھ روپیہ کرایہ یا فیس کے طور پر ادا کرتے ہیں؛

پہلی شکل میں تو دولت کو ہر کوئی پہچانتا ہے۔ البتہ تیسری شکل میں شناخت کی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔ جب ہم خدمات کا بخوشی معاوضہ دیتے ہیں، خواہ نتیجہ مادی شکل میں ظاہر ہو یا نہ ہو مثلاً کھانا پکانا، کپڑا سینا، پنکھا جھلنا، پڑھانا لکھانا، گانا بجانا، تو گویا خدمت میں بھی صفاتِ افادہ و استبدال موجود ہیں اور وہ بھی دولت کی ایک شکل ہیں۔ رہے دولت کے ملک اور استعمال کے حقوق سو وہ بھی افادہ و استبدال کی موجودگی سے دولت ہیں۔ ان اجمالی اصول کی تفصیل کاروباری دنیا میں ہر طرف پھیلی ہوئی ہے؛

حصۂ اوّل
باب اوّل

قابلیت اور خدمت کا فرق

۸۔ خدمت کے سلسلے میں ایک نکتے کی توضیح ضرور ہے اور وہ یہ کہ قابلیت اور خدمت دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ خدمت کے واسطے قابلیت شرط ہے مگر قابلیت سے خدمت لازم نہیں آتی۔ مثلاً عمدہ گانے کے واسطے خوش گلوئی اور بلند آوازی شرط ہے۔ اعلیٰ معلم یا مصنف ہونے کے لیے عالم ہونا ضروری ہے لیکن ہر خوش گلو اور بلند آواز شخص گانا نہیں جانتا اور نہ ہر صاحب علم مصنف یا معلم ہوتا ہے۔ مگر قابلیت دولت شمار نہیں ہو سکتی کیونکہ اگرچہ وہ خدمت کی شرط اور بنا ہے لیکن بذات خود اس میں دولت کے صفات نہیں پائے جاتے نہ استبدال نہ افادہ۔ مثلاً کوئی شخص گو وہ اپنے فن میں کیسا ہی کامل کیوں نہ ہو کوئی طبیب خواہ وہ کیسا ہی حاذق کیوں نہ ہو کوئی وکیل ہر چند وہ قانون دان کیوں نہ ہو ہم ان میں سے کسی کو بھی محض قابلیت کی وجہ سے کچھ نہیں دیتے۔ البتہ جب وہ اپنی قابلیت عمل میں لاکر ہماری خدمت کرتے ہیں یعنی طبیب مرض کا علاج کرتا ہے اور وکیل مقدمے کی پیروی تو ان خدمات کے صلے میں ہم اُن کو بلا عذر و حجت بھر مٹھی فیس دیتے ہیں۔ محض قابلیت نہ صرف فریق ثانی کے واسطے بلکہ خود صاحبِ قابلیت کے واسطے بھی افادے سے خالی ہے۔ مثلاً کسی کو اپنے اچھے گویے ہونے سے کیا لطف حاصل ہو سکتا ہے جبتک کہ وہ گاے نہیں۔ البتہ یہ اختیار ہے کہ اوروں کو بھی سنائے یا خود ہی لطف اٹھائے۔ علیٰ ہذا نری علمیت کس کام کی جب تک کہ وہ عالم کو غور و فکر کی طرف مائل نہ کرے۔ البتہ یہ امر اختیاری ہے کہ عالم اپنے خیالات کے لطف میں دوسروں کو بھی بذریعہ تحریر یا تقریر شریک کرے یا نہ کرے۔ ادیب، فلسفی، شاعر جب ہر ایک اپنی قابلیت سے کام لیتا ہے تو کہیں اس کو اور سامعین یا ناظرین کو لطف آتا ہے یعنی افادہ حاصل ہوتا ہے۔ ہر کام میں قابلیت اور خدمت کا یہی تعلق نظر آتا ہے۔ بس صاف ظاہر ہے کہ جو لوگ خداداد یا اکتسابی قابلیت سے کام نہیں لیتے وہ دیدہ و دانستہ بڑی دولت ہاتھ سے کھو دیتے ہیں:

افادے کی طرح دولت کی دوسری صفت استبدال بھی قابلیت میں مفقود ہے۔ گویا اپنے گانے سے سامعین کو محظوظ کر سکتا ہے، دوسروں کو فن موسیقی بھی سکھا تا ہے مگر اپنی خوش گلوئی اور بلند آوازی کسی قیمت پر منتقل یا فروخت نہیں کر سکتا، کیونکہ ایسا کرنا اُس کی قدرت سے باہر ہے۔ مصوّر تصویر بنا کر بیچتا ہے، اور شاگردوں کو

اس فنِ لطیف کی تعلیم بھی دے سکتا ہے، مگر اس کے ہاتھ کی صفائی اور قوّتِ تخیلہ ایسی چیزیں ہیں کہ بے شمار قیمت ادا کرنے پر بھی دوسروں کے قبض و تصرف میں نہیں آسکتیں۔ جب پروفیسر طلبہ کو تعلیم دیتا ہے تو گو طلبہ اپنے پروفیسر کے برابر بلکہ اس سے بڑھ کر علم حاصل کریں مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ پروفیسر نے اپنی علمیت طلبہ کو فیس کے معاوضے میں دے دی۔ علم کو دولت لازوال اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ وہ انسان سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ دراصل قابلیتیں سراسر خداداد ہوتی ہیں کہ وہ کسی دوسرے ذریعے سے میسّر نہیں آسکتیں۔ مثلاً فہم و ذکا، حسن و ظرافت، خوش گلوئی اور ہاتھ کی صفائی۔ البتہ قابلیتیں ایک سے دوسرے میں اس طرح بیدار ہوتی ہیں جیسے چراغ سے چراغ جلتا ہے، مگر مُبادلہ کسی طرح بھی ممکن نہیں ؛

پس ثابت ہوا کہ قابلیّت اور خدمت معاشی نقطۂ نظر سے دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ اور خدمت کی طرح قابلیّت کو ہم دولت اس وجہ سے نہیں کہہ سکتے کہ نہ اس میں افادہ ہے نہ استبدال ؛

۹۔ قابلیّت تملیک جو عموماً مادی چیزوں میں موجود اور غیر مادی میں مفقود ہوتی ہے، اصطلاحاً ملک پذیری کہلاتی ہے۔ گو مبادلے میں انتقال ملک اکثر شامل ہوتا ہے مگر لازمی نہیں۔ انتقال کے بغیر بھی مبادلہ ممکن ہے۔ مادّی اشیا کے مبادلے میں انتقال موجود ہوتا ہے مثلاً کتاب کے بدلے میں قلم، مکان کے بدلے میں باغ، روپے کے بدلے میں غلّہ اور کپڑا۔ مگر خدمات کے مبادلے میں کبھی انتقال ممکن ہوتا ہے اور کبھی نہیں۔ جن خدمات کا نتیجہ بشکل مادّی ظاہر ہوتا ہے مثلاً معمار، بڑھئی اور لوہار کا کام، ان کے مبادلے میں انتقال مانا جا سکتا ہے گویا کہ ایسی خدمات مادّی اشیا میں بشکل نتیجہ مقید رہتی ہیں۔ مگر جن کا نتیجہ بشکل مادّی ظاہر ہوتا ہی نہیں مثلاً تھیٹر میں گانا بجانا یا سرکس میں جرأت اور طاقت کے کرتب دکھانا، تو وہ بوجہ سریع الزوال ہونے کے ناقابل تملیک ہیں اور اسی وجہ سے مبادلے میں ان کا انتقال ممکن نہیں۔ اگر ایسی خدمات کا مبادلہ کسی مادّی چیز سے کیا جائے تو انتقال محض یکطرفہ ہوگا اور اگر ان کا آپس میں ایک دوسرے سے مبادلہ ہو تو کسی جانب بھی انتقال نہیں ہو سکتا۔ مثلاً جب ہم تھیٹر دیکھنے جاتے ہیں تو ایکٹروں کی خدمات کے صلے میں ہم ٹکٹ کی

مبادلہ پذیری و ملک پذیری

قیمت ادا کرتے ہیں۔ اس حالت میں صرف یکطرفہ انتقال ہوتا ہے۔ جب ہم تماشے سے واپس ہوتے ہیں تو کمپنی کا بکس تو ٹکٹ کے داموں سے بھرا ہوتا ہے اور سب تماشائی خالی جیب ہاتھ ہلاتے چلے جاتے ہیں۔ تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہم روپیہ کھو آئے؟ نہیں، بلکہ جو چیز ہم نے مبادلے میں لی وہ بوجہ سریع الزوال ہونے کے ناقابل انتقال تھی، اور پیدا ہوتے ہی ناپید ہو گئی۔ اگر سوال کیا جائے کہ لوگ تماشا دیکھنے کیوں جاتے ہیں، تو جواب ملیگا کہ لطف اٹھانے کے لیے۔ اس سے ثابت ہے کہ کسی ایسی چیز کا مبادلہ ضرور ہوتا ہے جس میں افادہ و استبدال موجود ہے، بالفاظ دیگر جو دولت ہے۔ مگر مذکورۂ بالا وجوہ کی بنا پر چونکہ اس کا انتقال ممکن نہیں اس وجہ سے تماشائی خالی ہاتھ نظر آتے ہیں:۔

اسی طرح فرض کرو کہ ایک شخص گانا اچھا جانتا ہے اور دوسرا شخص بانسری یا ہارمونیم بجانا اور وہ باری باری اپنے کمال سے ایک دوسرے کو محظوظ کریں تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ان کا یہ فعل مجنونانہ یعنی عبث اور بیحاصل ہے؟ نہیں، بلکہ ہر ایک کو دوسرے کی خدمت سے بیحد لطف حاصل ہوتا ہے۔ بالفاظ دیگر دونوں کی خدمت میں افادہ موجود ہے اور باری باری گا بجا کر وہ اپنی خدمات کے استبدال کا بھی ثبوت دیتے ہیں۔ پس وہ اپنی دولت کا ایسا ہی مبادلہ کرتے ہیں جیسا کہ قلم کا کتاب سے، یا مکان کا باغ سے، یا روپے کا غلے اور کپڑے سے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بوجہ سریع الزوال ہونے کے اُن کی دولت کے مبادلے میں انتقالِ ملک ممکن نہیں:۔

معاشی جدوجہد

۱۰۔ دولت کی ماہیت، اس کے اقسام اور اُس کی مختلف شکلیں واضح کر دینے کے بعد ہم معاشیات کا موضوع سمجھانے میں ایک قدم آگے بڑھتے ہیں۔ نظر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اُن معدودے چند خاص کاموں کے علاوہ جو انسان مذہبی اثر سے بامید نفع آخرت کرتا ہے، باقی جس قدر کام ہیں وہ براہ راست یا بالواسطہ ہماری ایک نہ ایک موجودہ یا آئندہ احتیاج رفع کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں ہمارے اکثر کام کسی نہ کسی طرح دولت سے متعلق ہوتے ہیں۔ ایسے تمام کام اصطلاح میں معاشی جدوجہد کہلاتے ہیں:۔

علم معاشیات

۱۱۔ افادہ و استبدال سے دولت کی ماہیت اور دولت کے ذریعے سے معاشی جدوجہد کے معنی سمجھانے کے بعد اب ہم علم معاشیات کی تعریف یوں کر سکتے ہیں کہ

باب اوّل

معاشیات وہ علم ہے جو انسان کی تمام معاشی جدوجہد سے بحث کرتا ہے اور اس مجمل تعریف کی تفصیل یہ ہے کہ معاشی جدوجہد سے مراد انسان کے وہ تمام کام ہیں جو دولت سے متعلق ہوں، اور دولت میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جن میں افادہ و استبدال موجود ہو، یعنی جن میں احتیاج پوری کرنے کی صلاحیت پائی جائے اور جن کا مبادلہ ہوتا ہو۔ معاشیات کی ایک مختصر تعریف علم دولت بھی ہے۔ مگر بیان مذکورہ بالا سے ظاہر ہے کہ معاشیات کا اصلی موضوع انسانی احتیاجات اور ان کے پورا کرنے کی جدوجہد ہے اور دولت سے جو احتیاج پورا کرنے کا آلہ ہے، اس کا تعلق محض بالواسطہ ہے۔ اس مختصر تعریف نے موضوع معاشیات کے متعلق زمانۂ گزشتہ میں نہایت بے بنیاد غلط فہمی پیدا کر دی کہ گویا یہ علم دولت پرستی یا کم از کم کفایت شعاری کی تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ اسی مغالطے کی بدولت اس علم کی راہ ترقی میں تعصب اور مخالفت کی ایسی رکاوٹیں پیدا ہو گئیں کہ سالہا سال کی کوشش سے بمشکل رفع ہو سکیں۔ معاشیات میں دولت کی تقریباً وہی حیثیت ہے جو غذا اور دوا کی علم طب میں ہے۔ گو یہ اُس موضوع سے متعلق ضرور ہے لیکن بذات خود موضوع نہیں ؛

حاصل کلام یہ کہ معاشیات ایک عمرانی علم ہے، اور انسان کی اجتماعی زندگی کے ایک خاص پہلو سے بحث کرتا ہے۔ انسان کی احتیاجات کیا ہیں، اور وہ کس طرح پوری ہوتی ہیں، ان کے تحت قدرت کے کیا اصول و قوانین عمل پیرا ہیں؟ یہی تحقیق و تشریح معاشیات کے ذمے ہے ؛

مباحث معاشیات

۱۳۔ یہ تو معلوم ہو گیا کہ معاشیات کا موضوع کیا ہے۔ اس سلسلے میں مختصراً یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ معاشی جدوجہد چار صورتیں اختیار کر سکتی ہے: یا تو وہ دولت کی پیدائش سے متعلق ہو گی، یا تقسیم، یا مبادلہ، یا صرف دولت سے۔ اور ان چار صورتوں میں حسب ترتیب مذکورہ بالا ایک رشتۂ تعلق بھی قائم ہے۔ اول دولت پیدا کرتے ہیں پھر جو لوگ اس کام میں شریک ہوتے ہیں وہ اسے آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ پھر وہ بمقتضائے احتیاجات اپنی چیز کا دوسروں کی چیزوں سے مبادلہ کرتے ہیں۔ اور بالآخر اس کو کام میں لاتے ہیں۔ مثلاً کاشتکار اپنے ہل بیل، کھاد اور بیج لگا کر کچھ مزدوروں کی مدد سے زمیندار کے کھیت میں غلّہ پیدا کرتا ہے۔ جب جنس تیار ہوتی

ہے تو وہ زمیندار، مزدور اور کاشتکار کے درمیان لگان، اجرت اور منافع کی صورت میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ اس میں سے ہر ایک اپنا کل حصہ یا اس کا ایک جزو بازار میں فروخت کر کے حسب ضرورت کپڑا، جوتا اور ضروری سامان خریدتا ہے، جن کو وہ اپنے گھر لا کر استعمال کرتا ہے۔

اکثر کتب معاشیات میں معاشی جدوجہد کی ان ہی چار صورتوں یعنی پیدائش، تقسیم، مبادلہ اور صرفِ دولت کی بحث نظر آتی ہے۔ واضح ہو کہ مباحث کی مذکورہ بالا ترتیب سے علمی بیان میں سہولت ہو جاتی ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ عملاً صرف دولت بنفسہ پیدائش پر مقدم ہے اور مبادلہ تقسیم دولت پر۔ آئندہ مطالعے اور تحقیق سے یہ نکتہ خود واضح ہو جائے گا۔ یہاں صرف اشارہ ضروری سمجھا گیا۔

نوعیتِ بحث

۱۴۔ وسعتِ معاشیات کے پہلے جزو یعنی نفس مضمون کی مختصر تشریح اور پیش ہوئی۔ اب اُس کے دوسرے جزو یعنی نوعیت بحث کو دیکھیے کہ کس نقطۂ نظر سے مضمون کے متعلق بحث کی جاتی ہے۔ عُلما میں مدت سے یہ بحث جاری ہے کہ معاشیات آیا محض علم ہے، یا فن، یا دونوں کا مجموعہ، اور آیا من حیث العلم وہ علم معیاری ہے، یا علم ایجابی، یا دونوں کا مرکب۔ اس بحث پر بے حد اختلافِ رائے پھیلا ہوا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ جو موانع علوم متجانسہ کی تفریق میں پیش آتے ہیں، وہی بدرجۂ اولیٰ یہاں سدِّ راہ بنتے ہیں۔ اور اس سوال کا جواب بھی کسی متفق علیہ اصول کے بجائے کم و بیش اپنی اپنی رائے سے دیتے ہیں۔ معاشیات کی بحث پانچ جداگانہ درجوں میں منقسم ہو سکتی ہے:۔

۱۔ معاشی جدوجہد کا صحیح و کامل بیان۔

۲۔ معاشی جدوجہد کی توجیہ اور معاشی قوانین کی تحقیق۔

۳۔ کسی ایک معیار کا تعین جس سے معاشی معاملات کی بھلائی برائی دریافت ہو سکے۔

۴۔ مذکورۂ بالا معیار کے ذریعے سے بہبودی اور مرفہ الحالی کے مفید و معاون اصول منتخب کرنا۔

۵۔ اصول منتخبہ پر کاربند ہونے کے طریق و تدابیر تجویز کرنا۔

ان میں سے بحث کے پہلے دو درجے علم ایجابی کے تحت ہیں، بعد کے دو، علم معیاری سے متعلق ہیں، اور پانچواں فن معاشیات میں داخل ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ بحث کی مذکورۂ بالا تینوں حیثیتوں کا لحاظ لابُد اور ناگزیر ہے۔ علم ایجابی بغیر علم معیاری

اور فن کی تحصیل ممکن نہیں۔ اور ہر حالت میں معاشیات کا علم ایجابی ہونا لازمی ہے لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ محض علم ایجابی بذات خود کچھ کارآمد اور نتیجہ خیز نہیں جب تک کہ اس کا علم معیاری اور فن سے اتصال نہ ہو۔ بھلا معاشی جائزہ جہد کے بیان و توجیہ اور قوانین اساسی کی تحقیق سے کیا فائدہ اگر اس کے بعد بہبودی اور مرفہ الحالی کے اصول نہ قرار دیئے جائیں اور نیز ان پر عمل پیرا ہونے کی تدبیریں نہ نکالی جائیں۔ ان علوم اور فن کا گہرا تعلق اور باہمی لزوم سب تسلیم کرتے ہیں۔ جو کچھ اختلاف رائے ہے وہ انکی نسبتی اہمیت، ترتیب اور تسمیہ سے متعلق ہے۔ مدت تک بحث کی یہ تینوں حیثیتیں بلا تفریق معاشیات میں شامل رہیں لیکن ایک جدید گروہ نے ان تینوں کی تفریق مفید بلکہ ضروری خیال کر کے اصول تقسیم کار کے مطابق معاشیات کو علم ایجابی تک مخصوص کر کے علم معیاری اور فن کو بہ ترتیب فلسفۂ تمدن اور مالیات کے تحت محول کر دیا۔ مثلاً مسئلۂ ٹکس کو فرض کیجئے:۔

۱۔ ٹکس کی ماہیت اور ادا کرنے والوں پر اس کا گوناگون اثر دریافت کرنا معاشیات کا ذاتی کام ہے۔

۲۔ ٹکس کے ایسے اصول قرار دینا کہ وہ ملک کے حق میں سراسر مفید ہو سکے فلسفۂ تمدن سے متعلق ہے۔

۳۔ اور ٹکس کے مذکورۂ بالا اصول پر کاربند ہونے کی تدابیر نکالنا مالیات کے ذمے ہے۔

آئندہ ٹکس کے بیان میں اس مثال کی تشریح ملیگی، یہاں اجمالاً اشارہ کافی ہے۔

واضح ہو کہ بحث کی اس جدید تفریق و تقسیم کی تائید میں چند کافی معقول اور قابل لحاظ وجوہ پیش کی جاتی ہیں۔ جن میں سے ایک صفائی بیان اور سہولت تفہیم بھی ہے۔ گویا علمی بحث پیش کرنے میں یہ تفریق بہت مفید مطلب ہے۔ اور علوم متجانسہ کی طرح علمی حیثیت سے تفریق کے بعد بھی ان تینوں کے رشتے اور تعلق میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جس طرح علمائے معاشیات بلا تکلف حسب ضرورت علوم متجانسہ کے قوانین اور ان کے اثروں کا معاشی مباحث میں پورا لحاظ کرتے ہیں، اسی طرح بمقتضائے ضرورت مذکورۂ بالا حیثیتیں بھی معاشی مباحث میں ایک جا پیش کیجاتی ہیں چنانچہ حامیان تفریق نے بھی معاشی کتابوں میں جا بجا یہی طریق اختیار کیا ہے۔ لیکن اس سے اُن پر ترک تفریق کا الزام عائد نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ آخری دو حیثیتوں کا لحاظ بطور علوم متجانسہ کرتے ہیں اور ان کو قدیم گروہ کی طرح خود معاشیات کا جزو تسلیم نہیں کرتے۔ بعض علمانے

فن معاشیات اور مالیات میں بھی تفریق کرکے اوّل کو آخر کا ماخذ قرار دیا ہے۔ لیکن یہ فرق کچھ زیادہ نتیجہ خیز نہیں ؛

حاصل کلام یہ کہ معاشیات اپنی حدّ ذات میں نہ کفایت شعاری کی تلقین کرتا ہے نہ فضول خرچی کی ممانعت، نہ دولتمند بننے کا راز بتاتا ہے نہ مفلسی دور کرنے کی تدبیر۔ وہ علم ایجابی ہے اور محض معاشی جدّوجہد کی تشریح و توجیہ اور اساسی قوانین کی تحقیق اس کا کام ہے۔ البتہ فلسفۂ تمدن اور مالیات کو اصول مرفہ الحالی اور ان پر کاربند ہونے کی تدابیر ضرور بتاتا ہے۔ اگر ایک ہی شخص یہ تینوں کام انجام دینا چاہے تو اس کی تین جداگانہ حیثیتیں ہوں گی یعنی جہاں وہ عالم معاشیات کہلائیگا وہاں فلسفی تمدن اور ماہر مالیات بھی مانا جائیگا۔ اور محض پہلی حیثیت میں آخری دو کام باوجود نہایت موزوں ہونے کے اس کے حلقہ فرائض سے باہر ہیں۔ چونکہ علم ایجابی شرطاً اوّل ہے اور علم معیاری اور فن یہ ہر دو غرض و غایت ہیں اس لیے نہ صرف عملی میدان میں یہ تینوں دوش بدوش چلتے ہیں بلکہ علمی بزم میں بھی زانو بزانو بیٹھتے ہیں۔ ان کے قریبی تعلقات سب کو تسلیم ہیں جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں صرف ترتیب اور تسمیہ پر اختلاف رائے ہے۔ ایک گروہ انکی تفریق کو غیر ضروری بلکہ بے معنی قرار دیکر تینوں کو معاشیات میں شامل کرتا ہے۔ دوسرا ایسی تفریق مفید بلکہ ضروری سمجھ کر ان کو معاشیات، فلسفہ تمدن، اور مالیات میں تقسیم کرتا ہے۔ اور یہی رائے آجکل زیادہ مقبول اور معمول بہ بنی ہوئی ہے ؛

اس علم کی ایک تقسیم معاشیات نظری اور معاشیات عملی بھی ہے۔ قسم اول میں علم ایجابی داخل ہے، قسم دوم فن معاشیات یا مالیات کا دوسرا نام ہے۔ اور بحیثیت علم معیاری معاشیات ہر دو قسم میں بمدارج مختلف مشترک شمار ہوتا ہے ؛

معاشی قوانین اور مفروضات

۱۴۔ معاشیات کے نفس مضمون اور نوعیت بحث پر غور کرنے کے بعد معاشی قوانین کی حالت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ ہر علم میں قانون سے مراد یہ واقعہ ہے کہ کسی سبب یا چند اسباب سے ہمیشہ ایک ہی نتیجہ یا یکساں نتائج پیدا ہوں مثلاً جب ہم کوئی چیز ہوا میں اچھالتے ہیں تو وہ بالآخر زمین پر گرتی ہے۔ اسی واقعے کو قانون کشش مرکزی سے تعبیر کرتے ہیں۔ جس کا منشا یہ ہے کہ زمین ہر چیز اپنی طرف کھینچتی ہے لیکن اگر اڑتے ہوئے پرندا اور غبارے اور درختوں میں لگے ہوئے پھل اور منبر پر رکھی ہوئی

کتابیں زمین پر نہیں گرتیں تو کیا اس سے قانون کی صحت پر حرف آسکتا ہے؟ نہیں، ان چیزوں پر قانون برابر عمل کر رہا ہے، لیکن اسباب مزاحم یکساں نتیجہ پیدا نہیں ہونے دیتے۔ تقریباً ہر قانون کی ایسی مزاحمت ممکن ہے۔ چنانچہ ہر قانون کے عمل میں موانع کی عدم موجودگی فرض کر لیجاتی ہے گویا قوانین مشروط ہوتے ہیں۔ مادّی علوم میں تو ہر قانون کے اسباب اور نتائج اور موانع کی پوری تحقیق اور تفریق ممکن ہے، اسی وجہ سے یہ قوانین خوب معیّن ہوتے ہیں لیکن علوم عمرانی کے قوانین کی حالت مختلف ہے۔ چونکہ یہ علوم گروہ انسانی کے افعال سے بحث کرتے ہیں اور انسان اور کائنات کی مانند فطرت کے ہاتھ میں محض کٹھ پتلی نہیں، بلکہ وہ اپنے ارادے کا مختار ہے اور اس کے ارادے کو کسی پہلو قرار نہیں۔ عمرانی قوانین کو اپنے عمل میں انسانی ارادے سے سابقہ پڑتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایسے قوانین کم و بیش غیر معیّن ہوتے ہیں اور مادی علوم کے قوانین سے کہیں زیادہ مشروط۔ اس پر طرہ یہ کہ معاشی قوانین ایسے مفروضات پر مبنی ہیں جو بحیثیت مجموعی بے بنیاد اور خلافِ حقیقت نہ سہی لیکن نادر الوجود یا حقیقت سے بعید ضرور ہو سکتے ہیں۔ نکتہ یہ ہے کہ ایسے مفروضات میں اسباب زیر بحث ہمیشہ واقعی اور حقیقی ہوتے ہیں۔ البتہ وہ بہت سے اسباب میں سے چند منتخب ہوتے ہیں، اور ان کے عمل کی حالتیں بھی بغرض سہولت نہایت سادہ فرض کر لی جاتی ہیں پس انھی تعیّنات کی حد تک مفروضات بعید الحقیقت کہلا سکتے ہیں، ورنہ ان میں کبھی بے بنیاد اور خیالی اسباب سے ہرگز بحث نہیں کی جاتی۔ پس ان مفروضات کی بنا پر معاشی قوانین کو محض خیالی یا خلاف حقیقت قرار نہیں دیسکتے۔ معاشیات کی سی پیچیدہ علمی تحقیقات میں ایسے مفروضات ناگزیر ہیں۔ جبکہ بے شمار موافق اور مخالف اسباب میں تصادم ہوتا رہے اور اختلافِ حالات کی کوئی انتہا نہ ہو تو تعیّن قوانین کا سوائے اس کے اور کوئی طریقہ نہیں کہ اوّل اوّل خصوصیات اور فروع کو نظر انداز کر کے صرف چند عام اسباب اور سادہ حالات کے مفروضات پر اکتفا کیا جائے۔ ایسے مفروضات پر جو قوانین مبنی ہیں وہ بشکل اوّل گو معاشی واقعات کی ہو بہو تصویر نہ سہی لیکن سادہ خاکہ ضرور شمار ہو سکتے ہیں۔ مزید برآں بتدریج مختلف باقی ماندہ خاص خاص اسباب و حالات کا لحاظ کرتے کرتے ان میں ایسی ترمیم بھی ممکن ہے کہ وہ

بہت کچھ حقیقی حالات کے مطابق بن جاویں اور واقعات کی تفصیلی تشریح کر سکیں۔ واضح ہو کہ جو قوانین کثیر و گوناگوں اسباب کے تحت ہوں، ان کے تعین کا یہی علمی طریقہ ہے اور اس کو اصطلاحاً طریق تسہیل کہتے ہیں۔ مثلاً سرکاری عدم مداخلت؛ معاشی قوانین کا عام مفروضہ ہے۔ یعنی یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ کاروبار میں سرکار کی طرف سے کوئی مداخلت نہیں ہو رہی ہے۔ علیٰ ہٰذا تقسیم دولت کے قوانین میں آزاد مقابلہ کا مفروضہ داخل ہے۔ اور مبادلے کے قوانین بالخصوص مسئلہ قدر و قیمت میں معیار قیمت کی حیثیت سے زر کی قدر معیّن فرض کر لیتے ہیں قوانین جانے بغیر انکے اساسی مفروضات کی تفصیل سراسر قبل از وقت ہو گی۔ یہاں تمثیلاً مجمل اشارہ کافی ہے۔ آئندہ خود غور کر کے قوانین کے اساسی مفروضات کا پتا چلانا اور ان میں حسب ضرورت ترمیم کر کے قوانین کو واقعات پر منطبق کرنا طالب علم کے حق میں بیحد مفید کوشش ثابت ہو گی۔ آئندہ مباحث میں بشرط ضرورت جا بجا مفروضات کی طرف اشارہ ہوتا رہیگا؛

معاشیات کا دیگر علوم سے تعلق

۱۵۔ وسعتِ معاشیات کے دو جزو مختصراً اوپر بیان ہوئے۔ اول معاشیات کا نفس مضمون، دوسرے معاشی بحث کی نوعیت۔ اسی ضمن میں بعض ضروری نکاتِ متعلقہ کی طرف بھی اشارہ ہو گیا۔ اب وسعت کے متعلق اس قدر تحقیق باقی ہے کہ معاشیات کا اور علوم سے کیا کیا تعلق ہے۔ علوم عمرانی کے باہمی تعلقات مجملاً شروع میں بیان ہو چکے ہیں۔ معاشی مباحث میں ان تعلقات کو ملحوظ رکھنے کے البتہ مختلف مدارج ہیں۔ علم ایجابی کی حد تک تو معاشیات میں اور دوسرے علوم عمرانی میں اس قدر ملے رہتے ہیں جیسے روٹی میں نمک۔ پھر جوں جوں ان کی چاشنی بڑھتی ہے معاشیات علم ایجابی کے دائرے سے نکل کر علم معیاری بلکہ فن کی حد تک وسعت پیدا کرتا ہے یا یوں کہئے کہ نظری معاشیات میں علوم عمرانی کی کچھ یوں ہی جھلک پڑتی ہے۔ اور عملی معاشیات میں ان کا رنگ صاف چمک اٹھتا ہے۔ مثلاً تقسیم دولت کی تشریح و توجیہ کے علاوہ جب شرح سود، اجرت اور منافع پر انصاف کی نظر ڈالتے ہیں اور نتائج پر غور کرتے ہیں تو باہمی امداد و اشتراک کی بحث چھڑ جاتی ہے جس سے اخلاقیات کا بھی قریبی تعلق ہے۔ علیٰ ہٰذا اصول عام مداخلت

اور محصول کی بحث میں سیاسیات و قانون جلد آملتے ہیں۔ ان کے علاوہ علوم عمرانی کے خلط ہونے کی اور بھی صورتیں ہیں۔ معاشیات میں وسعتِ نظر پیدا ہونے کے بعد ان آمیزشوں کا خود بخود پتا چلنے لگتا ہے:۔

معاشیات کو بعض اور علوم سے بھی ایک طرح کا تعلق ہے: مثلاً تاریخ، منطق، نفسیات، طبعیات اور ریاضی۔ تاریخ کیا ہے گزشتہ حالات کی یاد داشت؛ پس اس کی معلومات سے معاشی مسائل کی تحقیق، تصدیق اور تمثیل میں بہت مدد ملتی ہے۔ طریق تحقیق کا سارا دار و مدار منطق پر ہے، اس تعلق کو ہم عنقریب بعنوان طریق معاشیات جداگانہ طور پر واضح کریں گے۔ اب نفسیات کو لیجئے! معاشیات میں ایک خاص نقطۂ نظر سے انسانوں کے افعال مطالعہ کئے جاتے ہیں۔ بیشتر ان کی احتیاجات اور تکمیل احتیاجات سے بحث ہوتی ہے۔ اور انسان کے افعال، احتیاجات اور ان کی تکمیل کو نفسیات سے بھی خاص تعلق ہے؛ بلکہ ان کی تشریح و توجیہ کرنا اسی کا کام ہے۔ پس غور کرنے سے واضح ہوگا کہ معاشیات اور نفسیات میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ معاشیات نے نفسیات کے قوانین کو بلا تکلف اپنے مباحث میں بطور مسلّمات قبول کرکے ان پر معاشی تحقیقات کی بنا رقائم کی ہے: مثلاً محنت، مبادلہ، قانونِ تقلیل افادہ، احتیاج کی بست وکشاد۔ ان مباحث کا اصلی مرکز نفسیات ہے، لیکن معاشیات نے ان معلومات سے اپنے مباحث میں خوب کام لیا ہے۔ علیٰ ہذا قانون تقلیل حاصل جس پر مسئلۂ لگان کا بیشتر دار و مدار ہے، در اصل طبعیات سے متعلق ہے؛ پس اس کی تشریح و توجیہ اسی کا وظیفہ ہے۔ لیکن معاشیات میں وہ بطور مسلمات داخل ہو کر بعض اہم مباحث کا سنگ بنیاد بنگیا ہے:۔

معاشی قوانین کے تحت میں مفروضات کی طرف اشارہ ہو چکا ہے، یہاں مسلمات کی نوعیت بیان ہوئی۔ بعض مصنفوں نے معاشی مفروضات اور مسلّمات کی باقاعدہ فہرستیں مرتب کرنے کی کوشش کی ہے: مثلاً بیجہٹ، سینیر، کیرنس، کوسا، سجوک، اور جانسن۔ ان میں سے چند اہم مفروضات اور مسلّمات کا اوپر حوالہ دیا جا چکا ہے۔ اپنے غور و تجسس سے ان کا پتا چلانا نہ صرف خاص دلچسپی رکھتا ہے، بلکہ مسائل سلجھانے میں از حد کارآمد ثابت ہوگا:۔

حصہ اول
باب اول

معاشیات کے بعض قوانین اور نتائج اپنی وقت اور پیچیدگی کی وجہ سے عبارت میں پورے طور پر ادا نہیں ہوتے۔ اس صورت میں ریاضی کے طریق پر ان کو بیان کرنے میں بہت سہولت ہوتی ہے۔ علاوہ بریں رسد و طلب، قدر و قیمت، وغیرہ جیسے متقابل مباحث میں ریاضی کی نسبتیں داخل ہیں۔ اس کے علاوہ معاشیات کے اعلیٰ مباحث میں ریاضی کی مدد سے اور بھی کام نکلتے ہیں جنکی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں: مثلاً اسٹے ٹسٹکس، جس میں علم اور فن اعداد و شمار دونوں داخل ہیں، معاشی ریاضی کا ایک اہم شعبہ ہے۔ جیونس، اجورتھ، وکسٹیڈ پرائس اور مارشل کی تصانیف میں معاشیات اور ریاضی کا تعلق خاص طور سے صاف نظر آتا ہے۔

طریق معاشیات

۱۶۔ معاشیات کی وسعت اوپر بیان ہوئی: یعنی نفس مضمون، نوعیت بحث اور دوسرے علوم سے تعلق۔ اسی سلسلے میں معاشیات کا طریق تحقیق بھی مختصراً بیان کرتے ہیں۔ واضح ہو کہ علمی تحقیق کے دو طریق ہیں یا تو متعدد فروع سے کسی اصل واحد کا پتا لگانا: یعنی تفصیل سے اجمال پیدا کرنا، یا کوئی اصول تسلیم کر کے اس سے متعدد فروع اخذ کرنا یعنی اجمال سے تفصیل نکالنا۔ اصطلاحی زبان میں اول کو استقرا اور دوم کو استخراج کہتے ہیں۔ معاشیات کی تحقیقات میں یہ دونوں طریق اس طرح ملے جلے نظر آتے ہیں جیسے شیر و شکر۔ مدتوں علماء معاشیات کو کسی ایک طریق کا پابند ثابت کرنے کی فضول کوششیں کرتے رہے۔ تجربے سے تحقیق کے واسطے دونوں طریق کا اجتماع و اتحاد اس طرح پر لازمی ثابت ہوا جیسے کہ تراش کے واسطے قینچی کے دو پھلوں کا ملنا۔ معاشیات کے جن مباحث میں عملی حیثیت غالب ہے: مثلاً اضافۂ اصل، مسئلہ آبادی، پیدائش اور صرف دولت؛ وہاں طریق اول زیادہ موزوں اور مفید ثابت ہوتا ہے۔ اور جن مباحث پر اصول کا رنگ گہرا چڑھا ہوا ہے: مثلاً مبادلہ یا تقسیم دولت؛ وہاں طریق دوم بیشتر کارآمد اور مستعمل ہے۔ لیکن یہ دونوں طریق نہ صرف اس طرح پر بحیثیت مجموعی تحقیق معاشیات کے واسطے ضروری ہیں بلکہ خود ہر طریق کا عمل بغیر دوسرے کی شرکت اور معاونت کے ناقص اور ناکامل رہتا ہے۔ چنانچہ نتائج استقرائی علمی حیثیت سے بے سود ہیں جبتک استدلال استخراجی سے ان کی توجیہ نہ کی جائے۔ علیٰ ہذا نتائج استخراجی عملاً بیکار ہیں جبتک کہ بطریق استقراء

منطقی طریق معاشیات
واقعات سے ان کی صحت ثابت نہ ہو جائے۔ المختصر دونوں مذکورۂ بالا منطقی طریق معاشیات کی تحقیقات میں لابد اور ناگزیر ہیں۔ البتہ حسب مناسبت مسئلہ زیر تحقیق میں کبھی طریق استقراء کا استعمال مقدم ہوتا ہے کبھی طریق استخراج کا۔ لیکن ہر حال میں ان کا اتفاق لازمی ہے۔ واضح ہو کہ طریق معاشیات کی بحث فی نفسہ بہت دقیق ہے اور اس پر عبور حاصل کرنے کے واسطے معاشی اصول و مسائل کا تفصیلی علم شرط مقدم ہے۔ یہاں بطور اشارہ صرف مختصر اور سلیس بیان پر اکتفا کرنا مناسب معلوم ہوا۔

طریق بحث میں ضمناً معاشیات اور منطق کا تعلق بھی کچھ بیان ہو گیا۔ علاوہ بریں معاشیات کے اہم اور اساسی تصورات کا مفہوم قرار دینے اور اصطلاحات کی تعریف بیان کرنے میں منطق سے بہت ضروری مدد ملتی ہے: مثلاً قانون، رجحان، معمول، اوسط، سبب، نتیجہ، تخفیف اور اضافہ۔ ان تصورات سے معاشی مباحث میں ازحد کام پڑتا ہے، اور ان کا تعین اور تشخیص منطق کے سوا اور کون کر سکتا ہے۔

معاشیات کی سرگذشت

۱۷۔ معاشیات کی وسعت و طریق کے بارے میں مدتوں سخت اختلاف رائے پھیلا رہا، جس کی تفصیل سے ضخیم کتابیں لبریز ہیں۔ اس باب میں جدید تحقیقات کا ماحصل اوپر بیان ہوا۔ ان اختلافات کے اسباب کا معاشیات کی تاریخ سے خوب پتا چلتا ہے جس کا مختصر بیان یہاں برمحل اور مفید مطلب ہو گا۔ لفظ اکانمی سے جو اس علم کے معروف نام "پولیٹکل اکانمی" میں داخل ہے، تاریخ کا سراغ ملتا ہے۔ اکانمی ایک یونانی لفظ ہے، اس کے اصلی معنی ہیں "خانہ داری کا انتظام" یعنی ضروریات خانہ داری کی بہم رسانی اور آمد و خرچ کا حساب۔ اصطلاحاً اس کو تدبیر منزل سے تعبیر کرتے ہیں۔ یورپ میں صدیوں پہلے سے انقلاب فرانس تک حکومت لوگوں کے کاروبار اور معاشی معاملات میں بلاتکلف اسی طرح مداخلت کرتی تھی جیسے کوئی بڑا بوڑھا اپنے گھر کے کاموں میں، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر: مثلاً ایسے قانون وضع کئے گئے تھے کہ دستکار اور مزدور ایک قصبے سے دوسرے قصبے جا کر بغیر اجازت محنت مزدوری نہیں کر سکتے تھے؛ نیز پیشہ وروں کو اپنے کاروبار جاری کرنے کے واسطے اجازت درکار ہوتی تھی؛ سامان تیار کرنے اور اس کے استعمال میں بھی قانون غیر ضروری دخل درمعقولات کرتا تھا؛ تجارتِ خارجہ میں قیمتی دھاتوں کی برآمد قطعاً ممنوع تھی؛ اور ایسے ہی بہت سے

قاعدے قانون جاری تھے جنھوں نے معاشی جدّوجہد کو پابند کر رکھا تھا۔ تاریخ انگلستان
میں اڈورڈ سوم کے عہد سے ایسے قوانین کا صاف پتا چلنے لگتا ہے، اور ترقی کرتے کرتے
ملکہ الیزبتھ کے زمانے میں یہ قوانین معاشی جدوجہد کے واسطے ایک وسیع اور مستقل
نظام العمل مرتب کر دیتے ہیں۔ یہ ملکہ اپنی رعایا کی معاش کا اسی طرح تفصیلی انتظام کرنا
چاہتی ہے جس طرح کہ ماں باپ اپنے بال بچوں کی روزی کے لئے فکر کرتے ہیں۔ چونکہ
انتظام خانہ داری اور معاشی معاملات کی سرکاری نگرانی میں بہت کچھ مشابہت
نظر آتی ہے، لہذا محض اکانمی یا تدبیر منزل سے مشابہت اور ساتھ ہی فرق ظاہر کرنے
کے لئے لفظ پولیٹکل بڑھا کر اس علم کا نام پولیٹکل اکانمی قرار دیا جس کو تدبیر مدن کہہ
سکتے ہیں۔ چونکہ کفایت شعاری اور منفعت طلبی معاشی معاملات کے حسن انتظام کی لازمی
خصوصیت ہے، لفظ اکانمی میں کفایت شعاری کا خیال بتدریج ملتے ملتے بالآخر ایسا پیوست
ہو گیا کہ لوگ اصلی معنی یعنی انتظام خانہ داری یا معاشی معاملات کی نگرانی بھلا بیٹھے اور مدت
تک اچھے اچھے اس مغالطے میں مبتلا رہے کہ یہ علم کفایت شعاری، دولت پرستی اور خودغرضی
کی تعلیم دیتا ہے۔ چنانچہ شروع شروع میں بعض پاک طینت عالموں نے اس پر بہت زہر
اگلا اور دل کھول کر اسے صلواتیں سنائیں، اور ناواقفیت و غلط فہمی کی وجہ سے وہ بھی
معذور تھے۔ بعد کو اس کا مبحث اور موضوع بہت کچھ صاف ہو گیا: یعنی وہ انسانی زندگی
کے ایک خاص اور اہم شعبے کا مطالعہ قرار پایا۔ تاہم چونکہ لفظ پولیٹکل اکانمی سے مغالطے
کا اندیشہ باقی رہتا ہے، بنظر مزید احتیاط اب یہ علم زیادہ تر اکنامکس کے سیدھے سادے
نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اوپر بیان ہوا کہ کسی زمانے میں حکومت معاشی معاملات میں بکثرت جا و بیجا
مداخلت کیا کرتی تھی۔ اس طرز عمل کو اصطلاحاً تجاریت اور اسکے حامیوں کو تجاریئین
کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس زمانے تک معاشیات محض بحیثیت فن بیشتر سرکار کے معاشی
مسالک سے تعلق رکھتا تھا، ابھی اس میں علمی رنگ پیدا نہیں ہوا تھا، لیکن انقلاب فرانس
کے بعد فرانس میں حکما کا ایک زبردست گروہ فطرآئین نام پیدا ہوا جس نے سرکاری
مداخلت کی بڑے زور سے مخالفت کی اور اس کو بیحد مضر ترقی و بہبود ثابت کیا۔ اسکے
برعکس یورپ بھر میں اصول عدم مداخلت کی اس شد و مد سے منادی کی کہ گھر گھر چرچا ہو کر

وہ بہت ہر دلعزیز ہو گیا اور بالآخر حکومت کو بھی عام رائے کے مطابق اپنا مسلک بدلنا پڑا باب اول
اور روز بروز معاشی جد وجہد قانونی پابندیوں سے آزاد ہونے لگی۔ چنانچہ جب آدم اسمتھ
نے اس اصول کی انگلستان میں اشاعت کی تو قانون غلہ جو درآمد غلہ کو روکتا تھا اور مدت
سے نہایت ضروری اور مفید خیال کیا جاتا تھا، منسوخ کر دیا گیا اور درآمد و برآمد غلہ میں پوری
آزادی مل گئی۔ اصول عدم مداخلت کے اثر سے کاروبار میں سرکاری نگرانی گھٹتے گھٹتے
تقریباً مفقود ہو گئی۔ اس وقت معاشیات نے بھی محض سرکار کے معاشی مسلک کی
بحث سے آگے بڑھ کر علمی تحقیقات کے میدان میں قدم رکھا۔ اور اصلاح و نگرانی معاشی
جد وجہد تجویز کرنے کے بجائے خود معاشی جد وجہد کی تشریح و توجیہ اس کا فریضہ قرار پایا۔
حتیٰ کے ایک خاص نقطۂ نظر سے تمدن کا مطالعہ کرنے کی بدولت بالآخر معاشیات کو ایک
جداگانہ علم عمرانی کا رتبہ حاصل ہو گیا:

کچھ تو انسان بالطبع نگرانی کا محتاج ہے اور کچھ کلوں کے ایجاد نے ملک کی معاشی
حالت میں ایسا انقلاب عظیم پیدا کر دیا اور اس انقلاب کی ہم مناسب موقع پر کافی
تشریح کریں گے، کہ سرکاری نگرانی کی ضرورت پھر بشدت محسوس ہونے لگی۔ عدم مداخلت
کا مسلک بالکل متروک تو نہیں ہوا لیکن اس میں مناسب ترمیمیں ضرور کر دی گئیں۔
اور بمقتضائے ضرورت سرکار نے پھر معاشی معاملات کی نگرانی کے واسطے قوانین پاس
کرنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ قانون بنک، قانون کارخانہ جات وغیرہ اسی تبدیلی کا نتیجہ
ہیں۔ البتہ اتنا فرق ضرور ہے کہ قدیم زمانے میں سرکاری مداخلت عام مسلک تھا اور
بیشتر معاملات میں اس پر عمل ہوتا تھا۔ اس کے برعکس آجکل سرکار کا عام مسلک
عدم مداخلت ہے، صرف خاص خاص صورتوں میں بطور استثنا مداخلت کرتی ہے؛
لیکن اقتضائے حالات پھر توسیع مداخلت کے طالب و موید نظر آتے ہیں۔ سرکار کے
موجودہ معاشی مسلک کو تجاریت اور فطر آئینی کا ایک معتدل مرکب سمجھنا چاہیئے،
جس کو سرکاری نگرانی کہنا موزوں ہوگا۔ اس تیسرے دور میں معاشیات کے علم و فن
میں امتیاز پیدا ہو کر دونوں جدا ہو گئے۔

اوپر کی بحث سے بظاہر معلوم ہوگا کہ تاریخی لحاظ سے معاشیات اول بشکل فن
نمودار ہوا اور ترقی کرتے کرتے اس نے علم کی شان حاصل کر لی اور بالآخر اسمیں علم و فن

کی دو جداگانہ حیثیتیں پیدا ہو گئیں۔ یہاں ایک دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ علم سے فن پیدا ہونا چاہیے نہ کہ فن سے علم۔ لیکن یہ بحث بعینہٖ ایسی ہے جیسے کہ "انڈا پہلے پیدا ہوا یا مرغی"۔ واقعہ یہ ہے کہ اول انسان تجربتہً اپنی احتیاجوں کو پورا کرنے کی تدبیریں نکالتا ہے، اور کامیاب ہونے پر وہی تدبیریں فن و علم کی بنیاد ڈالتی ہیں۔ کچھ عرصے تک فن و علم ایسے ملے جلے رہتے ہیں جیسے دودھ میں مکھن، لیکن ترقی کے ساتھ ساتھ انمیں تفریق شروع ہونے لگتی ہے، اور بالآخر علم، فن سے بالکل ممیز اور ممتاز ہو جاتا ہے چنانچہ فن طب اور علم الابدان، نجوم اور ہیئت کے تاریخی رشتے سے یہ امر بخوبی روشن ہے۔ اسی طرح معاشیات میں بھی ترقی ہوتے ہوتے فن سے جداگانہ ایک علم ایجابی کی شان پیدا ہو گئی اور من حیث العلم گروہ انسان کے افعال کا ایک خاص نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنا اس کا اصلی مقصد قرار پایا۔

معاشیات کے موضوع اور اس کی وسعت کے متعلق جو جو تبدیلیاں ظہور میں آئیں ان کی جھلک اس کے اردو ناموں میں بھی نظر آتی ہے۔ علم انتظام مدن، اصول سیاست مدن، علم ثروت، اصول تو انگری جیسے مختلف خطابات اس کو دیئے جا چکے ہیں؛ اور علم الاقتصاد یا اقتصادیات تو ملک میں خاصا رواج پا چکا ہے۔ مدتوں کی مسلسل تحقیقات اور غور و فکر کے بعد پولیٹکل اکانمی کے قدیم معنوں اور اکنامکس کے جدید مفہوم میں جو نمایاں فرق نمودار ہو گیا ہے اس کی نہایت مختصر کیفیت اوپر بیان ہو چکی ہے اور اس کی تفصیل سے بہت سی مستند تصانیف لبریز ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اس کے مروجہ نام "اقتصادیات" اور جدید اصطلاح "معاشیات" میں تقریباً وہی تعلق ہے، جو بلحاظ معنیٰ و مفہوم پولیٹکل اکانمی اور اکنامکس میں قرار پا چکا ہے۔ اقتصادیات میں وہی میانہ روی، اعتدال، ضبط اور خوش انتظامی کی ہلکی ہلکی جھلک صاف نظر آتی ہے: گویا پولیٹکل اکانمی کے قدیم معنوں کا عمدہ ترجمہ ہے۔ لیکن جب خود علم کا مفہوم ترقی کر کے بہت کچھ بدل جائے تو پھر ترجمے میں قدیم معنوں پر اکتفا کرنا اور مفہوم کی ترقی نظر انداز کر دینا کیونکر جائز ہو سکتا ہے۔ اس علم کی جدید مستند تصانیف کے مطالعے سے واضح ہوگا کہ اب خاص طور پر صرف یہ تحقیق کرنا مقصود نہیں کہ کاروبار زندگی میں کن قواعد کی پابندی عام مرفہ الحالی کے واسطے مفید ہے۔ ملک کے دولتمند بننے کی کیا کیا تدابیر ہیں اور سرکار کو اس باب میں کیا کوشش اور انتظام کرنا چاہیے۔ ایسے اکثر عملی مباحث تو

اکنامکس کے ایک شعبے فینانس یعنی فن مالیات کے سپرد ہیں، خود علم کا مبحث اس سے کہیں وسیع اور اعلیٰ ہے: یعنی دنیا کی معاشرت و تمدن کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کرنا کہ لوگ اپنی زندگی کیونکر بسر کرتے ہیں، ان کو کیا کیا ذرایع معاش حاصل ہیں، اور وہ ان سے کیونکر کام لیتے ہیں، ضروریاتِ زندگی کیا ہیں اور وہ کس طرح میسر ہوتی ہیں، انہیں کیا کیا تبدیلیاں ہو رہی ہیں اور ان کے اسباب کیا ہیں۔ غرض کہ انسان اپنی روزی کمانے اور دیگر بیشمار ضروریات زندگی حاصل کرنے اور برتنے میں جو کوشش اور تدبیریں کرتا ہے، اور جن اسباب و نتائج کو ان سے تعلق ہوتا ہے، اول ان سب کا مطالعہ کرنا، بعدہٗ ان کو چند جامع اصول و قوانین کے تحت میں لانا اور بالآخران سے مسائل مرتب کرنا، تاکہ معلومات میں علمی حرکت و قوت پیدا ہو جائے، یہ سب کام اکنامکس نے اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ جدید مفہوم کے لحاظ سے اس کا اردو نام علم المعیشت تجویز کیا گیا اور بنظر اختصار اس کو اکثر معاشیات سے بھی تعبیر کرتے ہیں ؛

۱۸۔ بعض معاشی مسائل کا قدیم زمانے سے مذہب، اخلاق اور فلسفے کی کتابوں میں ذکر چلا آتا ہے: مثلاً سود، محنت، صنعت، تجارت، حصول دولت و صرف دولت۔ مگر یا تو پند و موعظت کے پیرائے ہیں کہ ایسا کرنا اچھا ہے اور ایسا کرنا برا، یا زیادہ سے زیادہ سطحی فن کی حیثیت سے مثلاً پیشوں کی قسمیں اور دولت کمانے کے طریق، اس حد تک یہ مسائل بہت مجمل بلکہ تشنہ رہتے ہیں، اور ان کے باہم کسی خاص فن یا علم کا رشتہ نظر نہیں آتا ؛

معاشیات کی قدیم تصانیف

دوسرے دور میں چند معاشی اصول و مسائل ایک ابتدائی فن کی حیثیت سے گھر کی چار دیواری میں نشو و نما پاتے ہیں۔ انتظام خانہ داری کے متعلق قاعدے قانون بنتے ہیں۔ ایک مختصر سا فن نمودار ہوتا ہے جس کو یونانی لوگ اکامی، ہندوستان کے آریا گھر شاستر اور اہل عرب تدبیر منزل کہتے تھے ؛

سلطنتوں کے عروج کے ساتھ ساتھ فن حکومت پر کتابیں لکھنی شروع ہوئیں، جس میں سیاسیات اور معاشیات، تانے بانے کی طرح متصل نظر آتے ہیں، اور پھر اخلاقیات کا بھی رنگ جھلکتا ہے۔ تمام ملک کو ایک گھر، باشندوں کو ایک کنبہ اور حکومت کو منتظم سرگروہ تصور کرکے تدبیر منزل کے طرز پر ان تدابیر سے بحث کی کہ جو ملک کو مرفہ الحال اور

سلطنت کو دولتمند بنا سکیں۔ ملکی پیداوار، صنعت و حرفت، تجارت، سرکاری مداخل و مخارج بیشتر ان امور کی عملی بحث شروع کیگئی۔ یہاں سے فن معاشیات کی ابتدا سمجھنی چاہیئے۔

ہندوستان میں سنسکرت کی قدیم کتابوں سے ایک خاص مبحث ارتھ شاستر کا پتا چلتا ہے جس میں فن حکومت کی جھلک صاف نظر آتی ہے معلوم ہوتا ہے کسی زمانے میں ارتھ شاستر پر بہت سی کتابیں تصنیف ہوئیں جن میں سے ایک ارتھ شاستر اب بھی دستیاب ہوتی ہے۔ اس کا مصنف چانکیا عرف کوتلیا ہے جو کہ مگدھ کے مشہور راجہ چندر گپت موریا کا نامور وزیر تھا اور جس کی اولوالعزمی اور حسن تدبیر سے سلطنت مگدھ کو بہت کچھ عروج حاصل ہوا۔ اس کتاب میں جا بجا فن اور کہیں کہیں علم کے رنگ میں معاشی مباحث نظر آتے ہیں کتاب میں متعدد قدیم مصنفوں کا بھی ذکر اور حوالہ موجود ہے، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانے میں فن حکومت پر تصنیف و تالیف کا خاص رواج تھا۔

عربی میں بھی فن کی حیثیت سے معاشیات کے مباحث جا بجا موجود ہیں۔ اس سلسلے میں شیخ ابو الفضل جعفر بن علی الدمشقی کی تصنیف کتاب الاشارہ الی محاسن التجارہ خاص طور پر قابل مطالعہ ہے۔ بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری میں لکھی گئی ہوگی۔ اس کے بعد علامہ ابن خلدون کے مقدمۂ تاریخ کا پانچواں حصہ خاص طور پر معاشی معاملات سے متعلق ہے۔ اس کے مباحث میں خاصی علمی چاشنی موجود ہے۔ اہل عرب نے خود اس مبحث کا نام "علم معاش" تجویز کیا تھا لیکن جدید اہل مصر پولیٹکل اکانمی کے لفظی ترجمے میں پھنس کر اسکو اقتصاد سیاسی سے تعبیر کرنے لگے۔ جرجی زیدان کی جدید تالیف آداب اللغۃ العربیہ سے اس فن کی اور نایاب کتابوں کا بھی پتا چلتا ہے۔ فارسی میں ابو الفضل کی مشہور تصنیف آئین اکبری میں بھی فن معاشیات کی معلومات کا معقول ذخیرہ موجود ہے، بعض فارسی کتب اخلاق میں بھی معاشی مباحث کا سرسری ذکر نظر آتا ہے۔

حاصل کلام یہ کہ اگرچہ اس وقت یہ علم ہم کو یورپ سے حاصل ہو رہا ہے اور بہت کمال کی حالت میں بافراط مل رہا ہے، تاہم قدیم زمانے میں حسب اقتضائے وقت ایشیا میں بھی اس علم پر کافی غور و خوض ہو چکا ہے، جس کی یادگار میں مستند اور قابل قدر تصنیفیں موجود ہیں اور خدا جانے ایسی کتنی تصانیف دستبرد زمانہ سے تلف ہو گئیں۔

ان کتابوں کے حوالے موجود ہیں مگر خود اُن کا کہیں پتا نہیں؛

یورپ میں اول اول ۱۶۱۵ء میں ایک فرانسیسی مصنف مونشرٹین نامی کی کتاب پولیٹکل اکانمی کے عنوان سے شایع ہوئی جس کو باقاعدہ فن معاشیات کا سنگ بنیاد سمجھنا چاہیے۔ اسی زمانے میں اطالیہ میں بھی انٹونیو سیرا نے ایک کتاب فنِ معاشیات کے متعلق شایع کی، اس میں سونے چاندی کی بہت بحث کی گئی ہے۔ اٹھارھویں صدی کے وسط سے ایسی کتابیں شایع ہونے لگیں جن میں علمی رنگ نمودار ہو کر بتدریج پھیلنے لگا۔ فرانس میں ۱۷۵۵ء میں کنٹلین کی اور ۱۷۵۸ء میں کوسنے کی کتابیں شایع ہوئیں؛ آخری کتاب کی بہت قدر ہوئی۔ انگلستان میں ۱۷۶۷ء میں سر جیمس اسٹوارٹ نے اور نو سال بعد ۱۷۷۶ء میں آدم اسمتھ نے اپنی اپنی کتاب شایع کی۔ آدم اسمتھ کی کتاب نے وہ رسوخ پایا کہ لوگوں نے مصنف کو مادرِ معاشیات کا خطاب دے دیا۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ آدم اسمتھ کی کتاب وسعت نظر کی بدولت انگلستان میں ہمیشہ علم معاشیات کا سنگ بنیاد تسلیم ہو گی۔ تاہم اس مشہور اور قابل یادگار تصنیف میں فن اور علم کا رنگ پہلو بہ پہلو نظر آتا ہے۔ خالص علمی رنگ میں جو کتاب سب سے اول ۱۸۰۳ء میں شایع ہوئی وہ ایک فرانسیسی جین بپٹسٹ سے، کی تصنیف تھی۔ اس میں معلومات تو کچھ ایسے زیادہ نہ تھے لیکن بیان کی صفائی وسلاست اور مضامین کے تسلسل و ترتیب نے اس میں ایک خاص کشش اور علمی شان پیدا کر دی۔ چنانچہ تقریباً یورپ کی تمام زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا اور آج تک کتابوں میں اکثر وہی ترتیب مروج ہے؛

انیسویں صدی کی ابتدا سے معاشیات نے ایک علم کی حیثیت سے ترقی شروع کی۔ یورپ کے تمدن و تہذیب میں اس کو جو غیر معمولی نشو و نما حاصل ہوا اور ایک ہی صدی کے اندر اندر مساعدتِ وقت سے اس نے جو عروج پایا محتاج بیان نہیں۔ معاشیات کے میدان میں جرمنی سب سے پیش پیش نظر آتا ہے: اسکے بعد فرانس، انگلستان، آسٹریا اور امریکہ کا نمبر ہے۔ معاشیات کی وسعت، اس کے طریق اور معاشی مسلک کے مقاصد پر اس قدر اختلاف رائے پھیلا کہ متعدد فرقے بن گئے جن کی تفصیل کی یہاں گنجایش نہیں۔ تحقیق سے کچھ اختلاف مٹ رہے ہیں تو

کچھ پیدا ہوتے جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علوم عمرانی میں اتحادِ خیال کس قدر دشوار ہے۔ بیسویں صدی کے شروع سے اور بالخصوص جنگ یورپ کے زمانے سے معاشیات پر بکثرت کتابیں شائع ہو رہی ہیں اور اخبار و رسائل پر بھی معاشیات کا رنگ بہت غالب نظر آتا ہے۔

معاشیات کی موجودہ ضرورت

۱۹۔ ترقی تہذیب کے ساتھ ساتھ ہماری زندگی میں روز افزوں پیچیدگیاں پیدا ہو رہی ہیں، جن کو سلجھانے کے لئے ناخنِ علم ناگزیر ہیں۔ زندگی کے متعدد شعبوں میں سے صرف ایک معاشی جدّوجہد ہی پر ذرا غور کیا جائے کہ اب اس کا حلقۂ اثر شہروں، صوبوں بلکہ ملکوں سے بڑھ کر تمام عالم پر محیط ہو گیا ہے۔ زمانۂ حال کی ایجادات، تار، مطبع، ریل، دخانی جہاز اور طرح طرح کی دخانی اور برقی کلوں نے تمام دنیا کو کیسے کیسے قوی تعلقات اور مضبوط رشتوں سے جکڑ دیا ہے۔ کبھی ہماری ضروریات انگلیوں پر گنی جا سکتی تھیں اور ان کو پورا کرنے کے وسائل کیسے سیدھے سادے اور مختصر تھے۔ ہر قصبہ اور شہر اپنے اپنے باشندوں کی ضروریات کا بیشتر کفیل ہوتا تھا۔ اور رسد ضروریات کے واسطے اپنے ملک سے باہر کوئی نظر بھی نہیں ڈالتا تھا۔ مگر آج مہذب و متمول طبقوں کا تو ذکر ہی کیا ہے، دنیا کا وہ کونسا ملک ہے جہاں کی کوئی نہ کوئی چیز ان کے محل یا کوٹھی کے سامان میں داخل نہیں۔ آپ ایک غریب اور جاہل گنوار کے جھونپڑے میں بھی کم از کم روس یا برما کا مٹی کا تیل، امریکہ یا جرمنی کی لالٹین، جاپان یا آسٹریا، ناروے یا سویڈن کی دیا سلائی اور انگلستان کا کپڑا ضرور موجود پائیں گے۔ ابتدائی تعلیم کے ساتھ ساتھ سوئٹزرلینڈ کی سستی گھڑیوں، امریکہ کے سگریٹ، انگلستان کے قلم چاقو کا رواج بھی اسکول جانے والے دیہاتی بچوں میں پھیل رہا ہے۔ اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ ایک طرف تو ہماری ضروریات میں اضافہ ہو رہا ہے اور دوسری طرف ان کے پورا کرنے کے وسائل وسیع ہو رہے ہیں۔ اور یہ ترقی تہذیب اور فراوانی آبادی کا مقتضا ہے۔ اس عالمگیر رجحان کو روکنا ممکن ہے نہ مفید، البتہ اس کو چند اصول کا پابند بنانا ضرور ہے، جس کی تفصیل تجارت بین الاقوام کے سلسلے میں پیش کی جاوے گی:۔

دنیا کا کوئی مہذب ملک ایسا نہیں جو اپنی تمام ضروریات کو خود پورا کر سکے

اور دوسرے ملکوں کا کم و بیش دست نگر نہ ہو۔ کسی ملک میں مصنوعات کی درآمد ہے جیسے
ہندوستان میں، اور کسی میں پیداوار خام کی مانگ ہے جیسے انگلستان میں لیکن دنیا
کے تمام مہذب ممالک اپنی ضروریات پوری کرنے میں ایک دوسرے کے اس طرح
محتاج ہیں جیسے کسی زمانے میں دیہات کے پیشہ ور ایک دوسرے کے محتاج ہوتے
تھے۔ رسد ضروریات کے وسائل نہ صرف وسیع ہو گئے ہیں بلکہ ان کی حالت میں
بھی انقلاب عظیم نظر آتا ہے۔ ذرا جُلاہے کے کرگھے کا مانچسٹر یا بمبئی کی ملوں، موچی
کی دکان کا نارتھمپٹن یا کانپور کی فکٹریوں، اور لوہار کی بھٹی کا لیڈس یا ٹاٹا ورکس
کے کارخانوں سے مقابلہ تو کرو۔ اکوئی بھی نسبت ہے؟ حالانکہ ان کے کام وہی
یکساں ہیں؛

مزید براں سب سے زیادہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ بہت سے ایسے
نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں جو عام ملکی اور قومی بہبودی و مرفہ الحالی کے سنگ بنیاد
ہیں، اور جن کو حل کرنا علم اور تجربے کی مدد کے بغیر محال ہے۔ سکے، نوٹ، بنک،
قرض عامہ، مشترک سرمایہ دار کارخانے، سرکاری اور کاروباری تمسک، دستاویزات
قابل بیع و شری، تجارت درآمد و برآمد، محصول مالگزاری، سرکاری مداخل و مخارج،
سالانہ موازنہ، وہ چند جدید اہم مسائل ہیں جن کو حل کرنے میں آج دنیا کے بہترین دماغ
براہ راست یا بالواسطہ مصروف ہیں، اور یہی وہ مسائل ہیں جو تمام مہذب سلطنتوں کی
سیاسیات کی روح رواں بنے ہوئے ہیں؛

پس جبکہ ہماری زندگی کا معاشی شعبہ اس قدر پیچیدہ اور وسیع ہو گیا ہو
اور اس کا اثر ہماری بہبودی پر اس درجہ حاوی ہو، معاشیات جاننے کی ضرورت ظاہر
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے ملکوں کی طرح ہندوستان میں بھی روز بروز اس کا
چرچا پھیلتا جاتا ہے، گویا خود زمانہ اس علم کا متقاضی ہے؛

باب دوم

معاشی تاریخ انگلستان

(۱) معاشی تاریخ (۲) جاگیرداری طریق (۳) جتھے (۴) تجارتی جتھے (۵) حرفتی جتھے (۶) کالی موت (۷) رمنے (۸) قومی طریق (۹) قانونِ کارآموزی (۱۰) قانون اجارہ داری (۱۱) قانونِ مفلسی (۱۲) قانونِ غلہ (۱۳) قانونِ جہازرانی (۱۴) تجاریت (۱۵) صنعتی انقلاب (۱۶) ایجادات (۱۷) طریق عدم مداخلت یا کاروباری آزادی (۱۸) کارخانہ جات (۱۹) خلاصہ۔

معاشی تاریخ

۱۔ تاریخ کیا ہے؟ گزشتہ حالات و واقعات کی یادداشت۔ ہمیشہ سے ماضی و حال میں بیخ و بن کا سا تعلق چلا آتا ہے۔ جدید حالات قدیم اسباب کا نتیجہ ہوتے ہیں، بالخصوص علوم عمرانی میں تو تاریخ کے بغیر تحقیق محال ہے۔ چنانچہ معاشیات کے اصول و مسائل کی تفہیم و تصدیق میں معاشی حالات کی تاریخ سے بیحد مدد ملتی ہے۔ حتیٰ کہ جرمنی کے سربرآوردہ معاشیئین تو معاشی تاریخ ہی کو اس علم کا جزو اعظم اور سنگِ بنیاد قرار دیتے ہیں۔ معاشیات میں تاریخ کی کس کس اعتبار سے کس قدر ضرورت ہے، یہ ایک اہم اور معرکتہ الآرا مبحث ہے، تاہم اس کا قریبی تعلق سب کو تسلیم ہے۔ یورپ نے حال میں معاشیات کو خاص ترقی دی ہے، اور ہندوستان کو بھی اس وقت وہیں سے یہ علم حاصل ہو رہا ہے۔ یورپ کی تاریخ میں موجودہ معاشیات کے سرچشمے بکثرت ملتے ہیں، لیکن یورپ کی معاشی تاریخ کے واسطے مبسوط تالیف درکار ہے۔ بخوفِ طول یہاں صرف انگلستان کی مختصر سی معاشی سرگزشت پیش کرتے ہیں تاکہ معاشی مباحث میں ماضی و حال کا تعلق کسی قدر واضح ہو جائے۔ ہندوستان کی معاشی تاریخ کے پہلو معاشیات ہند کی کتابوں میں اپنے اپنے موقع محل پر نظر آئینگے۔ بحالت موجودہ

باب دوم

تو صرف معاشیات عملی میں تاریخ ہند سے سابقہ پڑتا ہے۔ معاشیات نظری میں ہندوستان نے کوئی ایسا حصہ نہیں لیا کہ اس کے اصول و مسائل کی تحقیق میں اس کی تاریخ سے کوئی قابل لحاظ مدد ملے۔ آیندہ ممکن ہے کہ ہندوستان بھی کوئی خاص نظام کاروبار قائم کر کے علم میں اضافہ کر دے؛ اس وقت سے اسکی تاریخ کو بھی معاشیات نظری سے تعلق پیدا ہو جائے گا۔ ذیل میں انگلستان کی مختصر معاشی سرگزشت ملاحظہ طلب ہے:-

جاگیرداری طریق۔

۲۔ آٹھ نو صدی عیسوی تک تو انگلستان کا تمدن بہت ابتدائی حالت میں رہا؛ زراعت، گلہ بانی اور ماہی گیری ذریعۂ معاش تھا؛ موٹا جھوٹا کپڑا بھی بن لیتے تھے؛ چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں میں رہتے تھے۔ اس کے بعد دس گیارہ صدی عیسوی سے سولھویں صدی تک ایک دوسرا دور نظر آتا ہے، اس کے طریق معاش قابل مطالعہ ہیں۔ ملک میں ایک تو علاقہ شاہی ریاست یا صرف خاص کا تھا، اسکے علاوہ بہت سی چھوٹی بڑی جاگیریں تھیں جو فوجی خدمات کے صلے میں اور آئندہ فوجی امداد کے معاہدے پر تقسیم کی گئی تھیں؛ بوقت جنگ ہر جاگیر دار حصۂ رسد فوج دیتا تھا، تمام زمین اوسطاً پانچ ہزار ایکڑ کے حساب سے مقطعوں میں تقسیم تھی؛ کسی جاگیر میں صرف دو چار مقطعے تھے اور کسی میں سو پچاس یا اس سے بھی زیادہ۔ جاگیر دار خود تو زراعت کرنے سے رہے، بلکہ ان کے ماتحت سپاہی بھی جن کو تھوڑی تھوڑی زمین ملجاتی تھی، دوسروں ہی سے کاشت کراتے تھے۔ یہ لوگ خود بس لڑائی بھڑائی کے واسطے تیار رہتے تھے، اور اس بد امنی کے زمانے میں یہی کام مقدم بھی سمجھا جاتا تھا۔

ملک زمین کا طریق تو مختصراً معلوم ہوا، اب کاشتکاری کو لیجئے! اس دور میں کاشتکاروں کی حالت غلاموں سے کچھ یوں ہی سی بہتر تھی۔ ہر کاشتکار اپنے اپنے زمیندار سے مستقل طور سے وابستہ تھا، یہ ممکن نہ تھا کہ ایک زمیندار کو چھوڑ کر وہ دوسرے زمیندار کے ہاں جا کے کاشت کرے۔ بلکہ جس جاگیر میں پیدا ہوتا تھا وہیں عمر بسر کر دیتا تھا، نسلاً بعد نسل یہی سلسلہ جاری رہا۔ کاشتکار پر واجب تھا کہ فصل پر حسب دستور کچھ پھل پھول اور غلہ ترکاری زمیندار کے یاں پہنچاتا رہے، اس کو زمیندار کے مختلف کام کاج بھی بطور بیگار کرنے پڑتے تھے؛ بالخصوص زمیندار لوگ اپنے طور پر کچھ کاشت کراتے تو کھیتی باڑی کا تمام کام انکے کاشتکار مفت انجام دیتے

تھے۔ المختصر اس زمانے میں کاشتکار کچھ اپنے ہاں کی پیداوار زمیندار کی نذر کرتا تھا، کچھ اس کا کام کاج کرتا تھا۔ البتہ کوئی لگان بشکل زر اس کو ادا کرنا نہیں پڑتا تھا:۔

اس زمانے کی عام حالت کا موجودہ حالت سے مقابلہ کیجئے تو زمین آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ جس انگلستان میں آج ۸۰٪ فی صدی لوگ رونق سے بھرے پُرے شہر اور قصبوں میں آباد ہیں، اور صنعت وحرفت اور تجارت کی دھوم پڑی ہوئی ہے، وہاں اس زمانے میں نوّے فی صدی لوگ چھوٹے چھوٹے دیہات میں پڑے ہوئے تھے اور زراعت پر زندگی بسر کرتے تھے۔ نہ ذرایع آمد و رفت تھے، نہ بیداری و اولوالعزمی تھی، نہ کچھ ایسی دولت تھی، جو جہاں پیدا ہوتا وہیں عمر گزار دیتا، ہر شخص آبائی پیشے پر قناعت کرلیتا، ادنیٰ ضروریات کے سوا بہت کم چیزیں میسر تھیں، تجارت برائے نام جاری تھی۔ تبادلے سے کام چلتا تھا، زر کا پتا بھی نہ تھا، ہر طرف جمود اور پسماندگی نظر آتی تھی۔ یہ حالت انگلستان تک محدود نہ تھی بلکہ مدتوں تمام یورپ پر تقریباً چودھویں صدی عیسوی تک طاری رہی کیونکہ اس زمانے میں جاگیردار اور کاشتکار ملک کے دو خاص اور بڑے طبقے تھے۔ اس دورِ معاش کو جاگیرداری طریق سے تعبیر کرتے ہیں:۔

جتھے

۳۔ بالآخر صنعت وحرفت میں کچھ جان پڑنی شروع ہوئی، دیہات چھوڑ چھوڑ کر لوگ کاروبار کے لئے قصبوں میں بسنے لگے۔ جاگیرداروں کو اپنے قدیم کاشتکاروں کی یہ ترنگ ناگوار گزری اور اسی بنا پر ان کی قصبوں سے چل گئی۔ اتفاق دیکھئے! اسی زمانے میں جاگیرداروں اور بادشاہ میں کشیدگی پیدا ہوگئی، انکو بادشاہی اقتدار پر حسد تھا، اور بادشاہ انکو زیر کرنا چاہتا تھا۔ ایسی حالت میں قدرۃً بادشاہ قصبوں کا حامی بن گیا، ان کے واسطے طرح طرح کی رعایات مراعات منظور رکیں۔ ادھر قصبات کے لوگ بھی بادشاہ کے طرف دار ہوگئے اور جان ومال سے مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ یہیں سے گوناگوں قصباتی جتھوں کی ابتدا ہوتی ہے اور بادشاہ بذریعہ فرامین بطور اعانت وعنایت ان کو خاص حقوق عطا کرتے ہیں۔

تجارتی جتھے

۴۔ اول اول قصبوں میں تجارت کو عروج ہوا۔ پس وہاں کے لوگوں نے تجارتی رعایات اور حقوق طلب کئے، نتیجہ یہ ہوا کہ تمام قصبوں میں تجارتی جتھے قائم ہوگئے۔

چند ضروریات حیات کے سوا بیشتر چیزوں کی تجارت کے اجارے مل گئے، خرید و فروخت باب دوم کے متعلق ایسے مفصل اور باریک باریک قواعد مقرر ہوئے کہ آج صرافے میں بھی ان کی مثال نظر نہیں آتی۔ غرض یہ تھی کہ تاجروں میں اتحاد بڑھے اور تجارت کو خوب ترقی ہو، کب اور کہاں بازار لگائے جائیں، کیا کیا سامان کس قیمت پر فروخت کیا جائے؟ ان سب باتوں کے متعلق قواعد مقرر تھے۔ خود جتھوں کی طرف سے نگراں کار متعین تھے، جو لوگ قواعد کی خلاف ورزی کرتے وہ یا تو جرمانہ بھگتتے یا جتھے سے خارج کر دیئے جاتے تھے۔

۵۔ جوں جوں قصبیات کو ترقی ہوئی طرح طرح کی صنعتیں پھیلتی گئیں اور حرفتی جتھے تجارتی جتھوں کو قائم ہوئے ایک صدی نہ گزری تھی کہ حرفتی جتھے بھی نمودار ہو گئے۔ ہر قسم کے دستکاروں نے اپنے اپنے جتھے بنالئے تاکہ اپنی صنعت کو فروغ دیں اور اس سے خود ہی پورا فائدہ اٹھائیں۔ کاروبار کے متعلق ادنیٰ ادنیٰ باتوں کی ہدایت و خبر گیری کی جاتی تھی؛ مثلاً اوزان اور پیمانے درست رہیں، ناقص مال تیار نہ ہو، خرید و فروخت کرتے وقت جتھے کے لوگ آپس میں مقابلہ نہ کریں، بلکہ ہر حال میں اتفاق اور اتحاد سے کام لیں، اور ایک دوسرے کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کریں۔

بارھویں صدی عیسوی تک تو انگلستان میں زر کا نام بھی نہ تھا، تمام کاروبار تبادلے پر چلتے تھے۔ البتہ تیرھویں صدی میں انگلستان سے دیگر ممالک یورپ کو اون کا جانا شروع ہوا اور اس کے مبادلے میں باہر سے چاندی آنے لگی تو زر کا رواج پڑا۔ دیہات میں ابتک رعیت اپنے زمینداروں کے ہاں گوناگوں خدمات انجام دیتی تھی، اب ان کے بدلے وہ زمینداروں کو رقم ادا کرنے لگی۔ اور زمینداروں نے بھی اس تبدیلی میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا کیونکہ انھیں اپنے کاموں کے واسطے اجرت پر مزدور مل جاتے تھے۔ خدمت کے بدلے رعیت سے رقم لے لی اور اجرت پر مزدوروں سے کام کرا لیا۔

۶۔ ۱۳۴۸ء کا ذکر ہے، انگلستان میں سخت وبا پھیلی اور موت کا ایسا سیلاب کالی موت۔ آیا کہ دیہات میں تقریباً نصف آبادی صاف ہو گئی۔ اس خوفناک سانحے کو "کالی موت" سے تعبیر کرتے ہیں۔ مزدوروں کی بیحد قلت ہوئی تو قدرۃً اجرت

کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ اب زمینداروں کو فکر پڑی اور انھوں نے رعیت پر زور ڈالا کہ حسب دستور قدیم رقم ادا کرنے کے بجائے وہ پھر خدمات انجام دیں ۱۳۵۱ء میں اور اس کے بعد بھی کئی مرتبہ "قانون مزدوراں" نافذ ہوا کہ مزدور قدیم اجرت پر کام کریں اور اضافہ طلب نہ کریں۔ لیکن مزدوروں نے ایک نہ سنی۔ بات بڑھتی گئی حتی کہ ۱۳۸۱ء میں گاؤں گاؤں شورش برپا ہو گئی، جو بدقت تمام فرو ہو سکی اور بالآخر رعیت کی جیت رہی۔ رسمی خدمات سے بالکل پیچھا چھٹ گیا، اور حالت اس قدر سدھر گئی کہ پندرھویں صدی مقابلتہً ان کے حق میں دور زریں معلوم ہوتی تھی:

۱۰۔ ادھر تو اور ممالک یورپ میں انگریزی اُون کی طلب بڑھی اُدھر کالی موت سے مزدوروں کی سخت قلت ہو گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زمینداروں نے مزروعہ کھیت بھی بھیڑوں کے رہنے بنا دیئے۔ جدھر دیکھو دیہات میں بھیڑیں ہی بھیڑیں نظر آنے لگیں، کہیں کہیں بقدر ضرورت زراعت باقی رہ گئی۔ کاشتکار اپنا مال بازار میں فروخت کرکے لگان و اجرت کے لئے زر ادا کرنے لگے، زر کے رواج سے قدیم دستور ٹوٹ گئے اور کاشتکاروں کو آزادی ملی:

دیہات کے ساتھ ساتھ قصبات میں بھی تدریجی انقلاب جاری تھا۔ حکومت کے اقتدار بڑھنے سے جتھوں کا اثر گھٹ گیا۔ جان و مال کی حفاظت سے اب ان کو کچھ سروکار نہیں رہا، تجارت پھیلی تو ان کے اجارے اور خاص حقوق لوگوں کی نظر میں کھٹکنے لگے۔ ہر طرف سے اعتراض شروع ہوئے کہ کاروبار میں ہر شخص کو شریک ہونے کا موقع ملنا چاہیے، جتھے اجارہ لینے والے کون ہیں؟ کاروباری حقوق سلب ہوتے ہی تجارتی جتھے بیجان ہو گئے، ان کی حیثیت محض اخلاقی اور تمدنی انجمنوں کی سی رہ گئی: حرفتی جتھوں کا بھی تھوڑے عرصے کے بعد یہی حشر ہوا۔ اول تو خود ملک میں صنعت و حرفت کا ولولہ پھیلا، دوسرے اسی زمانے میں دیگر ممالک بالخصوص فرانس کے ہوشیار اور ماہر صناع و دستکار مذہبی تشدد اور سخت گیری سے تنگ آکر انگلستان میں جوق جوق آباد ہو رہے تھے۔ ایسی حالت میں جتھوں کی کیا چلتی، ان کے حقوق بھی رخصت ہوئے۔ سولھویں صدی کے آخر میں ہر شخص مرضی کے موافق صنعت و حرفت میں مصروف تھا:

باب دوم

جھتوں کا زور ٹوٹتا تھا کہ کاروبار اور صنعت وحرفت میں قومیت کا رنگ نمودار ہونا شروع ہوا۔ قومی مفاد اور عروج نصب العین قرار دے کر کاروبار کا رخ بھی اسی طرف پھیر دیا۔ وقت نے ہر طرح پر اس مسلک کی مساعدت کی۔ مدّت کی بدنظمی اور طوائف الملوکی کے بعد ہنری ہفتم جیسا مدبر اور اولوالعزم بادشاہ نصیب ہوا تو ملک ہر ترمیم و اصلاح میں اس کا ساتھ دینے کو ہمہ تن آمادہ ہو گیا۔ اس نے قومیت کے مسلک کو بہت ترقی دی، ہر کام قومی نقطۂ نظر سے قرار پانے لگا۔ حسن اتفاق سے اُس کے جانشین ہنری ہشتم اور ملکہ الیزبتھ بھی تدبّر اور عالی حوصلگی میں کسی طرح کم نہ تھے اور انھوں نے بھی ملک کو اسی قومیت کے مسلک پر چلایا۔ ہر کسی کے سر میں یہی خیال سما گیا کہ جو کچھ ہے قومی عروج و اقتدار ہے، انفرادی ترقی کی کوئی اصلیت نہیں۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ چھاپے کی ایجاد سے علم و ادب کے چشمے جاری ہوئے۔ امریکہ دریافت ہوا تو سب کی نظریں سمندر پار پڑنے لگیں۔ ہندوستان کا راستہ کھلا تو سمندِ عزم کو ایک اور تازیانہ ہوا۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ ملک اور حکومت میں بیحد اتحاد و ارتباط بڑھ گیا۔ بادشاہ قوم کے لیڈر اور رہبر و شمار ہونے لگے، اور انھوں نے اپنی قوم پرستی اور قوم پروری سے پورا پورا اعتماد حاصل کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت صنعت وحرفت کی ترقی میں ہمہ تن مصروف ہو گئی۔ اس حالت کو تاریخ میں قومی طریق سے تعبیر کرتے ہیں۔

قومی طریق

۸۔ آج کل حکومتوں کا عام مسلک یہ ہے کہ صنعت وحرفت اور کاروبار میں بلاضرورت کوئی مداخلت نہ کریں۔ سب کام آزادی اور مسابقت سے چلتے ہیں موجودہ ترقی کی حالت میں یہی مسلک مناسب حال بھی معلوم ہوتا ہے لیکن زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ انگلستان اور تمام ممالک یورپ میں حکومت کا کاروباری مسلک بالکل اس کے عکس تھا۔ مثلاً ٹیوڈر خاندان کے بادشاہوں نے انگلستان میں صنعت وحرفت کو ترقی دینے کے واسطے کاروبار میں طرح طرح سے حصّہ لیا۔ اس باب میں ان کی دلچسپی اور عملی کوششوں کی تفصیل کی جائے تو آج مبالغہ معلوم ہوتا ہے مگر تاریخ بتا رہی ہے کہ صنعت وحرفت کی ترقی کو انھوں نے اپنی حکومت کا نصب العین بنا لیا تھا۔ اور ان ہی کے زمانے سے انگلستان میں دولت کے چشمے جاری ہوئے۔

یوں تو شروع سے انگلستان کے تقریباً تمام اولوالعزم بادشاہوں نے قوم کے معاشی معاملات میں مداخلت اور امداد کی لیکن ملکہ الیزبتھ کی توجہ اور سرگرمی سب پر سبقت لے گئی، مثلاً پہلے پہل ولیم اول نے ملک میں جاگیرداری طریق کی بنا ڈالی۔ اڈورڈ اول نے جاگیروں پر اپنا تسلط بڑھایا، اور صنعت و تجارت پر بھی سرکاری نگرانی قائم کی۔ اڈورڈ سوم کے زمانے میں تجارت کو کچھ آزادی مل گئی، لیکن کالی موت سے سخت تباہی پھیلی۔ مزدوروں کی قلت ہوئی تو اجرت بڑھی۔ تعین اجرت کی غرض سے قانون مزدوراں پاس ہوا جس سے مزدوروں میں سخت برہمی پھیلی اور جس کی بدولت آگے چل کر رچرڈ ثانی کے عہد میں خوب شورش اور بلوے ہوئے۔ اڈورڈ سوم کی ملکہ نے بہت سے نوریاف اپنے وطن فرانس سے بلا بلا کر مشرقی انگلستان میں آباد کئے، چنانچہ اس زمانے میں پارچہ بافی کو بہت نمایاں ترقی ہوئی۔ بحیثیتِ مجموعی اڈورڈ سوم کا عہد معاشی اعتبار سے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ ٹیوڈر خاندان کے دور میں انگلستان پر قومیت کا خوب گہرا رنگ چڑھا۔ مذہب، حکومت، معاشرت اور تجارت، ہر شعبۂ زندگی میں قومیت ہی نصب العین بن گئی۔ اگرچہ ہنری ہفتم اور ہشتم کے زمانے میں بھی قومیت کو بہت تقویت پہنچی تاہم ملکہ الیزبتھ نے کمال کو پہنچا دیا۔ وہ اپنی سرگرم اعانت اور خبرگیری کے اعتبار سے بلا مبالغہ مادر قوم بن گئی۔ سو سے زیادہ ایسے قوانین پاس ہوئے جن کا معاشی اور معاشرتی حالات سے قریبی تعلق تھا۔ یہ سچ ہے کہ بعض قوانین سے ملک کو بہت فائدہ پہنچا تو بعض مضر بھی ثابت ہوئے۔ اور اس کم علمی اور ناتجربہ کاری کے زمانے میں ایسا ہونا عجب نہیں تاہم ان سب کا مقصد واحد یہی تھا کہ ہر طرح پر قوم کو عروج اور عظمت حاصل ہو، اور وسیع حد تک اس مقصد میں کامیابی ہوئی۔ ملکہ الیزبتھ کے قوانین نے سولھویں صدی کو تاریخ انگلستان میں نمودار اور درخشاں بنا دیا۔ اور ان کے اثر قومی زندگی میں اس قدر گہرے بیٹھے کہ بعد کی تاریخ میں بہت کچھ ان کی تفصیل نظر آتی ہے۔ منجملہ گوناگوں معاشی قوانین کے جن کا زراعت، صنعت و حرفت، تجارت اور کاروبار سے قریبی تعلق تھا، چند خاص طور پر اہم اور نتیجہ خیز ثابت ہوئے: مثلاً قانونِ کارآموزی، قانون اجارہ داری اور قانون مفلسی ؎

قانون کار آموزی

۹۔ یوں تو اڈورڈ سوم کے زمانے سے متعدد قوانین جاری تھے جن میں آجر اور مزدور کام اور اجرت، دستکاری اور کار آموزی وغیرہ کے قواعد منضبط تھے۔ لیکن یہ قوانین ناکامل اور بے ترتیب تھے۔ ملکہ الزبتھ نے حالاتِ زمانہ مذکورہ کے لحاظ سے ان سب کے بجائے ایک برمحل اور جامع قانون نافذ کیا جو قانون کار آموزی کہلایا۔ اس امر پر خاص طور سے زور دیا گیا کہ کوئی صنعت و دستکاری اپنے طور پر شروع کرنے سے قبل کسی آجر کے پاس سات سال تک کام سیکھنا لازم ہوگا۔ اس کا منشا صنعت و حرفت کو باقاعدہ ترقی دینا معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ بریں کام کاج، مزدوری اور اجرت وغیرہ کے متعلق اور بھی بہت سے قواعد منضبط تھے جن کے بعد آجر اور مزدور میں معاہدے اور مسابقت کی بہت کم گنجائش رہ جاتی تھی۔ ترقی کاروبار کے ساتھ ساتھ بندشیں ٹوٹ کر آزادی پھیلتی گئی حتیٰ کہ سنہ ۱۸۲۵ء میں جبکہ کارخانے جاری ہو رہے تھے یہ قانون بالکل ہی منسوخ ہوگیا۔ تاہم بطور خود طریق کار آموزی بعد کو بھی قائم رہا، اور بعض پیشوں میں تھوڑا بہت اب بھی جاری ہے۔ لیکن اب کار آموزی کے بجائے صنعتی تعلیم کا رواج بڑھ رہا ہے۔

قانون اجارہ داری

۱۰۔ اجارے سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص یا خاص جماعت کو کسی صنعت و حرفت یا تجارت کا نرالا حق مل جائے اور دوسرے لوگ اس میں شرکت نہ کر سکیں۔ یوں تو ٹیوڈر بادشاہوں کے عہد سے پہلے بھی بذریعہ قانون اجارے عطا کرنے کا رواج تھا لیکن ان کے دور میں اجارے کا طریق بہت پھیلا اور ملکہ الزبتھ نے تو اسے انتہائی حد کو پہنچا دیا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض صورتوں میں اجارے ہر طرح پر بجا اور درست ہوتے تھے مثلاً ملکہ نے سنہ ۱۶۰۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو ہندوستان سے بلا شرکت غیرے تجارت کرنے کا منشور عطا کیا۔ اگر اجارہ نہ ملتا تو کمپنی ایک دور و دراز ملک سے تجارت شروع کرنے کی شاید ہی جرأت کرتی۔ اور اوّل اوّل اس منصوبے پر ہرگز اس طرح بیدریغ روپیہ صرف نہ کر سکتی۔ ایسے بیش خرچ اجاروں پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن نوبت بایں جا رسید کہ معمولی سامان کی تیاری اور تجارت کے بھی اجارے ملنے لگے، مثلاً الزبتھ کے

باب دوم

زمانے میں نمک، لوہا، سیسہ، شورہ، گن ڈک، بوتل، گلاس، چمڑا، کاغذ، تیل اور سرکہ ایسی معمولی چیزوں کے بھی لوگوں نے اجارے حاصل کر لیے تھے۔ کہتے ہیں کہ ملکہ نے اپنی داد و دہش کی یہی سبیل نکال لی تھی کہ جس کی امداد مقصود ہوئی اس کو کوئی اجارہ عطا کر دیا۔ چونکہ اس سے کاروبار میں رکاوٹ ہوتی تھی، لوگوں میں شکایت اور ناراضی پھیلی۔ ملکہ نے رعایا کا یہ رنگ دیکھ کر یہ طریق ترک ہی نہیں کیا بلکہ خود ہی بہت سے نامناسب اجارے توڑ دیے؛ ملک بہت خوش اور ممنون ہوا۔ خاص خاص حالتوں میں بعد کو بھی اجارے قائم رہے، لیکن بتدریج ان میں تخفیف ہوتی گئی۔ اب صرف بشکل حق ایجاد یا حق تصنیف قانوناً معیادی اجارہ مل سکتا ہے؛ ورنہ کاروباری آزادی کا دور ہے۔ اگر عملاً اجارہ میسر آبھی جاتا ہے تو اس کے بیشتر اسباب معاشی ہوتے ہیں نہ کہ سرکاری رعایت وغیرہ۔

قانون مفلسی

۱۱۔ بہت غور و خوض کے بعد یہ قرار پایا کہ اپاہج، بیکاروں اور مفلسوں کو امداد پہنچانے کا باقاعدہ انتظام ہونا ضرور ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۶۰۱ء میں قانون مفلسی پاس ہوا۔ گاؤں گاؤں اور قصبے قصبے محتاج خانے قائم ہوئے۔ خوشحال لوگوں سے خاص ٹیکس وصول ہو ہو کر غربا کی امداد میں صرف ہونے لگا۔ بعد کو اس قانون کے عملدرآمد میں طرح طرح کی بدنظمیاں نمودار ہوئیں اور ملک میں اس کے برے نتائج پھیلے۔ لوگ بلا ضرورت بھی امداد کا سہارا ٹٹولنے لگے، اور کاہلی کو ترقی ہوئی؛ بچاو اور کارگزار لوگوں کو نکموں اور کاہلوں کی خاطر سے ٹیکس کا زیر بار ہونا پڑتا تھا۔ اول ۱۸۳۴ء میں اس قانون کو ترمیم کر کے مروجہ خرابیاں رفع کرنے کی کوشش کی گئی؛ بعد کو مزید ترمیمات ہوتی رہیں۔ اب بھی ملک میں غربا کے واسطے بہت سے خیراتی شفاخانے، مدارس اور محتاج خانے موجود ہیں۔

اس سلسلے میں دو قانون اور قابل ملاحظہ ہیں: قانون غلہ اور قانون جہازرانی۔ انگلستان کی معاشی تاریخ میں ان کے اثرات بھی نہایت عمیق اور وسیع نظر آتے ہیں۔

قانونِ غلہ

۱۲۔ متعدد قوانین غلہ وقتاً فوقتاً پاس ہوتے رہے۔ ان سب کا منشا یہ تھا کہ ملک میں زراعت کو ترقی ہو، اور ضمناً کاشتکار و زمیندار کو بھی فائدہ پہنچے۔ سب سے اوّل اڈورڈ چہارم کے عہد میں یہ قانون پاس ہوا کہ بیرونی غلہ کی درآمد

پر بہت زیادہ محصول لگانا چاہئے تاکہ ملک کی زراعت کو بیرونی غلّے کی ارزانی سے باب دوم
نقصان نہ پہنچے۔ ولیم اور میری کے عہد میں زراعت کو مزید ترقی دینے کی غرض سے
یہ قانون نافذ ہوا کہ غلّے کی برآمد پر سرکاری امداد ملنی چاہئے تاکہ انگلستان کا غلہ دوسرے
ملکوں میں جاکر ارزاں فروخت ہو اور زراعت ترقی کرے۔ حاصل کلام یہ کہ
ایک زمانے میں انگلستان کو زراعت بہت عزیز تھی، اور اس کے تحفظ اور ترقی
کے خیال سے بیرونی غلّے کی درآمد روک دی جاتی تھی، بلکہ اپنے ملک سے برآمد غلّہ کی
کوشش ہوتی تھی۔ البتہ قحط سالی میں برآمد ممنوع تھی، بلکہ بحالت مجبوری درآمد غلہ
کی ہنگامی اجازت ہوجاتی تھی۔ چارلس دوم کے زمانے میں غلّے کے محصول درآمد کا
خاص انتظام ہوا۔ جارج سوم اور جارج چہارم کے زمانے میں بھی قانون غلہ پر خاص
توجہ رہی۔ لیکن ملکہ وکٹوریا کے عہد میں ۱۸۴۶ء میں قانون غلّہ منسوخ ہوگیا، اور غلّے کی
درآمد پر خفیف سا محصول باقی رہ گیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ فصلیں خراب ہونے
کی وجہ سے غلّہ بہت گراں ہورہا تھا اور درآمد غلّہ کے بغیر چارہ نہ تھا، دوسرے
ملک میں صنعت و حرفت پھیل رہی تھی اور زراعت کا اتنا خیال نہ تھا، تیسرے
ملک میں ایک لیگ قائم ہوگئی تھی جس نے قانون غلّہ ملک کے حق میں مضر ثابت
کرکے اس کو منسوخ کرانے کا باقاعدہ بیڑا اٹھایا تھا۔ رچارڈ کبڈن اس لیگ کا بانی
اور روح رواں تھا۔ اس لیگ نے تحریر و تقریر کے ذریعے سے ملک پر اس قدر
اثر ڈالا کہ تنسیخ قانون غلہ کے تعلق سے رچارڈ کبڈن کا نام یادگار زمانہ بن گیا۔

قوانین جہاز رانی ۱۳۔ انگلستان میں قوانین جہاز رانی چودھویں صدی کے آخر سے انیسویں صدی
کے وسط تک تقریباً پانسو برس جاری رہے۔ پہلا قانون جہاز رانی رچارڈ دوم نے ۱۳۸۱ء
میں نافذ کیا، بعد کو اس میں وقتاً فوقتاً ترمیمیں ہوتی رہیں حتیٰ کہ حالات بدل جانے کی وجہ
سے وہ اس قدر ناقابل عمل ہوگیا تھا کہ ملکہ وکٹوریا کے عہد ۱۸۵۰ء میں ملک کے
اصرار سے منسوخ کردیا گیا۔ قوانین جہاز رانی کا مقصد یہ تھا کہ انگلستان میں جہاز
بکثرت بنیں، لوگ جہاز رانی سیکھیں، سمندر پر انگلستان کا تسلط رہے اور تجارت
بھی اپنے ہی ہاتھ میں رہے۔ از روئے قانون صرف انگریزی جہاز جن پر انگریز ملاح
کام کرتے ہوں، انگلستان کے بندرگاہوں میں داخل ہونے اور مال لانے لیجانے کے

مجاز تھے صرف خاص خاص حالتوں میں دوسرے ملک کے جہازوں کو اجازت مل سکتی تھی۔ اس میں شک نہیں کہ ان قوانین نے اصلی مقصد کو بڑی حد تک پورا کر دکھایا۔ انگلستان میں ان کی بدولت تجارتی جہازوں کے بیڑے تیار ہو گئے۔ مگر بین الاقوامی تجارت پھیلنے کے بعد ان قوانین کی روک ٹوک بیجا معلوم ہونے لگی۔ دوسرے ملکوں میں شکایت پیدا ہو گئی، خود انگلستان کے تاجروں نے مخالفت شروع کر دی۔ بالآخر قانون جہازرانی منسوخ ہو گیا۔

تجاریت

۱۴۔ معاشیات میں تاریخی اعتبار سے طریق تجاریت کے دو مفہوم نظر آتے ہیں۔ عام طور پر تو اس سے وہ حالت مراد ہے جبکہ انگلستان میں سونے چاندی کی بہت قدر رہا کی جاتی تھی اور تجارت خارجہ میں یہ کوشش کی جاتی تھی کہ برآمد درآمد سے بڑھی رہے تاکہ زائد معاوضہ بشکل سیم وطلا وصول ہو اور ملک میں ان کی مقدار بڑھے۔ اس مقصد کے واسطے بحالتِ ضرورت برآمد پر سرکار سے امداد ملتی تھی اور درآمد پر بھاری محصول لگائے جاتے تھے تاکہ توازن تجارت اپنے موافق رہے اور سونا چاندی وصول ہو۔ سنہ ۱۳۰۰ء سے سنہ ۱۸۱۶ء تک، ان دھاتوں کی برآمد ممنوع رہی۔ اسی سلسلے میں انگلستان کی یہ بھی کوشش رہتی تھی کہ اس کی نوآبادیوں میں پیداوار خام کے علاوہ مصنوعات تیار نہ ہوں تاکہ انگلستان ان سے پیداوار خام لیکر اپنی مصنوعات کو وہاں رواج دے۔ حاصل کلام یہ کہ بالعموم تجاریت سے تجارت خارجہ کا یہ مسلک مراد لیتے ہیں کہ توازن تجارت اپنے موافق رہے: یعنی برآمد درآمد سے بڑھی رہے اور زائد معاوضہ بشکل سیم وطلا وصول ہو۔ سترھویں صدی میں انگلستان میں اس مسلک کا بہت دور دورہ تھا۔ اور یہ علمی طور پر ثابت کرنیکی کوشش ہوتی رہی کہ جہاں تک ہو سکے تجارتِ خارجہ کے ذریعے سے ملک میں سونے چاندی کی مقدار بڑھانا مفید بلکہ ضرور ہے۔ طریق تجاریت کا یہ مفہوم بہت مروج ہے۔

لیکن معاشی تاریخ کی جدید تحقیق سے تجاریت کا ایک اور وسیع مفہوم نظر آتا ہے۔ اس سے وہ حالت مراد لیتے ہیں کہ قومی ترقی اور اقتدار کی غرض سے حکومت معاشی معاملات مثلاً زراعت، صنعت وحرفت، تجارت اور جہازرانی وغیرہ میں امداد و اصلاح کی نیت سے دخل دیتی تھی۔ گویا طریق تجاریت اپنے مفہوم

اور عمل میں طریق عدم مداخلت کا عکس تھا۔ اس اعتبار سے قانون مزدوراں، قانون کار آموزی، قانون اجارہ داری، قانون مفلسی، قانون غلہ اور قانون جہاز رانی وغیرہ سب اسی طریق کے اجزا قرار پاتے ہیں۔ یہ طریق گویا آج کل کے سرکاری اشتراک کے ہم پلہ تھا۔ البتہ مقصد میں قدرے فرق تھا: وہ یہ کہ موجودہ اشتراک کا منشا خاص طور پر مزدوروں کی امداد اور اعانت ہے اور طریق تجاریت قوم اور ملک کو حریفوں کے مقابل آزاد اور ذی اقتدار رکھنا چاہتا تھا۔ تجاریت کے نقطۂ نظر سے معاشیات بھی سیاست و حکومت کا ایک جزو معلوم ہوتا تھا۔ پس تاریخی حیثیت سے تجاریت کا اصلی مقصد قومی ترقی اور اقتدار تھا۔ اور اس مقصد کے واسطے وقتاً فوقتاً متعدد تدبیریں اختیار کی گئیں۔ امریکہ کی آبادی اور ہندوستان سے آمد و رفت کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد سترھویں صدی میں تجارتِ خارجہ کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی۔ اور حالاتِ زمانۂ مذکور کے لحاظ سے اول یہ مسلک مفید نظر آیا کہ برآمد درآمد سے بڑھی رہے، اور زاید معاوضے میں سونا چاندی وصول ہو۔ ترقی برآمد میں سرکاری امداد سے بھی کام لیتے تھے، اور درآمد کو محصول سے قابو میں رکھتے تھے۔ یہ بھی مقصود تھا اور وسیع حد تک اب بھی ہے کہ سامانِ خام باہر سے آئے اور مصنوعات اپنے ملک سے برآمد ہوں۔ اسی بات پر امریکہ سے جھگڑا ہوا حتیٰ کہ اٹھارھویں صدی کے آخر میں وہ لڑکر آزاد ہو گیا۔ اور یہی شکایت ہندوستان میں سنی جاتی ہے کہ انگلستان دل سے نہیں چاہتا کہ اس ملک میں صنعت و حرفت کو ترقی ہو بلکہ اس کی خواہش یہ ہے کہ سامانِ خام کے معاوضے میں اس کی مصنوعات خریدتے رہیں۔ بہر حال جب تجارتِ خارجہ کا ایک خاص مسلک قوم کے واسطے مفید اور ضروری قرار پایا تو تجاریت میں بھی وہی مفہوم قوی ہو گیا حتیٰ کہ اس کے قدیم وسیع معنی یعنی قومی ترقی و اقتدار کی غرض سے سرکاری امداد و نگرانی کا اہتمام، نظر انداز ہو کر جدید محدود مفہوم باقی رہ گیا۔ یعنی تجارتِ خارجہ کا یہ مسلک کہ توازنِ تجارت اپنے موافق رہے اور سونا چاندی درآمد ہو۔

اوپر کے بیانات سے واضح ہوا کہ انگلستان میں سرکار مدتوں معاشی معاملات میں بہت عملی حصہ لیتی رہی۔ منشا یہ تھا کہ ملک اور قوم کو فائدہ پہنچے اور ترقی ہو۔

باب دوم — ناتجربہ کاری کی بدولت سرکاری مداخلت سے پیچیدگیاں بھی پیدا ہوئیں، نقصان بھی پہنچے، مگر بحیثیت مجموعی نتائج اچھے نکلے۔ تجاریت کا طریق اپنا زور و شور دکھا کر سترھویں صدی کے آخر میں مدھم پڑ گیا۔ اور اقتضائے وقت سے اٹھارھویں صدی میں ایک نیا دور شروع ہوا جس سے انگلستان میں کایا پلٹ ہوگئی ؛

حقیقتی انقلاب — ۱۵۔ پندرھویں صدی تک انگلستان کی معیشت بہت ادنیٰ تھی۔ عوام کے چھوٹے چھوٹے مکانات تھے جن میں دود کش کے بجائے سوراخوں سے دھواں نکلتا۔ شاہی عمارات کے سوا کہیں شیشہ گلاس مشکل سے نظر آتا۔ بالعموم صرف بیماروں کے سر تلے تکیہ رہتا، ورنہ لوگ یوں ہی پڑ رہتے۔ لباس بھی موٹا جھوٹا تھا۔ خشک مچھلی عام غذا تھی۔ ٹیوڈر بادشاہوں بالخصوص ملکہ الیزبتھ کے عہد سے خاصی ترقی شروع ہوئی۔ امن و امان کی بدولت صنعت و حرفت میں جان پڑی۔ تجارت پھیلی۔ تاہم اٹھارھویں صدی کے آغاز تک موجودہ عظمت و اقتدار کا کوئی قرینہ واضح نہیں ہوا تھا۔ اول تو انگلستان جیسے چھوٹے ملک میں زراعت کے بل بوتے پر کسی بڑی ترقی کا ہونا محال تھا، دوسرے اس وقت تک غریب کاشتکار چھوٹے چھوٹے کھیتوں میں کاشت کرتے تھے، اور فن زراعت سے بہت کم واقف تھے۔ رہیں صنعتیں ان کا تمام تر دارومدار دستکاری پر تھا۔ آلات و اوزار بہت سادہ تھے۔ بالعموم دستکار اپنے طور پر کام کرتے تھے۔ حسب قانونِ کار آموزی لوگ دستکاروں کے پاس وقت معینہ تک رہ کر کام سیکھتے اور بشرحِ معین اجرت پاتے تھے۔ کچھ دستکار ہمیشہ دوسروں کے پاس اجرت پر کام کرتے رہتے: مثلاً اونی کپڑا ملک کی خاص صنعت تھی، ہر دستکار کے کارخانے میں عموماً چار یا پانچ کرگھے لگے رہتے۔ کتائی، بنائی، اور رنگائی، یہ سب کام وہیں انجام پاتے۔ گھر کے لوگوں کے علاوہ دو چار کار آموز اور ایک آدھ اجرتی دستکار اسی کے گھر میں رہتا سہتا اور کھاتا پیتا تھا۔ بہت مروت اور محبت میں بسر ہوتی، مدتوں علیحدگی کی نوبت نہ آتی۔ علاوہ بریں قانونِ مفلسی بھی مزدوروں اور دستکاروں کی نقل و حرکت میں مزاحمت کرتا تھا۔ بازار بہت محدود تھے اور فیشن بھی بہت کم بدلتا تھا۔ مدتوں ایک ہی چیز قرب و جوار کے واسطے بنتی رہتی۔ سڑکوں کی حالت خراب ہونے سے دور و دراز کی تجارت

بہت دشوار تھی۔ اون کے کپڑے کے علاوہ آہنگری اور کول کنی دو خاص پیشے تھے۔ نگران میں ترقی کی بہت کم گنجائش نظر آتی تھی۔ آدم اسمتھ کے زمانے تک سوتی کپڑے کا بہت کم رواج تھا۔ انگلستان بنک کی ابتدا تھی۔ اور تجارت خارجہ میں قانونی بندشوں سے بہت رکاوٹ ہوتی تھی۔ یہی وہ زمانہ ہے جبکہ فرانس اور انگلستان میں لڑائی ٹھنی ہوئی تھی کہ امریکہ اور ہندوستان پر کس کا اقتدار و تسلط رہے۔ فرانس کا رقبہ اور آبادی انگلستان سے زیادہ ہے۔ ایسی حالت میں اٹھارھویں صدی کے وسط تک کسی کو معلوم نہ تھا کہ عنقریب کیونکر انگلستان کا ستارہ چمکیگا اور اس کی تجارت وحکومت دُور دُور پھیل جائیگی۔

ایجادات

۱۶- ملکہ الیزبتھ کے عہد میں اول اول بیکن صاحب نے اپنے فلسفے میں اس پر زور دیا کہ تحقیقات میں طریق استقرائی سے کام لینا چاہیئے۔ اور خارجی مادی چیزوں کا ملاحظہ بہت مفید اور ضروری ہے۔ اس تعلیم نے مادی تحقیقات کا خاص رجحان پیدا کر دیا جس کی بدولت عجب عجب ایجادات ظہور میں آنے شروع ہوئے، اور اب تک سلسلہ جاری ہے۔ بلحاظِ اہمیت قدیم ایجادات میں جیمس واٹ کے دُخانی انجن کا نمبر سب سے اوّل ہے۔ جس کی بدولت دستکاری کی جگہ کلوں سے کام لینے کا رواج پھیلا؛ یعنی ہاتھوں کے عوض لوگ کلوں سے کام لینے لگے۔ انجن اور کلوں کے بغیر کس طرح ممکن تھا کہ انگلستان اپنے خداداد لوہے اور کوئلے سے اس قدر عظیم الشان کام لیتا اور اس کی صنعت و حرفت اور حکومت کو اتنی ترقی ہوتی۔ سنہ ۱۷۶۹ء میں پہلا انجن تیار ہوا جس سے پانی کھینچنے کا کام لیا جاتا تھا۔ سنہ ۱۷۸۵ء میں ایک روئی کے کارخانے میں انجن نے کام شروع کیا۔ اسی دوران میں لوہا گلانے اور ڈھالنے کے نئے نئے سہل اور سستے طریق نکلے۔ دو شخص کواٹ اور رویک نامی نے اس میں خاص جدّت دکھائی۔ ترقی ہوتے ہوتے یہ نوبت پہنچی کہ متعدد اقسام کی کلیں ایجاد ہوئیں جو انجنوں سے چلتی ہیں۔ لوہا اور کوئلہ بکثرت کام آنے لگا اور دولت کے سرچشمے بہ نکلے۔

دخانی انجن ایجاد ہو جانے کے بعد کلوں کا ایجاد ہونا ضرور تھا جن کے

چلانے میں انجن کام دیں۔ سنہ ۱۷۵۰ء تک سوت کی کتائی اور کپڑے کی بنائی، یہ دونوں کام دستکاری میں داخل تھے۔ اسکے بعد کلیں ایجاد ہونی شروع ہوئیں حتیٰ کہ اٹھارھویں صدی کے ختم پر کتائی اور بنائی میں بجائے ہاتھ پیر کے جابجا انجن سے کام ہونے لگا جو بھاپ یا پانی کے زور سے کلوں کو چلاتے تھے۔ ہارگریوز کرامپٹن اور آرکرائٹ ان تین شخصوں نے ابتدا میں کتائی کی کلوں میں بہت جدت دکھائی۔ انمیں سے پہلے دو معمولی جلاہے تھے اور آخری شخص ایک غریب حجام تھا۔ خدا کی قدرت! ابتدا میں ان کی ایجادوں سے کتائی کے فن کو اس قدر ترقی ہوئی کہ آج تک ان کے نام تاریخ میں دہرائے جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک پادری صاحب کارٹ رائٹ نامی نے سنہ ۱۷۸۵ء میں کپڑا بننے کی کل ایجاد کی جس کا صدی کے آخر میں استعمال شروع ہوگیا۔ ان ایجادات نے اسقدر رواج پایا کہ تھوڑی ہی مدت میں دستی کرگھے بند ہوگئے، اور جولاہوں پر بیکاری کی سخت مصیبت آئی۔ لیکن اس کے بعد اور اور طرح پر بخوبی تلافی ہوگئی۔

انیسویں صدی کے شروع سے طرح طرح کے ایجادات نمودار ہوئے مثلاً چھاپے خانوں میں انجن اور کلوں سے کام ہونے لگا۔ چنانچہ سب سے اول ٹائمز اخبار سنہ ۱۸۱۴ء میں اس طرح پر چھپنا شروع ہوا۔ گیس کی روشنی نکلی اور شہروں میں پھیلنے لگی۔ برتن بنانے اور کپڑا دھونے میں بھی ایجادات سے ترقی ہوئی۔ ڈیوی کا مشہور سیفٹی لمپ بھی اسی زمانے میں ایجاد ہوا، جس سے کان کنی میں بیحد مدد ملی۔ المختصر ہر طرف ایجادات کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ لیکن ان سب میں وہ ایجادات بہت اہم اور نتیجہ خیز ثابت ہوئے جن سے آمد و رفت، نقل و حمل اور خبر رسانی میں سرعت اور سہولت پیدا ہوگئی۔

اول اول دخانی کشتیاں تیار ہوئیں۔ ترقی ہوتے ہوتے سنہ ۱۸۱۹ء میں پہلے دخانی جہاز نے بحر اٹلانٹک کو عبور کیا۔ سنہ ۱۸۱۴ء میں اسٹیفنسن نے جو کہ کبھی ایک غریب مزدور تھا، اپنا مشہور ریلوے انجن ایجاد کیا جس نے بڑے سفر کی مشکل آسان کردی۔ سب سے اول سنہ ۱۸۳۰ء میں لورپول اور منچسٹر کے درمیان باقاعدہ ریل جاری ہوئی۔ سنہ ۱۸۳۶ء میں برقی تار پر خبر رسانی شروع ہوئی۔ سنہ ۱۸۴۰ء میں ڈاک کے

باب دوم

ٹکٹ نکلے۔ اس سے قبل تمام خطوط بیرنگ یعنی محصول طلب جاتے تھے۔ مرسل الیہ خواہ محصول دے کر خط قبول کرلیتا خواہ واپس کر دیتا۔ شرح محصول بہت زیادہ تھی۔ اب یہ طریق نکلا کہ خود مرسل ڈاک کا ٹکٹ لگا کر محصول ادا کرنے لگا اور شرح میں بہت تخفیف ہو گئی۔ سنہ ۱۸۵۱ء میں کیبل یعنی بحری تار لگنا شروع ہوا حتیٰ کہ سنہ ۱۸۶۶ء تک بحر اٹلانٹک میں جا پہنچا۔ صدی کے آخر میں ٹیلیفون ایجاد ہوا۔ بیسویں صدی کے شروع سے بلا تکلف بے تار کی خبریں اڑنے لگیں۔ موٹر اور ٹریم کار نکل پڑیں۔ برقی روشنی پھیلی اور جنگ یورپ میں ہوائی جہازوں نے وہ عروج پایا کہ اب وہ ریل اور جہازوں کو نیچا دکھا رہے ہیں۔ ڈاک پر تو ہر جگہ ان کا قبضہ ہو رہا ہے، جو ڈاک ہندوستان اور انگلستان کے درمیان جہاز کے ذریعہ پندرہ پندرہ روز میں پہنچتی تھی وہ اب ہوائی جہاز کے ذریعہ بلا تکلف پانچ روز میں پہنچتی ہے، اس کے سوا مسافروں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ ہوائی جہازوں کی آمد و رفت کے سلسلے ہر طرف پھیل رہے ہیں، خود ہندوستان میں ان کا رواج بڑھ رہا ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ ایک طرف تو کلوں کے رواج سے صنعت و حرفت میں کایا پلٹ شروع ہو گئی بڑے بڑے کارخانے قائم ہوئے جہاں بکثرت سامان اچھا اور سستا تیار ہونے لگا؛ کوئلے اور لوہے کی افراط نے کلوں میں اور بھی روح پھونک دی۔ دوسری طرف ذرائع آمد و رفت، نقل و حمل اور خبر رسانی میں اسقدر وسعت و سرعت پیدا ہوئی کہ گویا زمین کی طنابیں کھنچ گئیں۔ دور دراز ملکوں کا سفر کرنا، مال لانا لے جانا اور خیر خبر رکھنا ایک سہل بات ہو گئی۔ ساتھ ہی ساتھ حسن اتفاق دیکھئے کہ دوسرے ممالک مثلاً ہندوستان، افریقہ، امریکہ، آسٹریلیا اور مصر میں انگریزوں کے قدم جمتے گئے۔ ان ملکوں سے سامانِ خام لانا اور وہاں اپنی مصنوعات پہنچانا انگلستان نے اپنا مسلک قرار دیا۔ نتیجہ جو کچھ ہوا اظہر من الشمس ہے! دیکھتے ہی دیکھتے انگلستان صنعت و حرفت اور حکومت کا مرکز بن گیا اور اس قدر دولت پیدا کی کہ ملک نہال اور مالا مال ہو گیا۔

طریق عدم مداخلت یا کاروباری آزادی

۱۷- جوں جوں ایجادات سے صنعت و حرفت اور تجارت کو ترقی ہوئی

قدیم قوانین جن کا اوپر ذکر آچکا ہے، سدِّ راہ محسوس ہوئے۔ وہ سکون کے مقتضی تھے اور یہاں کاروبار میں تموّج شروع ہو رہا تھا۔ انوکھی چیزیں چلیں اور نت نئے طریق نکلے۔ اول قوانین مزاحم ہوئے لیکن بالآخر سیلاب ترقی ان کو بہالے گیا اور کچھ عرصے کے واسطے کاروباری میدان بالکل صاف ہوگیا۔ سرکار نے مداخلت کیا نگرانی بھی ترک کر دی۔ اوّل آدم اسمتھ نے اپنی مشہور تصنیف دولت اقوام میں جو کہ ۱۷۷۶ئہ میں شائع ہوئی، سرکاری مداخلت کی علمی پیرایے میں سخت مخالفت کی۔ اقتضائے وقت بھی اس رائے کا مؤیّد ہوگیا۔ جنگ نپولین میں تمام یورپ کی بری گت بنی تھی، البتہ انگلستان اس کی دست برد سے محفوظ رہا۔ اسی دوران میں یہاں ایجادات کو ترقی ہوئی۔ ہندوستان اور امریکہ سے انگلستان کی تجارت برقرار رہی۔ ختم جنگ پر دیکھا تو یورپ میں صنعت و حرفت، تجارت اور جہازرانی سب انگلستان کے ہاتھ میں تھی۔ ساتھ ہی اس زمانے میں قحط نمودار ہوئے اور ابتداءً میں کلوں کے رواج نے بہت سے مزدور اور صناعوں کو بیکار کر دیا۔ جس کی وجہ سے عام بےچینی پھیل گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم قوانین کی ترمیم اور تنسیخ کی ضرورت بشدت محسوس ہونے لگی۔ بالآخر ۱۸۱۳ئہ سے پارلیمنٹ نے بتدریج یہ کام شروع کیا اور ۱۸۴۶ئہ تک تقریباً وہ تمام قوانین منسوخ یا ترمیم ہوگئے۔ صنعت و حرفت اور تجارت میں ملک کو پوری آزادی مل گئی۔ مگر تھوڑے ہی تجربے کے بعد پھر سرکاری مداخلت اور نگرانی کا مطالبہ شروع ہوگیا۔ چنانچہ قانون کارخانجات، قانون بنک وغیرہ نمودار ہوئے لیکن نئے قوانین کا منشا اور مسلک بالکل علیحدہ ہے جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں:۔

کارخانجات

۱۸۔ جب تک صنعت و حرفت میں دستکاری کا دور رہا، صنّاع اپنے اپنے طور پر کام کرتے تھے۔ خود سامانِ خام خریدتے، خود ضروری آلات و اوزار رکھتے، اپنے ہی مکان یا قریب کی دکان پر بیٹھ کر کام کرتے، ان کے ہاں کچھ کارآموز اور صناع بھی رہتے جو ہاتھ بٹاتے۔ یہ بھی ان ہی کے فرقے میں شمار ہوتے تھے۔ مال اکثر قرب و جوار کے خریداروں کی فرمائش پر تیار ہوتا تھا۔ پارچہ بافی میں یہ بھی طریق تھا کہ سامان خام دے کر بشرح معیّن کپڑا تیار کرا لیا۔ اس صورت میں پارچہ بافوں

باب دوم
کو خریداروں کی بھی فکر نہیں رہتی تھی۔ ساتھ ساتھ کئی پیشے چلاتے تھے، مثلاً کاشتکار و نجی بہو بیٹیاں فرصت کے وقت سوت کات لیتیں، جولاہے موقع پاکر گھر کے خرچ کے لائق غلہ ترکاری بو لیتے۔ غرضکہ سہل اور سادہ طرز پر کاروبار چلتا تھا۔

انجن اور کلوں کے رواج نے صنعت و حرفت میں ایک انقلاب برپا کردیا۔ خود صناع اور کاریگروں کے پاس اتنی گنجائش کہاں جو بیش قیمت انجن اور کلیں خریدیں، ان کے واسطے بڑے بڑے کارخانے بنائیں، یا مزدور رکھیں، اور بڑے پیمانے پر کاروبار چلائیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دولتمندوں میں آجروں کا ایک طبقہ نمودار ہوا جنھوں نے اپنا اصل لگا لگا کر کارخانے قائم کردیے اور صناع و کاریگر مقابلہ کی تاب نہ لاکر ان کے کارخانوں میں اجرت پر کام کرنے لگے یہیں سے آجر اور مزدوروں کی تفریق شروع ہوئی جو آج اس قدر نمایاں اور اہم نظر آتی ہے۔ کلوں کے رواج سے اوّل اوّل صناعوں پر بہت مصیبت پڑی۔ ان کی دستکاری کی قدر اٹھ گئی۔ معمولی مزدور کارخانوں میں کلوں کے ذریعے سے کہیں بہتر مصنوعات تیار کرنے لگے۔ کلوں نے صناعوں کی مہارت اور ہنرمندی بیکار کردی۔ کارخانوں میں معمولی مزدور بلکہ عورتیں اور بچے کام کرتے اور وہ سامان تیار ہوتا کہ اچھے اچھے صناع کان پکڑتے۔ بے ہنر اور غریب مزدوروں کا تو بھلا ہوا مگر شروع میں قدیم ہنرمند دستکاروں کو بہت مصیبت اٹھانی پڑی۔ البتہ بعد کو کارخانوں کی ترقی سے انھیں بھی مناسب حال کام ملنے لگا اور نقصان کی تلافی ہوگئی۔ کلوں کے رواج سے صنعت و حرفت کے مرکز بھی بدل گئے۔ قدیم زمانے سے انگلستان کے شرقی و جنوبی اضلاع صناع اور دستکاروں کا وطن تھا لیکن لوہے اور کوئلے کی یہاں قلت تھی اور ان کے برعکس غربی اور شمالی اضلاع میں افراط نکلی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بیشتر کارخانے اسی طرف قائم ہوئے اور صنعت و حرفت اُدھر سے ڈھل کے ادھر آگئی۔ قدیم مرکز ایسے ویران ہوئے کہ بعض اب تک پورے طور پر نہیں پنپے۔

اوّل تو کارخانے قائم ہونے سے محنت مزدوری کا طریق بالکل بدل گیا۔ آجر اور مزدوروں کے دو جدا گانہ فرقے بن گئے۔ اصل محنت سے الگ ہو چلا۔ قدیم دستکاروں کی ہنرمندی کا امتیاز مٹ گیا۔ کارخانوں میں صدہا غریب مرد،

باب دوم عورت اور بچے مزدوری کرنے لگے ۔ صنعت وحرفت کارخانوں کے قبضے میں آگئی ۔ اور کارخانوں نے اپنے واسطے نئے نئے مرکز قرار دیے ۔ اس انقلاب سے صناع اور مزدور عجیب حیرانی اور پریشانی میں پڑ گئے ۔ قدیم سکون واطمینان بالکل غائب ہوگیا ۔ کسی حالت کو قرار نہ تھا ۔ سیلاب ترقی نے سب فرقوں کو تہ وبالا کر دیا اور آج تک اس کا تموج جاری ہے ۔ اس کی تفصیل کے واسطے جداگانہ ضخیم کتاب درکار ہوگی ؛

المختصر یہ کہ ترقی کی امنگ میں رسم ورواج اور قدیم قوانین کو توڑ پھوڑ کے لوگ دولت کمانے پر پل پڑے ۔ ہر شخص منفعت طلبی کا مجسمہ بن گیا ۔ ہر طرف نفسی نفسی اور ہل من مزید کا نعرہ بلند ہوا ۔ تمام ملک اس صدا سے گونج اٹھا ۔ نئے آجر روز افزوں ترقی میں سرگرداں تھے ۔ قدیم دستکار اور صناع بیکاری سے پریشان تھے اور غریب مزدور کارخانوں میں حیران ۔ صدہا مرد، عورت، بوڑھے، بچے بلا مبالغہ بھیڑ بکریوں کی طرح کارخانوں میں بھرے رہتے اور سب طرح کا کام وقت ناوقت کرتے ۔ متواتر قحطوں نے غربا کو اور بھی ناچار کر دیا ۔ آجروں کی بن آئی ، خوب کام لینا اور حسب مرضی اُجرت دینا ۔ اس ابتری سے تھوڑے ہی عرصے میں صحت، اخلاق اور معاشرت کو اس قدر نقصان پہنچا کہ شور برپا ہوگیا اور بالآخر سرکار کو قانون کارخانجات نافذ کرنا پڑا تاکہ کارخانہ دار مزدوروں پر چیرہ دستی نہ کر سکیں اور صحت واخلاق محفوظ رہے ۔ ساتھ ہی مزدوروں کے حواس درست ہوئے تو انھوں نے بھی اتحادی انجمنوں کی بنا ڈالی تاکہ وہ متحد ہو کر آجر کے مقابل اپنے حقوق کی حفاظت کر سکیں ۔ اور آج ان انجمنوں کو وہ اقتدار حاصل ہے کہ آجر بلکہ ملک بھی ان کا رعب مانتا ہے ۔ صنعت اور کاروبار کی ترقی کے ساتھ ساتھ زر، ہنڈی، بنک، محدود کمپنی اور اس کے حصص وتمسکات، کروڑگیری یعنی محصول درآمد وبرآمد، حق اختراع وایجاد اور گوناگوں معاشی امور کے متعلق وقتاً فوقتاً قوانین پاس ہوئے ۔ حتیٰ کہ اب ان کا ایک جداگانہ وسیع نظام نظر آتا ہے ؛

خلاصہ ۱۹ ۔ اٹھارھویں صدی کے وسط تک تو انگلستان کا مستقبل کچھ اُمید افزا نظر نہیں آتا تھا ۔ لیکن اس کے بعد حالات نے ایسی مساعدت کی کہ صدی ختم ہوتے تک کایا پلٹ ہوگئی ۔ اوّل تو جنگ نپولین کے دوران ہی میں انگلستان کی صنعت وحرفت

بڑھ چلی۔ دوسرے نپولین کی شکست کے بعد ۱۸۱۵ء سے لے کر ۱۸۵۴ء تک چالیس سال انگلستان کو اپنی ملکی اور قومی ترقی کا خوب موقع ملا۔ کوئی جنگ خلل انداز نہ ہوئی۔ یہ وہ زمانہ ہے جبکہ دوسرے ممالک یورپ تو نپولین کی دستبرد سے ہیجان پڑے ہوئے تھے اور انگلستان میں نت نئی ایجادیں اور صنعتیں نمودار ہو رہی تھیں۔ اور انگریزی جہازوں کا امریکہ اور ہندوستان کی تجارت پر پورا قبضہ تھا۔ اس اجمال کی سبق آموز تفصیل تواریخ میں قابل ملاحظہ ہے۔ المختصر انگلستان کو صنعت و حرفت اور تجارت کی ترقی میں یورپ کی دوسری اقوام پر سبقت حاصل کرنے کا شروع میں خاص موقع مل گیا۔ البتہ اس کے بعد بہت سے حریف پیدا ہوگئے، خصوصاً جرمنی اور امریکہ کاروبار میں مدمقابل بن گئے۔ جدید طریقوں میں مبتدی ہونے کی وجہ سے انگلستان کو کافی تلخ تجربے ہوئے جس سے بعد کے پیرووں کو عبرت اور سہولت حاصل ہوئی؛

انگلستان کے تجربے سے ثابت ہوا کہ یکایک بڑے بڑے منصوبوں پر پیش قدمی کرنے میں ناکامی کا سخت اندیشہ رہتا ہے۔ کیونکہ لوگوں کو ان کی برداشت کم ہوتی ہے، اور عجلت سے مخالفت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انسانی خیالات و رجحانات کی بہت کچھ ترمیم و اصلاح ممکن ہے۔ اور اس زمانے میں تو خیالات کا تغیر ہر طرف بسرعت تمام جاری ہے۔ تاہم خیالات کے نشوونما میں وقت لگتا ہے اور استحکام خیال کے بغیر کسی نظام تمدن کا چلنا محال ہے۔ پس ہمیشہ جدید منصوبے تجویز کرنے میں ترقی خیالات کی قوت و رفتار کا ملحوظ رکھنا ضرور ہے ورنہ منصوبے بار خاطر بن کر منہ کے بل گریں تو عجب نہیں۔ نصب العین ضرور خیالات کے آگے رہے مگر نہ اس قدر آگے کہ خیالات حیران ہو کر اس کا تعاقب چھوڑ دیں؛

حصّۂ دوم

پیدائش دولت

باب سوم

پیدائش کا مفہوم

(۱) انسان کے کارنامے (۲) پیدائش کی ماہیت (۳) پیدائش کا منشاد (۴) خلاصہ۔

انسان کے کارنامے

۱- انسان کے کارناموں پر تو ذرا نظر ڈالئے کہ اس نے پہاڑ کاٹے، سمندر پاٹے ریگستان رَوندے، برفستان کھوندے، جنگل میں منگل منائے، سمندر سے موتی رولے، زمین کے دفینے کھولے، کرۂ ارض کی طنابیں کھینچیں، وقت میں قیامت کی وسعت پیدا کی، اور آگ پانی کے عمل سے تمام دنیا کو مسخر کیا۔ چیزیں اتنی بنائیں کہ ان کا حد نہ حساب، اور ہر ایک ایسی انوکھی کہ دیکھ کر عقل دنگ رہجائے اور ابھی نچنت ہو کر بیٹھنے کا نام نہیں لیتا۔ بلکہ جس قدر اس کی استطاعت بڑھتی ہے ہوس بھی زیادہ ہوتی ہے۔ غرضکہ تمام عالمگیر تلاطم اور انقلابات کے باعث یہی حضرت انسان ضعیف البنیان ہیں جو جثہ، جرأت، طاقت، تیز رفتاری، دُور بینی اور دیگر صفاتِ جسمانی میں حیوانوں سے کہیں دبے ہوئے اپنی بقا اور پرورش کے واسطے بیرونی امداد کے سب سے زیادہ محتاج ہیں۔ لیکن خدا نے ان کو عقل کا ایسا اسم اعظم عطا کیا ہے اور چھوٹے چھوٹے دو ہاتھ ایسے زبردست آلے دیے ہیں کہ ساری دنیا قدموں سے لگی پڑی ہے۔

حصہ دوم
باب سوم
پیدائش کی ماہیت

۲- جس انسان نے تمام عالم کو تہ و بالا کر دیا ہو اس کی قوت کا کیا ٹھکانا ہو گا اور کونسی چیز پیدا کرنے پر وہ قادر نہ ہو گا! لیکن یہ خیال سراسر غلط ہے۔ اگر سچ پوچھو تو اس کو پیدائش میں برائے نام بھی دخل نہیں، وہ نہ ایک ذرّہ پیدا کر سکتا ہے نہ نابید۔ بلکہ انسان کی تمام کارگزاریوں کا لب لباب یہ ہے کہ یا تو وہ موجودہ چیزوں کا صرف مقام بدل دیتا ہے؛ مثلاً موتی اور معدنیات نکالنا؛ یا موجودہ اشیا کے اجزا کو نئی ترکیب دیدیتا ہے؛ مثلاً لکڑی، لوہا، بید اور وارنش سے کرسی بنانا؛ اور یا عاملین قدرت کی وساطت کلی سے صورت بھی بدل دیتا ہے؛ مثلاً زراعت، کسان کا کام صرف اتنا ہے کہ بوقت معیّن اور بطریق مخصوص زمین، کھاد، تخم اور پانی ایک جا کر دے۔ پودے اُگانا، پھول کھلانا، پھل لگانا اور ان کو پکانا، یہ سب کام عاملین قدرت، مثل گرمی، سردی، ہوا اور روشنی کے متعلق ہیں۔ غریب کسان کو ذرّہ برابر دخل نہیں، وہ تو کھیتی بو کر بزبان حال قدرت سے کہہ دیتا ہے مصرع سپردم بتو مایۂ خویش را۔ کبھی ابر رحمت اور موافقت موسم کی دعائیں مانگتا ہے، کبھی آفاتِ سماوی سے پناہ چاہتا ہے۔ اکثر کھیت سے گونیں بھر بھر غلّہ اٹھاتا ہے، اور کبھی ساری لاگت خاک میں ملا کر دستِ حسرت ملتا رہ جاتا ہے۔ عمل پیدائش میں کسان کی بے بسی بھی کس قدر قابل رحم اور عبرت آموز ہے۔ حالانکہ پیدائش کا سب سے اہم صیغہ اسی کے متعلق ہے۔ اور یہ جو ایک دانہ غلّے سے بہت سے دانے نکلتے ہیں اور چھوٹے سے تخم سے تناور، دیرپا اور بار آور درخت پیدا ہوتے ہیں، مانا ہم نے کہ عاملین قدرت ان کو ظہور میں لاتے ہیں لیکن کیا وہ ان کو نیست سے ہست کرتے ہیں؟ ان کی تخلیق پر قادر ہوتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ حسب قوانین قدرت صرف مادّے کی صورت بدل کر نمودار کر دیتے ہیں اور یہ پھل پھول سے لدے پھندے پودے اور درخت کیا ہیں؟ مادّے کے بیشمار اجزا عاملین قدرت کی مدد سے بطریق نامعلوم ہزار ہا رنگ روپ بدل کر پردۂ زمین سے نکلتے ہیں؛ گویا آسمان سے اترے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ پیدائش سے مُراد تخلیق نہیں بلکہ چند خاص قسم کی تبدیلیاں ہیں جو اوپر بیان کی جا چکی ہیں۔

پیدائش کا منشا

۳- اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیدائش کی غرض و غایت کیا ہے؟

حصۂ دوم
باب سوم

اس کا جواب ہے افادہ حاصل کرنا یا بڑھانا۔ مقدمے میں بیان ہو چکا ہے کہ ہر چیز میں کم وبیش افادہ ضرور موجود ہے لیکن ہم یا تو اس سے سراسر بیخبر ہیں، یا با وجود واقفیت بوجہ عدم دسترس اس سے مستفید نہیں ہو سکتے، یا اگر ہوں بھی تو کمتر۔ ہر ایک چیز سے پورا پورا افادہ حاصل کرنا اور موجودہ محرومی کے اسباب رفع کرنا پیدائش کی اصلی غرض اور منشاء ہے۔ صرف چند سال سے ہم نے گلی کوچوں کی خاک سے المونیم کے برتن بنانے سیکھے ہیں۔ موتیوں اور قیمتی دھاتوں کی قدر وقیمت سے تو واقف تھے مگر سمندر اور کانوں کی تہ سے ان کا نکالنا بیحد مشکل تھا۔ جوسن آج ریشم کو بھی ماند کر رہا ہے، مدتوں ہم اس سے صرف رسی ڈور بٹا کئے۔ اور ظاہر ہے کہ افادہ پہلے ہی سے ہر چیز کی ذات میں مضمر ہوتا ہے کچھ پیدائش اس کو عدم سے وجود میں نہیں لاتی، البتہ انسان کا قابو اور دسترس افادے پر ضرور بڑھا دیتی ہے اور بس۔

خلاصہ

۴۔ بالفاظ مختصر پیدائش دولت کی چند صورتیں ہیں: نقل مقام، تبدل ترکیب، تغیر صورت، یا ان افعال میں سے کسی دو یا تینوں کا اجماع۔ پیدائش کا منشاء افادہ بڑھانا یا نکالنا ہے، جو کہ پہلے سے چیزوں میں مندمج ہوتا ہے۔

باب چہارم

عاملین پیدائش

(۱) زمین (۲) محنت (۳) اصل (۴) اصل کی سرگزشت
(۵) اصل کی کارگزاری (۶) خلاصہ۔

۱۔ پیدائش کا مفہوم تو بیان ہو چکا۔ اب دیکھیں کہ کون خاص خاص وسائل زمین پیدائش کے واسطے لابدی ہیں، کن عاملین کی کارگزاری پر پیدائش کا دارومدار ہے اور ان میں ہر ایک اپنے اپنے طور پر کہاں تک اس کام میں حصہ لے رہا ہے؟ سب سے اوّل تو زمین ہے کہ وہ ہر چیز کا مبداء اور منبع ہے۔ اگر زمین نہ ہو تو خلقت کہاں رہے اور جمادات و نباتات کہاں سے آئیں۔ غرضکہ اگر زمین نہ ہو تو کچھ بھی نہ ہو۔ دنیا اسی کے وجود سے وابستہ ہے۔ پس عاملین پیدائش میں اس پر کس کو سبقت حاصل ہو سکتی ہے۔ نہ صرف لابدا و رناگزیر ہے بلکہ جتنی ضروریات زندگی ہیں شاید ہی کوئی ایسی ہو کہ اسکی پیدائش میں زمین مدد نہ دیتی ہو۔ ہماری خوراک، ہمارا لباس، ہمارے مکانات اور موجودہ زمانے کے لاتعداد تنعمات، اگر ان کی اصلیت پر غور کرو اور ان کی ابتدا کا سراغ لگاؤ تو وہ یقیناً زمین ہی پر ختم ہوتے ہیں۔

۲۔ زمین مواد ضرور مہیا کر دیتی ہے لیکن اس کو دولت بنانا انسان کا محنت کام ہے۔ زمین کی پیداوار بغیر انسان کی محنت کے دولت نہیں بن سکتی جیسا کہ مقدمے میں واضح کیا جا چکا ہے، کہ اگر سونے کے پہاڑ اور جواہرات کے انبار ہوں لیکن انسان کے ہاتھ نہ آسکیں تو یقیناً مٹی اور کنکر سے بھی زیادہ نکمے ہیں۔ کوئی ان کو دولت نہیں شمار کر سکتا۔ ورنہ یہ بے شمار جگمگاتے ستارے جن میں خدا جانے کیسے کیسے عجائبات بھرے پڑے ہیں سب ہی ہماری دولت ہیں؛ اور شاید ہی کوئی چیز احاطۂ دولت سے خارج ہو سکے۔ لیکن اس بات سے کوئی بھی ایک لمحے کے واسطے متفق نہیں ہو سکتا

باب چہارم که دولت کے واسطے افادہ اور مبادلہ پذیری لازمی ہے۔ اور مقدمے کی مفصل بحث سے ظاہر ہوگا کہ ان کے واسطے انسانی دسترس لابدی ہے۔ جو چیز انسان کے کام نہ آسکے اس کے افادے کے کیا معنی اور جو انسان کی دسترس سے باہر ہو اس میں مبادلہ پذیری کیونکر ممکن ہے؟ وہی خود رو جنگل جن میں وحشی قومیں نہایت قابل رحم افلاس کی زندگی بسر کرتی ہیں، جب مہذب قوموں کے ہاتھ آجاتے ہیں تو محنت کے ذریعے سے اتنی پیداوار اگلتے ہیں کہ دنیا مالامال ہوجاتی ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ بحیثیت دولت وہ جنگل دونوں حالت میں یکساں ہے۔ اگر فرق ہے اور یقیناً زمین آسمان کا فرق ہے تو اس کا باعث کیا؟ یہی محنت۔ ورنہ وہی جنگل، اسی کی پیداوار، نہ جنگل بدلا، نہ پیداوار آسمان سے برسی۔ البتہ جب سے محنت کا دخل ہوا، اس جنگل کو کچھ ایسا پارس پتھر چھو گیا کہ سونا ہی سونا ہوگیا۔ پس صاف ظاہر ہے کہ دولت کی پیدائش کے واسطے زمین اور محنت دونوں لابدی ہیں۔ اور یہ طے کرنا کہ ان میں سے کون زیادہ ضروری ہے اور کون کم؟ بعینہ ایسا سوال ہے کہ اولاد کی پیدائش میں زیادہ حصّہ کس کا ہوتا ہے، ماں کا یا باپ کا؟ بھاپ زیادہ تر پانی سے پیدا ہوتی ہے یا آگ سے؟ قینچی کا اوپر والا پھلڑا کپڑا کترتا ہے یا نیچے والا؟ اور ان سوالات کا صحیح جواب صرف ایک ہے کہ دونوں یکساں لابدی اور ناگزیر ہیں، اور بس۔ یہ امر قابل یادداشت ہے کہ معاشی مباحث میں دولت سے ہمیشہ معاشی دولت مراد ہوتی ہے۔ دولت کے دیگر اقسام کا جب ذکر آتا ہے تو اس کی بالعموم صراحت کردی جاتی ہے۔

اصل

۳۔ ایک لطیفہ سنیئے کہ زمین اور محنت کے عقد سے ایک بچّہ پیدا ہوا جو ایسا بلند اقبال نکلا کہ آج چار دانگ عالم میں اس کا ڈنکا بج رہا ہے۔ امیر غریب سب اس کے دست نگر ہیں۔ جدھر گزرتا ہے خلقت نہال ہوجاتی ہے۔ پیدائش کے میدان میں وہ کمال دکھا رہا ہے کہ والدین بھی اس کے توسل کے طالب نظر آتے ہیں۔ اس کی دستگیری سے ان میں بجد چستی اور طاقت آتی ہے، اس کے تقرب سے ان کی بہت کچھ قدر و پرسش کی جاتی ہے۔ اگر

باب چہارم

ساتھ چھوٹ جاوے تو کس مپرسی میں والدین کو ہاتھ پیر ہلانا بھی دو بھر ہو جاتا ہے محض اشتیاق بڑھانے کی غرض سے تعارف میں نام ظاہر نہیں کیا۔ صاحب موصوف دراصل حضرتِ اصل ہیں۔ دور اندیش مغربی قوموں نے بیحد خاطر و مدارات کرکے ان کو اپنی طرف اس قدر مائل کر لیا ہے کہ اب وہ زیادہ تر ان ہی کے پاس مقیم رہتے ہیں اور اپنے کمالات سے ان کو فیض پہنچا پہنچا کر دنیا کی باقی اقوام سے بدرجہا معزز و ممتاز بنا رہے ہیں۔ صاحب موصوف کی ولادت اور پرورش کا تھوڑا سا حال بیان کرکے ہم ان کی کارگزاریوں کی ضروری تشریح کریں گے؛

اصل کی سرگزشت

۴۔ کسی زمانے میں انسان خودرو درختوں کے پھلوں سے اپنا پیٹ پالتا اور پتوں سے اپنا جسم ڈھانکتا ہوگا۔ زمین اور محنت کے میل کا یہ سب سے پہلا موقع ہوگا۔ اول اول وہ صرف ہاتھ سے کام لیتا ہوگا۔ بلند درختوں کے پھل اور پتے توڑنے میں دقت پیش آتی ہوگی۔ بالآخر فرصت کے وقت فراغت سے بیٹھ کر تدبیر سوچتے سوچتے اس نے کسی سیدھی لمبی اور ہلکی لکڑی کے سرے پر چھوٹی سی بالشت بھر لکڑی گھاس سے ترچھی باندھ کر لگی بنائی ہوگی کہ جس درخت سے چاہے پھل گرالے۔ یہی لگی غالباً اصل کی ابتدا ہوگی۔ جب پھل توڑنے میں آسانی ہو گئی تو اس کے پاس فرصت کا وقت زیادہ نکل آیا اور اس نے جال، تیر، کمان اور سخت پتھروں کے تیز دھار کے آلے بنا کر چھوٹے موٹے چرند و پرند کا شکار شروع کر دیا۔ ان ایجادات کا بھی اصل میں اضافہ ہوا۔ اب روز غذا تلاش کرنے کی ضرورت نہیں رہی ہوگی۔ ایک دن شکار اور پھل جمع کرکے کئی دن کام چلاتا ہوگا؛ فرصت کے دنوں میں لاکھ تدبیریں کرکے اس نے رفتہ رفتہ چند تربیت پذیر وحشی جانوروں؛ مثلاً گائے، بھینس، گھوڑے، بکری کو پکڑ پکڑ کر پالو بنایا ہوگا؛ ان کا دودھ پیتا اور گوشت کھاتا ہوگا، ان پر سوار ہو کر جنگل جنگل گھومتا ہوگا، اور ان کی کھال کا لباس بناتا ہوگا۔ بالآخر خانہ بدوشی سے تنگ آکر کوئی اچھا سا سرسبز اور زرخیز قطعہ پاکر وہیں رہ پڑا ہوگا۔ ہل بنا، گھوڑے، بیل کی مدد سے زمین جوت کھیتی شروع کر دی۔ رہنے سہنے، پیداوار رکھنے، اور بیل مویشی باندھنے کے لیے کچھ کچے جھونپڑے بنا لیے؛ گویا کسان نے گاؤں بسانا شروع کیا۔

حصّہ دوم
باب چہارم

پالو جانور اور آلاتِ کاشتکاری بھی اصل میں داخل ہوئے۔ کھانا، لباس، مکان، بیل، مویشی، کھیتی کا سامان، اب ضروریات اس قدر بڑھ گئیں کہ ان کا مہیّا کرنا ایک آدمی کے قابو سے باہر ہو گیا۔ لہٰذا تقسیم عمل کے زرّیں اصول پر کاربند ہونا پڑا۔ کسان گھسیارے، جولاہے، بڑھئی، لوہار، حجام اور موچی غرضکہ چند فرقے پیدا ہو گئے اور معاشی ترقی آجکل کے پسماندہ گاؤں کی حالت تک آپہنچی۔ ہر پیشے کے آلات اور اوزار، اصل میں اضافہ ہوئے۔ کسان کا اصل ہل بیل، لوہار کا ہتوڑا اور دھونکنی، بڑھئی کا آرہ، بسولہ، جولاہے کا چرخہ اور کرگہ، گھسیارے کا جالی کھرپا اور حجام کا استرہ، قینچی، اور موچی کی رانپی، سوتاری: وہی اصل جو اول لگی کی شکل میں نمودار ہوا ہوگا اب کتنی مختلف شکلیں اختیار کرتا جاتا ہے۔ لیکن کام سب کا ایک ہے: یعنی دولت کی پیدائش میں ہاتھ بٹانا۔ یہ ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ زمین اور محنت ہی نے مل کر اور فرصت کا وقت نکال کر اس کو پیدا کیا۔ اب خدا کی رحمت دیکھئے! کہ اصل کی نسل مچھلی سے زیادہ بڑھی اور امر بیل سے زیادہ پھیلی۔ آج نہ اس کی قسموں کا شمار نہ اس کے تصرف سے کوئی پیشہ آزاد۔ درزی کی سوئی اور حجام کے استرے سے یورپ کے بے انتہا قیمتی انجنوں، مشینوں اور آلات تک، اصل ہی کا خاندان پھیلا ہوا ہے۔ مثل آدمیوں کے اتنا فرق ضرور ہے کہ ان میں سے کوئی قوی ہے کوئی ضعیف، کوئی معزز کوئی حقیر، لیکن ہیں سب ایک ہی نسل سے اور ہر ایک اصل کے لقب کا پورا پورا مستحق ہے۔ یہ تو اصل کی خاندانی سرگزشت تھی اب اس کی کارگزاریوں پر نظر ڈالنی چاہئے۔

اصل کی کارگزاری

۵۔ اگر مغرب و مشرق کی معاشی حالت کا موازنہ کیا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ ایک جوان رعنا ہے تو دوسرا پیر فرتوت، ایک دریائے موّاج ہے تو دوسرا چشمۂ تنک آب، ایک مالامال ہے تو دوسرا خستہ حال۔ آخر اس قدر فرق کی وجہ؟ ایشیا کی زمین بحیثیتِ مجموعی یورپ کی زمین سے زیادہ زرخیز، یہاں کی آب و ہوا پیداوار زرعی کے واسطے زیادہ موزوں، یہاں کے باشندے کم خرچ اور بیشتر محنتی اور جفاکش؛ اور اس پر نتیجہ یہ کہ ایشیا یورپ کا محتاج، دست نگر خوشہ چین! اس معمّے کا راز صرف یہی اصل ہے۔ ایشیا کے پاس دو عامل زمین اور محنت

بدرجۂ اولیٰ موجود مگر ایک اصل کے نہ ہونے سے بے بس اور ناچار۔ یورپ کی معاملہ فہم و دوراندیش اور باریک بیں قوموں نے اصل کی قوت کا صحیح اندازہ کرکے اپنی تمام تر توجہ اس کے غور و پرداخت اور ترقی پر صرف کرکے آج وہ اقتدار پایا ہے کہ گھر بیٹھے دنیا کی دولت پر حکومت کرتے ہیں اور خلقت پر احسان دھرتے ہیں۔ لکڑی، لوہا، کوئلا، پانی، زمین، سواری اور کارکنوں کی بڑی جماعت سب ہندوستانی، لیکن ریل کے منافع کا مالک انگلستان۔ اور اس پر بھی ہم شادان و فرحان مشکور و ممنون، ریل کی تعریف میں رطب اللسان۔ اور کچھ بیجا بھی نہیں، کیونکہ یہاں اصل ملتا تو معلوم، اگر انگریزی اصل سے بھی ریلیں نہ بنتیں تو جو کچھ تھوڑا بہت آرام اور فائدہ پہنچ رہا ہے، جس کی ہم مناسب موقع پر تشریح کریں گے، ہندوستان اس سے بھی محروم رہتا۔ حاصل کلام یہ ہے کہ اگر ہندوستان کی تجارتی اور صنعتی پسماندگی کی حقیقی وجہ دریافت کیجئے تو وہ نہ زمین کی کمی ہے، نہ محنت کی خامی، بلکہ وہ اصل کی قلت ہے جس نے کاروبار مردہ کر دیا۔

خلاصہ

۶۔ اصل کی احتیاج خود ہندوستان کہاں تک اور کیونکر پوری کر سکتا ہے اور اصل کی قلت کا وہ کس حد تک خود ذمہ دار ہے؟ یہ طولانی بحث یہاں بے محل ہے۔ یہاں حالات بیان کرنے سے یہ اظہار مقصود تھا کہ عمل پیدائش دولت میں ہر سہ عاملین کا کیا کیا حصّہ ہے اور مقابلۃً ہر ایک کا کیا رتبہ ہے۔ معلوم ہوا کہ پیدائش دولت کے واسطے زمین لابدی، محنت شرط لازمی اور اصل سب سے زیادہ کارگر آلہ ہے۔ اور یہی تینوں مل جل کر دنیا میں دولت پیدا کر رہے ہیں۔ اب ہم پانچویں، چھٹے اور ساتویں باب میں علی الترتیب زمین، محنت اور اصل کے حالات سے جداگانہ مفصّل بحث کریں گے۔

حصہ دوم
باب پنجم

باب پنجم

زمین

(۱) زمین کا مفہوم (۲) زمین کے خواص (۳) کاشت کے دو طریق اور ان کے جداگانہ فوائد (۴) زرخیزی کا مفہوم (۵) زرخیزی بڑھانے کے عام وسائل (۶) قانونِ تقلیل حاصل (۷) معاشی ترقیات کا زمین کی قدر و قیمت پر اثر (۸) شہروں کی افزونی کا زمین کی قدر و قیمت پر اثر (۹) شہروں میں پارک کی ضرورت (۱۰) ٹریم کار کا شہر کی آبادی اور زمین کی قدر و قیمت پر اثر (۱۱) اضافۂ قیمت زمین کے حقدار۔

زمین کا مفہوم

۱۔ معاشیات میں لفظ زمین سے عموماً تو یہی زمین مراد ہوتی ہے مگر اصطلاحاً اس میں چند دیگر عاملینِ قدرت مثل پانی، ہوا، گرمی، روشنی کے جو وجہ خلقت اور پیدائش دولت کے واسطے لازمی ہیں شامل کر لیے جاتے ہیں: مثلاً دریا کھیتی باڑی کو شاداب کرتے ہیں، کشتیوں میں مال ڈھوتے ہیں، پن چکیاں چلاتے ہیں، سمندر جہاز رواں کرتے ہیں، آبشار بجلی پیدا کرتے ہیں، ہوا بھی علاوہ شرط زندگی ہونے کے بادبان سے کشتی کھینچتی ہے، پنکھا گھما کر مشینیں چلاتی ہے، ہندوستانی کسان کا غلہ برساتی ہے؛ گرمی اور روشنی کی ضرورت بھی اظہر من الشمس ہے۔ پس ایسی چیزوں کو عاملین پیدائش میں شامل نہ کرنا کس طرح ممکن ہے؛ اور ہر ایک کو جداگانہ شمار کرنا بھی نامناسب طوالت معلوم ہوتی ہے۔ انکو محنت تو کہہ نہیں سکتے کیونکہ وہ انسان کے کام سے مخصوص ہے؛ اصل بھی نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ محنت اور زمین کے اتفاق عمل سے پیدا ہوا ہے، اور انسانکی مرضی کا مطیع ہوتا ہے۔ اور ان چیزوں کو پیدا کرنا تو درکنار قابو میں لانا بھی محال ہے۔ جب آندھی چلتی ہے، طوفان آتا ہے، گرمی پڑتی ہے، تو انسانکو فوراً اپنی بے بسی محسوس ہونے لگتی

ہے، اور کچھ نہیں بن پڑتا۔ البتہ لفظ زمین میں ان کو اصطلاحاً شامل کرنا کچھ نامناسب نہیں معلوم ہوتا کیونکہ اول تو یہ سب زمین سے قریب تر متعلق ہیں اور طریق عمل میں بھی زمین سے بہت کچھ مشابہ ہیں۔ ان سب کے اعمال براہ راست قدرت کے اٹل قوانین کے تابع ہیں اور محنت و اصل کے مانند ان پر انسان کو تصرف حاصل نہیں۔ بعض مصنفین نے زمین کے بجائے لفظ قدرت ان معنوں میں استعمال کیا ہے، اور بلحاظ جامعیت یہ اصطلاح زمین سے بہتر ہے۔ مگر چونکہ ان تمام عاملین قدرت میں سب سے کثیر اور اہم کام زمین کا ہوتا ہے، اور اسی وجہ سے زمین عاملین پیدائش میں جداگانہ شمار کی جاتی ہے، ایک نیا لفظ داخل کرنیکے بجائے زمین ہی میں ان چیزوں کا شمار کرکے اصطلاحی معنی مع وجوہات واضح کر دینا زیادہ قرین اصول معلوم ہوتا ہے۔ اور اب زمین کے مذکورۂ بالا اصطلاحی معنی معاشیات میں بالعموم تسلیم کئے جاسکتے ہیں ؛

زمین کے خواص

۲ — (ا) ہم عاملین پیدائش کے بیان میں بتا چکے ہیں کہ زمین وجود خلقت اور پیدائش دولت کے واسطے لابدی ہے۔ اب یہاں چند اور خواص اور ان کے معاشی اثر واضح کرنا چاہتے ہیں۔

(ب) زمین کی دوسری قابل توجہ خصوصیت تعین مقدار ہے۔ خدا نے جتنا کرۂ ارض بنانا چاہا بنا دیا، کچھ سمندروں سے پوشیدہ کر دیا، کچھ پہاڑوں سے گھیر دیا، کچھ ناقابل آبادی برفستان اور ریگستان بنا دیا، اور باقی ہموار میدانوں میں دریا بہائے بارآور درخت اگائے اور موسم خوشگوار بنائے تاکہ انسان وہاں بود و باش اختیار کر سکے۔ یہ تو ممکن ہے کہ کوئی سمندر ساحل سے ہٹ کر زمین چھوڑ دے، جنگل میں اور پہاڑوں پر آدمی جا بسیں، امریکہ کی طرح اب بھی کسی نامعلوم برّ اعظم کا پتا لگ جائے۔ لیکن یہ سب کچھ اسی ایک زمین کے اجزا کا تغیر و تبدل ہوگا۔ خود زمین کی وسعت میں ایک انچ اضافہ ممکن نہیں۔ عام قاعدہ ہے کہ جس چیز کی مانگ بڑھتی ہے اس کی پیداوار بھی بڑھائی جاتی ہے۔ جب سے روئی ولایت جانے لگی ہندوستان میں اس کی کاشت بہت وسیع ہوگئی اور مصر میں بھی یہی حال

ہے۔ جب سے افیون چین میں جانا شروع ہوئی، اس کی کاشت بھی بہت رواج پا گئی۔ یہی حال مصنوعات کا ہے: گھڑیاں، بائیسکل، اسٹیل ٹرنک، گلی گلی مارے مارے پھرتے ہیں۔ مگر زمین کا معاملہ بالکل برعکس ہے۔ اس کی ضرورت اوّل تو لابدی، دوسرے بوجہ ترقی آبادی روز افزوں اور اس پر لطف یہ کہ مقدار معیّن، اس کا اضافہ ناممکن۔ نتیجہ ظاہر کہ زمین روز بروز نایاب اور بیش قیمت ہوتی جاتی ہے ؛

(ج) زمین کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ غیر منقولہ ہے۔ عام قاعدہ ہے کہ جہاں مانگ زیادہ ہوتی ہے اور قیمت اچھی اٹھتی ہے، وہیں چیز لیجا کر فروخت کرتے ہیں چنانچہ تمام تجارتِ داخلہ اور خارجہ اسی اصول کی تشریح ہے۔ اگر یہ اصول نہ ہوتا تو جو چیز جہاں پیدا ہوتی بس وہیں بکتی۔ حلقۂ تجارت ہر ایک بستی تک محدود ہوتا حالانکہ آج کل گوشت، پھل اور ترکاریاں اور ایسی ہی جلد خراب ہو جانے والی چیزیں بھی ہزارہا میل جا کر فروخت ہوتی ہیں۔ انگلستان کے لیے گوشت اور مچھلی زیادہ تر آسٹریلیا مہیا کرتا ہے۔ صدہا من پھل اور میوے مثل آم و سیب ہندوستان سے جاتے ہیں اور دیرپا چیزیں مثل غلے اور معدنیات کی دوررسی کا تو ذکر کیا ہے۔ لیکن زمین اٹل ہے۔ گاؤں والے زیادہ قیمت کی ہوس میں غلہ اور ترکاریاں تو شہر لا کر بیچتے ہیں، اگر ممکن ہوتا تو صدہا بیگھے ناکارہ بنجر زمین اٹھا کر شہر لے آتے اور بےشمار دولت رولتے۔ گاؤں میں زمین کی کمی نہیں اور گنجان شہروں میں بیحد نایاب ہوتی ہے۔ لیکن جو قطعۂ زمین جہاں ہے اپنی جگہ سے ہٹ نہیں سکتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب تک قصبات میں عموماً زمین روپیہ آٹھ آنہ گز ملتی ہے اور ہندوستان ہی کے بعض شہروں میں ہزار روپے گز تک فروخت ہو چکی ہے۔ ایک دو آنے روپے کے منافع پر ہندوستان کا غلہ اور روئی ولایت پہنچتی ہے۔ لیکن صدہا روپے گز کے منافع پر قرب و جوار سے زمین نہیں لائی جا سکتی۔ تیسری خصوصیت عدم منقولیت بھی زمین کی قدر و قیمت بڑھاتی ہے ؛

(د) زمین کی چوتھی خصوصیت تعیین پیداوار ہے۔ سکونت سے کہیں زیادہ زمین پیدائش ضروریات مثلاً خوراک و لباس کے واسطے درکار ہے۔

غلہ، پھل اور ترکاریاں جو انسان و حیوان کی غذا ہیں زمین سے پیدا ہوتی ہیں؛ ایندھن اور عمارت کی لکڑی اس سے اگتی ہے؛ لباس کی اکثر اشیا زمین سے ملتی ہیں؛ اور لطف یہ کہ زمین کی قوت پیدائش محدود رکھی گئی ہے۔ ایک قطعۂ زمین مقدار معین سے زیادہ غلہ یا ترکاری پیدا نہیں کر سکتا ہر ایک کسان اس کی تصدیق کرے گا۔ قانون تقلیل حاصل کے تحت میں اس خصوصیت کی مزید تشریح کریں گے لیکن اس کا اثر زمین کی قدر و قیمت پر جو پڑتا ہے ظاہر ہے۔

(۴) زمین کی پانچویں خصوصیت، پابندی وقت ہے۔ زمین کے عمل پیدائش پر وقت کی پابندی بھی لازم کی گئی ہے کہ ہر چیز اپنی ہی فصل و موسم میں پیدا ہو سکے؛ مثلاً جوار، باجرا، اور مکا فصل خریف میں؛ گیہوں جو اور چنا فصل ربیع میں؛ اس کے خلاف ممکن نہیں۔ علاوہ اس کے ہر چیز کی پیدائش کے واسطے جتنا وقت درکار ہے وہ بھی معین ہے؛ اس میں کمی بیشی کی گنجائش نہیں فصل خریف دو مہینے میں تیار ہوتی ہے، ربیع چھ مہینے میں نیشکر، تمباکو، آلو اور کپاس تو نو مہینے میں۔ انسان وقت بے وقت محنت کر کے اصل سے شب و روز کام لے کر پیداوار بڑھا سکتا ہے، مگر زمین پر اس کا کچھ بس نہیں چلتا؛ وہ تو قدرت کے تعین اوقات کی پابند ہے۔ اگر سائنس کے جدید انکشافات سے پیدائش زمین کے اوقات میں کچھ رد و بدل ہوتا بھی ہے تو اتنا قلیل کہ قابل لحاظ نہیں ہو سکتا۔

(۵) مذکورۂ بالا ایک سے ایک سخت پابندیوں کے علاوہ جیسا کہ ہم اوپر بتا چکے ہیں خود عمل پیدائش میں انسان کا حصہ نقل مقام و تبدل ترکیب پر ختم ہو جاتا ہے۔ کھیت جوتنا کسان کا کام ہے لیکن کھیت کو نشو و نما دینا عالمین قدرت کے ہاتھ ہے؛ کسان لاچار محض ہے۔ پس بلحاظ عمل پیدائش بھی زمین انسان کے تصرف سے بہت کچھ آزاد ہے، حالانکہ اس کی پیداوار سب سے زیادہ ضروری ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ زمین پر قدرت نے عجیب و غریب پابندیاں

حصہ دوم
باب پنجم

لازم کرکے انسان کے اختیار اور قابو سے اس کو بالکل باہر کردیا ہے۔ اوّل تو اس کو لابدی قرار دیا پھر اس کی ضرورت روز افزوں بنا کر اس کی مقدار محدود کردی، اس کو غیر منقولہ بنایا، اس کی قوت پیدائش کو محدود کیا، اس پر پابندی وقت کی سخت قید لگائی، اور عمل پیدائش کا بیشتر حصہ عاملین قدرت کے تصرف میں دے کر انسان کو بے بس اور ناچار کردیا۔ ان خصوصیات کی اصلی مصلحت تو خدا جانے، لیکن ایک بیّن نتیجہ جو ان سے پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ زمین کی قدروقیمت دن دونی رات چوگنی ہوتی چلی جاتی ہے اور علم معاشیات میں ایک اہم ترین حل طلب مسئلہ یہ پیش ہورہا ہے کہ اس اضافۂ قیمت کا حقدار کون ہے، مالک زمین یا گورنمنٹ؟ اور اگر دونوں، تو کس اصول کے مطابق، کس نسبت سے، یہ اضافہ ان میں تقسیم ہونا چاہیئے؟ اضافۂ قیمت زمین کا مسئلہ بہت غور طلب ہے اور اس سے جزءً جزءً حسب موقع بحث کرنا زیادہ موزوں ہوگا ؛

کاشت کے دو طریقے اور انکے جداگانہ فوائد۔

۳- یوں تو زمین سکونت اور کان کنی کے کام بھی آتی ہے، لیکن اسکا سب سے بڑا حصہ زراعت کے کام میں آتا ہے۔ کاشت کی دو قسمیں ہیں: کاشت عمیق و کاشت وسیع۔ اگر کوئی ایک قطعۂ زمین خوب جوتے، بہت سی کھاد ڈالے، جتنا تخم بویا جاسکے بوئے، اچھی طرح پانی دے، اور کافی محنت داصل اس پر صرف کرکے بیشترین مقدار پیداوار حاصل کرے تو اس کو کاشت عمیق کہتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر کھیت کو کچھ یوں ہی جوت کر اور تھوڑی سی کھاد ڈال کر کمترین مصارف سے کچھ پیداوار حاصل کرے تو اس کو کاشت وسیع کہتے ہیں۔ کاشت عمیق میں نسبت مصارف تو زیادہ موافق نہیں ہوتی مگر مقدار پیداوار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ اور کاشت وسیع میں اس کے برعکس مقدار پیداوار کم ہوتی ہے مگر نسبت مصارف بہت موافق ہوتی ہے: مثلاً اگر دس بیگے زمین سے بصرف تین روپے من پچاس من غلّہ پیدا ہو، اور پندرہ بیگے زمین سے بصرف دو روپے من، کل تیس من پیدا ہو تو پہلی کاشت عمیق اور دوسری وسیع کہلائیگی ؛

یہاں یہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ جب پیداوار زمین کی زیادہ مانگ ہو اور قیمت اچھی اٹھتی ہو تو کاشت عمیق سے زیادہ منافع حاصل ہوتا ہے۔

اور دوسری صورت میں کاشت وسیع زیادہ مفید ثابت ہوتی ہے۔ مثلاً اگر انھی کھیتوں کی پیداوار پانچ روپے من کے نرخ سے فروخت ہو تو پہلے کھیت سے بحساب دو روپے من کل سو روپے منافع ہوگا اور دوسرے کھیت سے بحساب تین روپے من صرف نوے روپے؛ لیکن اگر قیمت گھٹ کر صرف چار روپے من رہ جائے تو منافع حسب ترتیب پچاس روپے اور ساٹھ روپے ہوگا؛ اور قیمت بہت ہی گر جائے؛ مثلاً ڈھائی روپے من، تو حسب ترتیب پچیس روپے گھاٹا اور پندرہ روپے منافع ہوگا۔ غرضکہ زیادتی قیمت کاشت عمیق کی معاون ہے اور کمی قیمت کاشت وسیع کی۔ ان دونوں نتائج کو جداگانہ حسب ترتیب قیمت کے اثر موافق و اثر مخالف سے تعبیر کریں گے اور دونوں کا مشترکہ نام صرف اثر قیمت ہوگا۔ چنانچہ ناخواندہ کسان بھی تجربے کی مدد سے اسی اصول پر کاربند ہوتا ہے۔ شہر و قصبات کے گرد و نواح میں عموماً کاشت عمیق ہوتی ہے اور دور افتادہ گاؤں میں کاشت وسیع۔ طریق عمل اس اثر کا یہ ہے کہ اگر ہر دو قسم کی کاشت کے اوسط مصارف میں فرق کم ہوگا: مثلاً تین روپے اور دو روپے من؛ اور اوسط پیداوار میں فرق زیادہ ہوگا: مثلاً پانچ من اور دو من بیگے؛ تو اثر موافق بہت قوی ظاہر ہوگا۔ اس کے برعکس اگر اوسط مصارف میں فرق زیادہ ہو: مثلاً چار روپے اور دو روپے من؛ اور اوسط پیداوار میں کم: مثلاً پانچ من اور تین من بیگے؛ تو اثر موافق ضعیف ہوگا؛ یا اثر مخالف حسب حالت ضعیف یا قوی نمودار ہوگا۔ کسی مقام میں دونوں قسم کی کاشت کے اعداد مصارف و پیداوار دریافت ہونے پر یہ بتایا جاسکتا ہے کہ کونسی کاشت کس حد تک مفید تر ہوگی؛

علاوہ اثر قیمت کے طریق کاشت ایک اور قوی اثر کے بھی تابع ہے۔ ہر ایک کسان کو پیداوار کا کچھ حصّہ زمیندار یا سرکار کو دینا پڑتا ہے۔ ایسے لگان کی تین شکلیں ہو سکتی ہیں۔ خواہ وہ بشرح منافع ہو، یا بشرح پیداوار کلی، یا بشرح رقبہ زمین: مثلاً پچاس فیصدی منافع یا ۲۰ فیصدی پیداوار یا دو روپے بیگہ۔ مذکورہ بالا دو کھیتوں کی مثال پر غور کرنے سے واضح ہوگا کہ شرح منافع کا کوئی اثر، اثر قیمت کے عملدرآمد پر

حصۂ دوم
باب پنجم

نہیں پڑے گا۔ بشرح ۵۰ فی صدی مثال بالا میں لگان ادا کرنے کے بعد منافع ۵۰ اور ۴۵ روپے حسب ترتیب رہ جائے گا۔ گویا حسب سابق کاشت عمیق ہی زیادہ نافع ہوگی اور اسی طرح بحالت کمی قیمت لگان ادا کرنے کے بعد بھی کاشت وسیع مفید رہیگی۔ لیکن لگان بشرح پیداوار کے اثر کا عملدرآمد ذرا پیچیدہ ہے۔ یہ اثر قیمت کے اثرِ موافق کے مخالف اور قیمت کے اثر مخالف کے موافق کام کرتا ہے۔ گویا کاشت عمیق کا منافی اور کاشت وسیع کا معاون ہے۔ اگر لگان بشرح پیداوار کا اثر قیمت کے اثر مخالف سے ملادیا جائے تو دونوں یکساں اثر مل کر بہت قوی ہوجاتے ہیں۔ لیکن اگر قیمت کے اثر موافق سے مقابلہ آپڑے تو جو اثر قوی تر اور غالب ہوگا کاشت کا طریقہ اس کے مطابق ہوگا۔ لگان بشرح رقبہ کا اثر بھی بعینہ لگان بشرح پیداوار کا سا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ کاشت کے دو طریق ہیں، اور قیمت پیداوار و لگان کے مختلف اثروں کے تابع ہیں۔ قانون تقلیل حاصل اور لگان کی بحث میں واضح ہوگا کہ منافع زراعت کو ماحصل زائد کہتے ہیں۔

زرخیزی کا مفہوم

۴۔ زرخیزی زمین کی کوئی خاص صفت نہیں، بلکہ اس سے زمین کی کئی حالتیں مراد ہوسکتی ہیں۔ اوّل تو زرخیزی طریق کاشت سے متعلق ہے، کاشت عمیق میں وہ زمین زرخیز کہلاتی ہے جو بلالحاظ نسبت مصارف بڑی مقدار پیدا کرے: مثلاً کسی کھیت میں ۴ یا ۵ من بیگے غلہ پیدا ہو، صرف مصارف پیدائش، خواہ زیادہ: مثلاً ۴ یا ۵ روپے من تک ہوں۔ اس کے برعکس کاشت وسیع میں زرخیز زمین سے مراد یہ ہے کہ بلالحاظ مقدار پیداوار مصارف کا اوسط کمتر ہو، مثلاً کسی کھیت میں صرف دو یا تین روپے من کے صرف سے غلہ پیدا ہو، اوسط پیداوار خواہ ایک یا دو من فی بیگہ ہو۔ تجربے سے معلوم ہوا کہ بعض زمینیں تو ان میں سے صرف کسی ایک طریق کاشت میں زرخیز ثابت ہوتی ہیں اور بعض دونوں حالتوں میں۔ زمین کی زرخیزی فصل سے بھی متعلق ہوتی ہے۔ بعض زمینیں نیشکر کی کاشت کے واسطے خاص طور پر موزوں ہوتی ہیں اور بعض تمباکو، کپاس، سن یا ایسی ہی کسی خاص چیز کیواسطے۔ اگر فصل مناسب کے علاوہ کوئی چیز کاشت کی جائے گی تو نتیجہ حسب دلخواہ نہ ہوگا گویا ایک ہی قطعۂ زمین بعض فصل کے لحاظ سے زرخیز ہے اور بعض کے لحاظ

سے نہیں۔ پنجاب میں گیہوں عمدہ پیدا ہوتا ہے، برار کی روئی نرم اور لمبے ریشے کی ‌ باب پنجم
ہوتی ہے، مشرقی بنگال کا سن جو جوٹ کہلاتا ہے، تمام دنیا میں مشہور ہے۔ اسی طرح
پھل مثلاً آم، انار، سیب، ناشپاتی وغیرہ کے واسطے بھی خاص خاص مقام مشہور
ہیں کبھی بلالحاظِ مقدارِ پیداوار یا اوسطِ مصارف، یا موزونی فصل، محض پیداوار کی
قیمت بہت بڑھ جانے سے زمین زرخیز شمار ہونے لگتی ہے۔ پس معلوم ہوا کہ زرخیزی
صفت اضافی ہے اور وہ کبھی طریق کاشت کبھی نوعیت فصل اور کبھی اضافہ قیمت
سے متعلق ہوتی ہے۔

زرخیزی بڑھانے کے عام وسائل

۵۔ زرخیزی کی نوعیت سمجھانے کے بعد اب ہم مختصراً وہ وسائل بتانا چاہتے ہیں جو زرخیزی پیدا کرنے اور بڑھانے کے واسطے عموماً اختیار کئے جاتے ہیں اور تجربے سے مفید ثابت ہوئے ہیں۔

عمدہ زمین کی ایک خاص صفت یہ ہے کہ وہ نہ اتنی سخت ہو کہ نازک پودے جڑ نہ پکڑ سکیں اور پانی جذب ہونے کے بجائے سطح پر بہتا ہوا گزر جائے اور نہ اتنی نرم اور بے دم ہو کہ جڑ مضبوط نہ جمے، پودے گر گر پڑیں اور پانی اندر کے سب رس رس کے نکلجائے؛ بلکہ وہ اتنی تو نرم ہو کہ نازک جڑیں اس میں جگہ کر سکیں مگر اتنی سخت بھی ہو کہ جڑوں کی گرفت اس قدر مضبوط ہو کہ وہ پودے سنبھال سکیں۔ پانی جو زمین سے پودے کو غذا پہنچاتا ہے کھیت میں بآسانی پھیل سکے لیکن پودے کی غذا بہاکر باہر نہ لیجا سکے ورنہ یا تو پودے نہیں جمیں گے یا بعدہٗ خشک ہو کر رہ جائیں گے۔ کھیت جوتنے کا اصلی مقصد یہی صفت پیدا کرنا ہوتا ہے کہ سخت سطح اور ڈھیلے ٹوٹ کر حسب ضرورت نرم ہو جائیں۔ ریتلی زمینیں بھی نئی مٹی ہل کے ذریعے سے ملا کر سخت کی جاتی ہیں۔

زمین کی دوسری ضروری صفت یہ ہے کہ اس میں وہ تمام اجزا جو پودے کی غذا ہیں پوری مقدار میں موجود ہوں۔ ظاہر ہے کہ اگر ایسے اجزا کی مقدار کم ہوگی یا ایک جزو بھی غائب ہوگا تو پودوں کی نشو ونما پر مضر اثر پڑے گا اور پیداوار علاوہ مقدار میں کم ہونے کے ادنیٰ قسم کی ہوگی۔ کھاد کے ذریعے سے زمین میں پودوں کی غذا بڑھائی جاتی ہے۔ ہندوستان میں تو نادان کسان تھوڑے بہت تجربے کے بھروسے پر جیسی کھاد میسر آتی ہے کوڑی سے اٹھا کر کھیت میں ڈال دیتا ہے۔ مگر یورپ والوں نے اس میں بھی بہت

تحقیق سے کام لیا ہے: اول ہر قسم کے پودوں کی غذا کے اجزا دریافت کیے مثلاً آلو کے پودے کی نشو و نما کن کن چیزوں سے ہوتی ہے اور یہ شئے کن کن مقداروں میں درکار ہیں؟ غرضکہ بہت سے مروجہ پودوں کی خوراک کے اجزاء اور ان کی ترکیب سائنس اور مشاہدات کی مدد سے دریافت کر لی گئی ہے۔ اور کیمیائی طریق سے یہ بھی معلوم ہو سکتا ہے کہ زمین میں کیا کیا اجزا کس مقدار میں موجود ہیں۔ چنانچہ جرمنی وغیرہ کے مثل ترقی یافتہ ممالک میں کسان اپنے کھیت کی تھوڑی سی مٹی کسی کھاد کے کارخانے میں بھیج دیتا ہے اور جو چیز بونی مقصود ہوتی ہے اس سے اطلاع دیتا ہے۔ کارخانے میں زمین کے موجودہ اجزاء اور پودے کی غذا کو پیش نظر رکھ کر کوئی مناسب کھاد اسی طرح تجویز کی جاتی ہے جیسے ہمارے ہاں مریض یا کمزور کے واسطے ڈاکٹر دوا یا غذا تجویز کرتے ہیں۔ کارخانے میں ہر قسم کی کھاد بھی تیار ہوتی ہے اور فرمائش آنے پر باحتیاط بکسوں میں بند کر کے روانہ کر دی جاتی ہے۔ چنانچہ دوا سازی کے ساتھ کھاد سازی بھی یورپ میں ایک فن ہو گیا ہے، اور اس کے باقاعدہ کارخانے قائم ہیں۔ کبھی کبھی دو مختلف الخواص مٹیوں کے ملانے سے بھی کھاد کا نتیجہ حاصل ہوتا ہے مثلاً اگر دو زمینوں میں سے ہر ایک میں انھی اجزاء کی بہت کثرت ہو جن کی دوسری میں قلت ہے تو ان کی مٹی ملانے سے زمین زرخیز بن جائیگی۔ چنانچہ چونا، کھریا، چکنی مٹی، کوئلے کا چورا زمین میں ملانے سے اکثر زرخیزی پیدا ہو جاتی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ آئندہ مختلف الخواص مٹی ملانے کا طریقہ کھاد سے بھی زیادہ مروّج ہوگا۔

معلوم ہوا کہ انسان زمین کی زرخیزی بڑھا کر اور نیز نگہداشت کر کے نباتات کو بیش بہا مدد پہنچا سکتا ہے، لیکن اس کے مدارج مختلف ہیں۔ نازک بیل اور پودے بحالت کس مپرسی اپنا وجود بھی بمشکل قائم رکھ سکتے ہیں۔ مگر انسانی امداد سے حیرت انگیز ترقی کر دکھاتے ہیں۔ چنانچہ نباتاتی باغات اور نمائش گاہوں میں اتنے خوش رنگ، لذیذ اور بڑے بڑے پھل پھول اور ترکاریاں دیکھنے میں آتی ہیں کہ ان کی شناخت میں دھوکا ہوتا ہے۔ غلّے، ایکھ، کپاس اور دوسری مزروعہ چیزوں کے پودے بھی انسانی مدد کے خواستگار ہیں۔ یہ چیزیں خودرو بھی پائی گئی ہیں مگر اس قدر ادنیٰ قسم کی کہ ان کو اپنے مزروعہ ہمجنسوں سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ مستقل چراگاہیں بھی بقدر

باب پنجم
نگہداشت انسانی توجہ کی مستحق ہیں، مگر جنگلات کے درخت انسانی امداد سے بالکل مستغنی ہیں۔ وہاں بقائے اصلح کا قانون جاری ہے اور ہر ایک درخت اور پودا اپنا خود نگہبان ہے۔ اور اگر انسان چاہے بھی تو بھلا جنگل کے ان بلند اور گنجان درختوں کے نشوونما میں کیا قابلِ لحاظ اضافہ کر سکتا ہے، جن کی زوردار جڑیں پتھر چیر کر پانی کے سوت سے طراوت اور ارد گرد کی صدہا گز وسیع زمین سے خوراک وصول کرتی ہیں۔

قانون تقلیل حاصل
۶۔ زراعت کے متعلق زمین کی ایک عجیب خاصیت تجربے سے معلوم ہوئی ہے جس کا نام قانون تقلیل حاصل ہے۔ یہ قانون ترقی زراعت پر ایک لازمی حد قائم کرتا ہے، اور مسئلہ لگان کے اصول بھی اسی قانون سے اخذ کیے گئے ہیں؛ لہٰذا اس کی ضروری تشریح یہاں برمحل معلوم ہوتی ہے۔ یہ بتایا جا چکا ہے کہ قدرت نے ہر زمین کی قوتِ پیدائش معین اور محدود کر دی ہے؛ فنِ زراعت کے اصول کے مطابق جوت کر، کھاد ڈال کر، ہم زمین کی قوتِ پیدائش میں اضافہ ضرور کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں، مگر اس کی بھی ایک حد ہے۔ یہ تو ہو سکتا ہے کہ زمین کی پیداوار ہم ڈیوڑھی دوگنی یا سہ گنی کر لیں، مگر اس کو دس بیس یا پچاس گنی حسبِ دلخواہ بڑھانا ممکن نہیں۔ اگر ممکن ہوتا تو ہر ایک کسان چھوٹا سا کھیت لے کر جتنی چاہے پیداوار حاصل کر لیا کرتا، اس کو بڑے بڑے کھیت جوتنے بونے اور ان کی نگہداشت کرنے کی زحمت اٹھانی نہ پڑتی؛ اور نہ پھر زراعت کے واسطے زمین کی اس قدر مانگ ہوتی۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ جو قطعات صدہا برس سے کس مپرسی کی حالت میں ویران پڑے ہوئے تھے، رفتہ رفتہ زیر کاشت آ رہے ہیں۔ اگر زمین کی قوتِ پیدائش لامحدود ہوتی تو موجودہ کھیت کافی ہوتے اور غیر مزروعہ زمینوں پر کاشت پھیلانے کی ضرورت کیا تھی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہر ایک زمین خواہ کیسی زرخیز کیوں نہ ہو اور خواہ فن زراعت کا سارا کمال اس پر صرف کر دیا جائے، صرف ایک خاص حد تک کاشت کی متحمل ہو سکتی ہے؛ اگر اس حد سے تجاوز کر کے اضافۂ پیداوار کی ہوس میں زیادہ محنت اور حاصل صرف کیا جائے تو یقیناً وہ سب اکارت جائے گا۔ اگر کسی کسان سے سوال کیا جائے کہ وہ اپنے کھیت کو دو مرتبہ جوتنے، چار مرتبہ نرانے، دس مرتبہ پانی دینے، اور ایک من تخم بونے کے بجائے، بیس مرتبہ جوت کر، چالیس مرتبہ نرا کر، سو مرتبہ پانی دے کر،

اور دس من بیج بو کر، دس گنی پیداوار حاصل کیوں نہیں کرتا تو وہ صاف جواب دیگا کہ زمین میں اتنی پیداوار کی گنجائش نہیں۔ ایسا کرنے سے ساری لاگت خاک میں ملجائیگی؛ جو پیدا ہوتا وہ بھی نہ ہوسکیگا؛ دس گنی پیداوار کے واسطے ایسے ایسے دس کھیتوں کی ضرورت ہے ۔

یہ تو بخوبی ذہن نشین ہو گیا کہ زمین کی قوتِ پیدائش محدود ہے، اب اس خاصیت کے عمل سنئے! بغرض سہولتِ بیان ہم کھیت کو جوتنے، بونے، نرانے، اور پانی لگانے کو جداگانہ **جرعوں** سے تعبیر کریں گے اور ہر جرعے کی لاگت دس روپے قرار دیں گے۔ اگر کھیت ایک مرتبہ جوتا گیا تو گویا ایک جرعہ صرف ہوا: اسی طرح بونے، نرانے وغیرہ کے متعلق ہر فعل ایک جرعہ کہلائیگا۔ فرض کرو کہ کسی مناسب ترکیب سے کسان نے ایک کھیت پر دس جرعے صرف کئے، یا بالفاظ دیگر سو روپے لاگت لگائی اور تیس من غلہ پیدا ہوا، تو اوسط ۳ من فی جرعہ پڑا۔ تجربتہً اسی کھیت پر بارہ جرعے صرف کئے اور پیداوار ۳۷ من ہو گئی: گویا دو جدید جرعوں کا ماحصل ۳ ½ من فی جرعہ ہوا۔ اضافے کی امید پر سہ بارہ پندرہ جرعے صرف کئے اور پیداوار پچاس من ہوئی؛ آخری تین جرعوں کا اوسط ۴ ⅓ من فی جرعہ پڑا۔ اب تو کسان کو چسکا لگ گیا اور چوتھی مرتبہ اس نے سولہ جرعے صرف کئے۔ مگر قدرت نے فوراً ہاتھ کھینچ لیا اور اس مرتبہ پیداوار صرف ۵۲ من ہوئی یعنی سولھویں جرعے کا ماحصل صرف دو من ہوا معلوم ہوا کہ پندرھویں جرعے پر قوتِ پیدائش کمال پر پہنچ گئی، اور سولھویں جرعے سے انحطاط شروع ہوا۔ بس اصطلاحاً کہیں گے کہ پندرھویں جرعے تک، تو قانون تکثیر حاصل جاری رہا مگر سولھویں جرعے سے **قانون تقلیل حاصل** کا عمل شروع ہوا۔ زراعت میں قانون تکثیر حاصل کچھ زیادہ قابل توجہ اس وجہ سے نہیں کہ اس کا اثر کمتر ظہور میں آتا ہے اور محض عارضی ہوتا ہے۔ البتہ مصنوعات میں اس کا اثر بہت اہم ہوتا ہے اور مناسب جگہ پر ہم اس کی تشریح کریں گے۔ یہاں ہم کو صرف قانون تقلیل حاصل سے بحث کرنی مقصود ہے کیونکہ اس کا اثر زراعت پر ہر حالت میں یقینی اور دائمی ہوتا ہے اور اس کا مسئلہ لگان اور قیمت زمین سے بہت قریبی تعلق ہے ۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قانون تقلیل حاصل جاری ہونے کے بعد بھی کسان

جرعوں میں اضافہ کرے گا یا نہیں اور اگر کرے گا تو کہاں تک ؟ اس کا جواب قیمت پیداوار پر منحصر ہے۔ عام اصول یہ ہے کہ خواہ قانون تقلیل حاصل جاری ہو یا نہو کسان اپنے جرعوں میں اس وقت تک برابر اضافہ کئے جائے گا جب تک کہ ہر جدید جرعے کی پیداوار کی قیمت جرعے کی لاگت سے زیادہ ہو حتیٰ کہ کسی جدید جرعے کی پیداوار کی قیمت اس کی لاگت کے برابر آپہنچے تو کسان اضافہ فوراً بند کر دیگا اور یہ آخری جرعہ اصطلاحاً جرعۂ مختتم اور اس کی پیداوار حاصل مختتم کہلائے گی۔ کاشت کی اس حالت کو اتمام کاشت سے تعبیر کرتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ جرعۂ مختتم کسی خاص حد پر قائم نہیں ہوتا بلکہ پیداوار کی قیمت بڑھنے گھٹنے پر حسب ترتیب یہ بھی آگے بڑھتا اور پیچھے ہٹتا رہتا ہے۔ اضافۂ قیمت کے زور پر کبھی قانونِ تقلیل حاصل کی حد سے بہت آگے بڑھ جاتا ہے اور کمیٔ قیمت کے باعث کبھی اس کی حد سے پیچھے چلا جاتا ہے۔ چنانچہ ترقی یافتہ اور آباد ممالک میں اس قانون کا اثر بہت قوی اور وسیع پایا جاتا ہے اور پسماندہ غیر آباد ممالک میں اس کے عمل کی نوبت تک نہیں آتی۔ آخر میں ہم پھر یہ جتا نا ضروری سمجھتے ہیں کہ قانونِ تقلیل حاصل کا تعلق مقدارِ پیداوار سے ہے نہ کہ قیمت پیداوار سے۔ جب کسی جرعے کی پیداوار اپنے ماسبق جرعے کی پیداوار سے مقدار میں گھٹ گئی تو قانون کا عمل شروع ہوا قیمتِ پیداوار سے قانون کو کچھ سروکار نہیں، البتہ جرعۂ مختتم تمام و کمال قیمت کے تابع ہوتا ہے۔ قیمت کی بیشی و کمی کے بموجب جرعۂ مختتم ربڑ کی طرح کبھی کھینچ کر قانونِ تقلیل حاصل کی حد سے دور چلا جاتا ہے اور کبھی سکڑ کر اس کے قریب آجاتا ہے۔ غرض کہ قیمت کے اثر سے اس کا مقام بدلتا رہتا ہے ؛

چونکہ جرعۂ مختتم کی لاگت حاصل مختتم کے برابر ہوتی ہے، لہٰذا کسی کھیت میں جتنے جرعے صرف ہوں اتنی مرتبہ حاصل مختتم پیداوارِ کلی سے منہا کرنے کے بعد جو کچھ باقی رہے گا وہ ماحصل زائد کہلائے گا۔ یہ کبھی کسان کا خالص حصہ ہوتا ہے اور کبھی زمیندار و کاشتکار میں باہم تقسیم ہوجاتا ہے؛ گورنمنٹ بھی اس کی مستقل شریک بن گئی ہے۔ اگر کسی کھیت میں دس جرعے صرف ہوں اور پیداوار مقدارِ کلی بارہ من ہے اور حاصل مختتم کی مقدار ایک من تو گویا دس من مصارف کاشت ہوئے اور باقی دو من ماحصل زائد کہلائیں گے۔ اور یہی ماحصل زائد بہ تمہات خاص

معاشی ترقیات کا زمین کی قدر و قیمت پر اثر

جن کی تشریح مناسب موقع پر کی جائیگی معاشی لگان کہلاتا ہے ؛

۷- ہر شخص جانتا ہے کہ زمین کی قیمت روز بروز بڑھ رہی ہے، آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ مستقل اسباب تو خواص زمین کے تحت میں واضح ہو چکے؛ چند اسباب جو ترقیاتِ جدید کا نتیجہ ہیں بیان کئے جاتے ہیں۔ جو قطعات شہر اور قصبات سے بہت دور واقع تھے اور بوجہ فاصلہ و قلتِ ذرائع آمد و رفت انکی پیداوار منڈی تک لانا نہایت دشوار اور خرچ طلب تھا، وہ بیکار پڑے ہوئے تھے؛ نہ کوئی ان پر کھیتی باڑی کرتا تھا نہ ان کی کچھ قیمت اٹھ سکتی تھی کس مپرسی کی حالت میں لاوارث پڑے ہوئے تھے۔ مگر جب سے ہندوستان میں ریل کے قدم آئے اور اس کا جال تمام ملک پر پھیل گیا، دور افتادہ زمینوں کے دن پھرے اور جس ویران میدان میں اس کا گزر ہوا بشرط صلاحیت وہ تختۂ عدن بن گیا، از کار رفتہ زمینوں سے دولت اُبل پڑی ؛

اب تک کھیتوں کی آبپاشی کا دار و مدار بارش یا کنوئیں کے پانی پر تھا۔ بمقابلہ چاہی زمینوں کے بارانی کی قیمت بہت کم تھی، بارش کا کیا بھروسا ہو نہ ہو! لہٰذا ایسی زمینوں کی پیداوار بھی اتفاقی تھی۔ لیکن جب سے شمالی ہندوستان میں بڑے بڑے دریاؤں سے نہریں نکال کر اور دکن کے پہاڑوں میں گھرے ہوئے میلوں وسیع قدیم تالابوں سے کام لے کر، تمام ملک پر پانی کے نالوں کا جال پورا گیا، آبپاشی بہت کچھ بارش اور کنوؤں سے مستغنی ہو گئی ہے۔ اور جہاں چھوٹی سی نالی بھی گزر گئی ہے، غیر چاہی زمینوں کی قیمت چاہی سے بھی بڑھ گئی ہے۔ غرضکہ ریلوں اور نہروں کی بدولت ملک کا بہت سا ناکارہ حصہ قابل کاشت بن کر بہت کچھ قیمتی ہو گیا ؛

جنگلات کی پیداوار سے بھی روز افزوں منافع حاصل ہو رہا ہے اور اُمید کی جاتی ہے کہ کچھ عرصے میں جنگلات گورنمنٹ ہند کا نہایت مستقل اور کثیر آمدنی کا ذریعہ بن جائیں گے۔ علم معدنیات کی ترقی کے ساتھ ساتھ کان کنی کا حلقہ بھی وسیع ہو رہا ہے؛ میسور اور حیدرآباد میں سونا نکلتا ہے، لوہا اور کوئلا بنگال کے اکثر حصوں میں بکثرت پایا جاتا ہے، مٹی کے تیل کے ذخیرے بھی برما میں دریافت ہوئے ہیں، اور امید کیجاتی

ہے کہ جستجو کرنے پر ہندوستان میں بہت سی نامعلوم معدنیات سے بیشمار منافع حاصل ہوگا۔ غرضکہ مزروعہ زمین، جنگلات و معدنیات سب روز بروز بیش بہا ہو رہی ہیں۔ سکنی زمینوں سے ہم شہروں کے تحت میں جداگانہ بحث کریں گے ؛

باب پنجم

شہروں کی افزونی کا زمین کی قدر و قیمت پر اثر

۸۔ کسی زمانہ میں زیادہ تر لوگ دیہات اور چھوٹے چھوٹے قصبات میں رہتے تھے، ذرائع آمد و رفت کم اور وقت طلب تھے۔ بالعموم لوگ اپنے وطن یا اسکے گرد و نواح میں عمر بسر کر دیتے تھے، جہاں بادشاہ، امرا، اور حکام کا قیام رہا وہاں البتہ شہر آباد ہو گئے۔ لیکن جب سے ایجادات جدیدنے فیکٹریوں، ملوں عظیم الشان کارخانوں کی بنا ڈالی اور ریل نے آمد و رفت کو ایک کھیل بنا دیا، ڈاک اور تار نے ناواقفیت کا پردہ اٹھا دیا، تب سے بڑی بڑی تجارت گاہوں اور صنعت و حرفت کے مرکزوں کی بنیاد قائم ہوئی۔ چنانچہ یورپ اور امریکہ کے بڑے بڑے شہروں کے بانی اکثر معاشی اسباب بنے۔ لندن برطانیہ عظمی کا دارالسلطنت سہی، لیکن اس کی عظمت کے حقیقی اسباب اس کے معاشی خصوصیات میں مضمر ہیں۔ خود ہندوستان کے نامور شہر کلکتہ، بمبئی، مدراس، ناگپور، دہلی، لاہور، تجارت اور صنعت و حرفت کی وجہ سے اس قدر رونق دار اور آباد ہیں، ورنہ محض بحیثیت دارالسلطنت ان کو موجودہ عروج ہرگز میسر نہ ہوتا۔ آبادی اب اس قدر کثیر اور نقل پذیر ہوگئی ہے کہ دنیا کا شاید ہی کوئی مہذب ملک ہوگا جہاں کے کم از کم دو چار باشندے بڑے شہروں میں مصروف کاروبار نہ پائے جائیں۔ خود ہندوستانی جیسے گھر گھسنے لوگ چین، جاپان، افریقہ اور امریکہ تک تلاش معاش میں چکر لگا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ معاشی ترقیات کے ساتھ شہروں کی وسعت اور تعداد بھی بڑھتی جا رہی ہے ؛

اگر ایک منارے پر چڑھ کر کسی شہر کا منظر دیکھو تو بوجہ گنجانی آبادی وہ بھڑوں کا سا چھتا نظر آئیگا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب شہر کے گرد و نواح میں زمین خالی پڑی ہے تو پھر لوگ شہر کے اندر تنگ و تاریک مکانات میں رہنے پر کیوں جان دیتے ہیں، شہر سے باہر ہوادار مکان بنا کر آرام سے کیوں نہیں رہتے ؟ شہری لوگ کچھ دیوانے تو ہوتے نہیں، ضرور کوئی زبردست مصلحت ہوگی کہ وہ شہر کی کوٹھڑی کو بیرون شہر کی کوٹھی پر ترجیح دیتے ہیں۔ بازاروں، کارخانوں، دفتروں، عدالتوں، کالجوں اور

ریلوے اسٹیشن کے قرب و جوار میں شرح کرایۂ مکانات بہت زیادہ ہوتی ہے اور باوجود زیادتی کرایہ لوگ ایسے ہی مکانات کے طالب نظر آتے ہیں۔ اس کی وجہ بتانا دشوار نہیں۔ لوگ اپنے کاروبار کی جگہ سے قریب رہنا چاہتے ہیں، اور کفایت وقت و سہولت آمد و رفت کو زیادتی کرایہ پر ترجیح دیتے ہیں۔ بڑے بڑے محلات جن کی تعمیر میں لاکھوں روپیہ صرف ہوا ہوگا حیدرآباد کے اندرونی محلوں میں سنسان اور غیر آباد پڑے ہوئے ہیں؛ کوئی اگر برائے نام ہی کرایہ دے تو مکان کی صفائی، روشنی آبادی، غنیمت سمجھی جاتی ہے۔ اور بلدہ کی نئی آبادی میں معمولی مکانات صد ہا روپیہ ماہوار کرایہ کما رہے ہیں: یہی حال بازاروں کا ہے، جو بازار کسی غیر آباد حصے میں بے موقع بنا ہے کہ وہاں کوئی بھولا بھٹکا خریدار آنکلے تو آنکلے ورنہ ساری خرید و فروخت پڑوس کے غریب لوگوں تک محدود ہے، وہاں وسیع دکانیں نہایت قلیل کرایے پر چلتی ہیں؛ یہاں کے دکاندار محض بوجہ مجبوری تھوڑی سی خردہ فروشی کو بیکاری سے غنیمت سمجھتے ہیں۔ لیکن جو بازار عام گزرگاہ شہر کے آباد حصے میں واقع ہے جہاں خریداروں کا دن بھر ہجوم رہتا ہے، چھوٹی سے چھوٹی دکان بھی دس گنے کرایے پر اٹھتی ہے؛ اور اس پر بھی لوگ ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ دکاندار اپنی تجارت کے فروغ پر ایسے پچاس کرایے بھی قربان کر سکتے ہیں: چنانچہ دہلی میں چاندنی چوک اور کشمیری دروازے کی دکانوں کا جو کرایہ ہے، دوسرے بازاروں میں اس کا نصف بھی نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ شہر کی گنجانی اور تنگی بے وجہ نہیں ہوتی، بلکہ زبردست معاشی اسباب کا نتیجہ ہوتی ہے ؛

اوپر کے بیان سے صاف ظاہر ہے کہ شہر کی زمین کی قدر و قیمت کا باعث موقع محل ہے۔ موقع کی اہمیت کا اندازہ ذیل کی دو مثالوں سے بیشتر واضح ہوگا۔ مدراس میں ساحل کے قریب قریب نہایت کشادہ، ہموار اور صاف سڑک کئی میل تک چلی گئی ہے، اس کو بیچ لائن کہتے ہیں؛ مناظر کی دلکشی اور ساحل کی خوبصورتی کے لحاظ سے نیپلس کے بعد دنیا بھر میں وہ دوسرے درجے کی خیال کی جاتی ہے۔ شہر کے حکام، معززین، تاجر، عالم، صد ہا یوروپین عورتیں اور بچے شام کے وقت چہل قدمی کے لیے جمع ہوتے ہیں۔ عجیب سماں ہوتا ہے، چھوٹے چھوٹے بچے سمندر کی

ریتی پر خوب دوڑ لگاتے اور لوٹتے ہیں، مگر ریتی ایسی صاف کہ کیا مجال کپڑا میلا ہو، جہاں ذرا جھٹکا کپڑا صاف۔ قریب ہی منتہائے نظر تک سمندر لہریں مارتا ہے اور غروب آفتاب کا منظر کچھ عجب بارعب اور شاندار ہوتا ہے۔ سڑک پر بینڈ بجتا ہے، جگہ جگہ بنچیں پڑی ہیں، کہیں دوستوں کی ٹولی خراماں خراماں چلی جا رہی ہے، کہیں لوگ کھڑے باتیں کر رہے ہیں، بعض لوگ کسی کے انتظار میں یا دم لینے کو بیٹھے ہوئے ہیں، اور تمام مجمع نہایت صاف و پاکیزہ، پانچ بجے شام سے آٹھ بجے رات تک یہی سماں بندھا رہتا ہے، خصوصاً چاند کی بارھویں سے سولھویں شب تک، جبکہ سمندر میں جوار بھاٹا زور شور پر ہوتا ہے، آدھی آدھی رات تک لوگ قدرت کے اس شاندار تماشے میں محو رہتے ہیں۔ تحقیق طور پر سنا ہے کہ یہاں کے قرب و جوار میں چار سو روپے گز تک زمین فروخت ہونے کی نوبت آگئی، بالآخر پرائیویٹ خرید و فروخت بند کر کے گورنمنٹ نے وہ کل قطعہ اپنے قبضے میں لے لیا اور اب وہ سرکاری ملک تصور ہوتا ہے۔ امریکہ کے مشہور شہر نیویارک میں جہاں سنا ہے بوجہ کثرت آمد و رفت صدر اسٹیشن سے شب و روز ہر چھٹے منٹ پر ایک ٹرین گزرتی ہے، وال اسٹریٹ اور براڈوے بازاروں کے قرب و جوار میں بارہ ہزار روپے اور لندن کے مشہور بازار لمبارڈ اسٹریٹ میں تقریباً اٹھارہ روپے مربع گز کی شرح سے زمین فروخت ہو چکی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے مکان کے واسطے کچھ نہیں تو دو سو گز زمین تو ہو، اور اس کی قیمت کیا ہوئی، چھبیس بلکہ چھتیس لاکھ روپے: گویا وہاں کے جھونپڑے یہاں کے محلات سے بدرجہا قیمتی ہوتے ہیں۔ کیا وہاں کی زمین سونے کی ہے؟ زمین تو ہمارے ہاں کی روپے گز والی قصباتی زمین سے کسی طرح بہتر نہ ہوگی؛ جو کچھ قیمت ہے وہ قیمت موقع کی ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ شہر کی زمینوں کی قیمت میں قیمتِ زمین اور قیمتِ موقع دو جداگانہ چیزیں شامل ہوتی ہیں؛ اور قیمت موقع میں اضافے کی بیحد گنجائش ہے۔ موقع کا اثر تو مزروعہ زمینوں کی قیمت پر بھی پڑتا ہے: چنانچہ قصبات کے قرب و جوار کے کھیت دیہات کے کھیت سے زیادہ قیمتی خیال کئے جاتے ہیں مگر سکنی زمین کے مقابلے میں مزروعہ زمین کی قیمتِ موقع کی کچھ حقیقت نہیں ہو سکتی، اور اسی وجہ سے صرف شہر کی زمینوں کے ساتھ قیمتِ موقع کا ذکر کیا جاتا ہے۔

شہروں میں پارک کی ضرورت

۹- گنجانی آبادی اور افزونی قیمتِ زمین کا اثر شہر کی ساخت پر یہ پڑتا ہے کہ گلی کوچے تنگ اور عمارتیں کئی کئی منزل بلند بنائی جاتی ہیں۔ امریکہ میں سات سات منزل تک عمارت اٹھ چکی ہے، روشنی اور پاک صاف ہوا جو زندگی کے واسطے لازمی ہیں، کافی میسر نہیں آتیں، باشندوں کی صحت کو مضرت پہنچتی ہے۔ کچھ دنوں سے یہ طریق بہت مروّج ہو چلا ہے کہ ہر شہر میں ایک یا زیادہ وسیع پارک بنائے جاتے ہیں جہاں دن بھر کے تھکے ماندے لوگ شام کو آ کر دل بہلاتے ہیں، سبزے سے آنکھیں ٹھنڈی کرتے ہیں، پاک صاف ہوا کا لطف اٹھاتے ہیں، اکثر جگہ ہفتے میں ایک یا دو روز بینڈ بھی بجتا ہے، گھنٹے دو گھنٹے کی تفریح سے دن بھر کے کام کاج کی تکان اتار کے تازہ دم گھر جاتے ہیں۔ یورپ میں تو شہر شہر پارکوں کی کثرت ہے، لیکن اب ہندوستان کے بڑے شہروں میں بھی ان کی ضرورت محسوس ہو چلی ہے: کلکتہ، بمبئی، مدراس، بنگلور، ایسے مقامات ہیں جہاں انگریزی آبادی کی کثرت ہے، مدت سے کئی کئی پارک موجود ہیں۔ الہ آباد میں ایک پارک تیار ہو چکا ہے، اور دوسرا زیر تجویز ہے۔ لکھنؤ میں بھی چھوٹے چھوٹے پارک کافی موجود ہیں، البتہ حیدرآباد میں اسکی وسعت اور حیثیت کے لحاظ سے پارک کم ہیں؛ لیکن یہاں جدید وسیع پارکوں کی تجویز زیر غور ہے۔ جس قدر شہروں کی آبادی زیادہ گنجان ہوگی پارک کی ضرورت بڑھیگی۔ عرفِ عام میں پارک شہر کے پھیپھڑے کہلاتے ہیں اور آبادی کی صحت کے واسطے وہ اسی قدر ناگزیر ہیں جس قدر جسم انسان کے واسطے پھیپھڑے۔

ٹریم کار کا شہروں کی آبادی اور زمین کی قیمت پر اثر

۱۰- ہم یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ ٹریم کار کا شہر کی حالت پر بہت مفید اثر پڑ رہا ہے۔ موٹر تو قیمتی بہت، بائیسکل کی معمولی قیمت بھی معمولی لوگوں پر گراں، اور شہر کی تنگ گلیوں اور سڑکوں کی بھیڑ بھاڑ میں اس کا چلانا خطرناک، گھوڑا گاڑی کا کرایہ زیادہ اور ہمیشہ وقت پر ملنا دشوار۔ لیکن ٹریم کار کا حسبِ قاعدہ ہر چوتھے چھٹے یا دسویں منٹ اپنے راستے سے گزرنا یقینی، کرایہ نہایت واجبی، تیز رفتار حسبِ دلخواہ اور پھر کافی مطیع، ستون کے قریب ذرا ہاتھ کا اشارہ کیا کہ کھٹ سے رک گئی، اطمینان سے چڑھے کہ چل دی۔ منزل مقصود پر حسبِ ہدایت چلانے والے نے بلا منت روک دی، اور چند پیسے دیکر چشم زدن میں میلوں دور، کارخانے، دفتر، کالج، عدالت، دوکان،

جہاں ضرورت ہوئی پہنچ گئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اب لوگ کاروباری جگہ کے قرب کے اس قدر خواہشمند نہیں جتنا کہ ٹریم کار جاری ہونے سے پہلے تھے۔ اب بجائے زیادہ گنجان ہونے کے شہر کی آبادی گردو نواح میں پھیلنے لگی ہے' بیرون شہر کی زمینوں میں صرف فاصلے کا نقص تھا سو وہ ٹریم کار نے رفع کردیا۔ ورنہ بحیثیت آب و ہوا تو یقیناً شہر کی زمینوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ پھر کیا وجہ کہ لوگ وہاں بشوق آباد نہوں! جس طرح نالیوں سے کسی تالاب کا پانی بہتا ہے' ٹریم سے شہر کی آبادی ہر چہار طرف پھیل رہی ہے' مضافاتِ شہر کی زمینوں کی قیمت بڑھ رہی ہے اور اندرون شہر زمینوں کی قیمت کی رفتارِ ترقی سست پڑ گئی۔ شہر کی گنجانی اور قیمت زمین کے بیحد اضافے کا تشویشناک مسئلہ ٹریم کار نے حسب دلخواہ حل کردیا اور ظاہر ہے کہ اس کا رواج دوسری سواریوں سے شہر کے حق میں بہت مفید ثابت ہوا؛

اضافۂ قیمت اور زمین کی مقدار

۱۱۔ چونکہ اضافۂ قیمت زمین کے اسباب زیادہ تر قدرتی خصوصیات اور معاشی ترقیات ہیں اور مالک کی ذاتی کوشش کو اس میں بہت ہی کم دخل ہے' یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اضافۂ قیمت زمین کا حقدار کلی کون سمجھا جائے؟ اگر کل نہیں تو اضافے کا ایک معقول حصہ ضرور گورنمنٹ کو ملنا چاہئے' تاکہ تمام ملک کی ترقی اور بہبودی پر صرف کیا جاسکے۔ اسی اصول پر زمینداروں سے مالگزاری اور مکانداروں سے ہاؤس ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ تقسیمِ اضافہ کی بحث ہم آئندہ بالتفصیل کریں گے اب زمین کا بیان ختم کرتے ہیں؛

باب ششم

محنت

(۱) محنت کا مفہوم (۲) محنت کے اقسام (۳) محنت کے خواص
(۴) کارگزاری اور اس کے لوازم ؂

محنت کا مفہوم

۱۔ محنت کے اصطلاحی معنوں میں قدیم معاشیئین کی کوتہ نظری اسقدر جذب ہوگئی ہے کہ باوجود تحقیق نقص، اب تک اکثر مصنفین پرانی لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں اور محنت کی وہی قدیم ناقص تعریف دہرائے جاتے ہیں۔ چنانچہ مارشل تک نے نہ معلوم کیوں دولت کی تعریف میں محض تقلید پر اکتفا کیا مگر ساتھ ہی اتنا ضرور کیا کہ مروجہ تعریف کے نقص وخامی کی پوری توضیح کردی اور کم ازکم دوسروں کو اصلاح اور ترمیم کی جرائت دلائی۔ آج سے پچاس برس پہلے تک بہت سے مسائل ناواقفیت اور غلط فہمیوں کے تختۂ مشق بنے ہوئے تھے۔ چنانچہ آدم اسمتھ کے زمانے تک دولت میں صرف مادی چیزیں شامل تھیں اور قیمتی دھاتیں مثل سونا چاندی بوجہ دیرپا ہونیکے بالخصوص اعلیٰ قسم کی دولت مانی جاتی تھیں۔ دولت کے اسی مفہوم کے مطابق محنت سے صرف وہی کام جسمانی یا دماغی مراد تھے جن کے معاوضے میں کچھ مادی آمدنی ہوسکے۔ اس میں شک نہیں کہ اب تک محنت کی عام شکل یہی ہے اور آئندہ بھی رہیگی لیکن دولت کے جدید معنے جن کو ہم مقدمے میں واضح کرچکے ہیں مدِ نظر رکھتے ہوئے محنت کا مفہوم وسیع تر بنانے کی اشد ضرورت محسوس ہوتی ہے: یعنی محنت میں وہ کام بھی شمار کرنے چاہئیں جن کے بدلے میں مادی آمدنی کے بجائے کوئی لطفِ مسرت جیسی افادے والی دولت حاصل ہو۔ ہم نے مانا کہ اس آخری قسم کی محنت کا حلقۂ عمل تنگ اور مختصر ہے اور ہونا چاہئے ورنہ نظامِ عالم منقلب ہوجاتا؛ لیکن اصولاً محنت

کے معنوں میں صرف قسم اول کے کاموں کو شامل اور قسم دوم کو خارج کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ ملازم تنخواہ کے لالچ سے خدمت کرتا ہے لیکن ماں باپ کو اولاد کے پالنے میں جو لطف آتا ہے وہ اس دولت کا افادہ ہے جو بشکل مخدومیت بمعاوضہ محنت خدمت حاصل ہوتی ہے؛ ورنہ ماں باپ کیا لایعقل ہیں کہ بیکار اپنی جان کھپاتے اور دولت لٹاتے ہیں۔ پھر ملازم کے کام کو محنت شمار کرنا اور والدین کی جانفشانی کو نظر انداز کرنا سراسر بیجا اور خلاف اصول معلوم ہوتا ہے۔ کھیل کود اور ورزشیں بھی چنکے معاوضے میں قدرت، تفریح، صحت و قوت عطا کرتی ہے، فی نفسہ محنت ہیں اور مروجہ محنت سے اس قدر قریبی تعلق رکھتی ہیں کہ ان کا لحاظ کرنا لازمی ہے۔ بیکار پڑا رہنا اس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے کہ وہ بشکل قید تنہائی ایک سخت سزا تجویز کیا گیا ہے۔ اگر محض جی بہلانے کی غرض سے بیکار آدمی کہیں آئے جائے تو یہ فعل گو بظاہر بے سود نظر آتا ہے مگر درحقیقت وہ ایک تکلیف سے نجات دیکر دل کو آرام پہنچاتا ہے اور محنت میں شمار کرنے کے قابل ہے۔ اگر کوئی سوال کرے کہ جو لوگ مفت بیگار میں بہزار ناخوشی کام کرتے ہیں ان کو تو کوئی بھی معاوضہ نہیں ملتا یعنی نہ مزدوری نہ لطف، ان کا کام محنت کیونکر کہا جا سکتا ہے؟ لیکن یہ سطحی دھوکا ہے، بیگار نہ کرنے پر جو سزا کی تکلیف پہنچتی اس سے نجات ملنا گویا کام کا معاوضہ ہے؛ اور بیگاری بھی محنت کرتے ہیں۔ دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب محنت کا مفہوم اس قدر وسیع ہے تو آخر وہ کونسے کام ہیں جو محنت نہیں؟ جواب صاف ہے، جن کاموں کا معاوضہ نہ ملے وہ محنت نہیں: مثلاً راستہ بھٹکنا، چیز گم کرنا، بات بھولنا، حادثات سے مجروح یا ضائع ہونا ؟

یہاں یہ اعتراف کرنا ضروری ہے کہ جس طرح متقدمین تفریط پر اڑے تھے ہم بھی افراط کی جانب بڑھے ہیں، تاکہ دونوں منتہی دیکھنے سے ناظرین میں وسعت نظر پیدا ہو اور وہ عقل سلیم سے کام لیکر خیر الامور اوسطہا کے اصول پر خود طے کر سکیں کہ محنت کا مفہوم کیا ہے اور کس قسم کے کام اس میں شمار ہونے چاہئیں۔ عام قاعدہ ہے کہ جو علوم انسان کے افعال ارادی سے متعلق ہیں ان کے اصول و قوانین کم و بیش تخمینی اور مذبذب ہوتے ہیں۔ ان میں بھلا علم ہندسہ یا طبیعات کے اصول و قوانین کا سا استحکام اور تیقن کہاں۔ یہ دشواری علم معاشیات میں بوجوہ

حصۂ دوم
باب ششم

معلومہ خاص طور پر پیش آتی ہے۔ تحقیق جدید، جس قدر وسعتِ مفہوم کی مقتضی تھی وہ ہم نے بیان کر دی اور محنتی و غیر محنتی کاموں میں جہاں تک ممکن تھا حد فاصل قائم کر دی، لیکن قطعی طور پر ان دونوں قسم کے کاموں کی کوئی جداگانہ فہرست نہیں بنائی جا سکتی۔ اکثر کام تو محنت ہوتے ہیں، بعض کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا دشوار ہے اور معدودے چند محنت سے خارج کئے جا سکتے ہیں؛

جو کچھ بیان ہوا یہ سب مفہوم محنت کی ایک علمی بحث تھی، عملاً اس کی اہمیت کچھ زیادہ نہیں۔ معاشیات میں ہم کو بیشتر ایسی ہی محنت کے اصول و نتائج سے سروکار ہوتا ہے جس کو عام طور پر سب محنت سمجھتے ہیں؛ یعنی وہ کام جس کا کچھ مادّی معاوضہ ہاتھ آئے۔ والدین، عشاق اور شوقین لوگوں کے مشاغل سے ہم کو معدودے چند مفید مطلب باتیں تحقیق ہوئی ہیں اور وہ اپنی اپنی جگہ بیان کی جائیں گی۔ یہاں وہ اصلی بحث سے متعلق نہیں ہیں محض علمی مذاق کے لحاظ سے مفہوم دولت میں انکا ذکر بھی کرنا ضروری معلوم ہوا؛

پس بالفاظ مختصر محنت سے وہ تمام جسمانی اور دماغی کام مراد ہیں جو بغرض حصول معاوضہ کئے جائیں۔ اکثر یہ معاوضہ بشکل مادّی اور کمتر بشکل غیر مادّی مثلاً حظّ و لطف وغیرہ مطلوب ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک محنت کو معاشی جد و جہد سے تعبیر کرنا نہایت مختصر، جامع اور صحیح تعریف ہوگی۔ معاشی جد و جہد کی تشریح مقدمے میں موجود ہے؛ سعی حاصل اور سعی غیر حاصل سے یہ مفہوم بخوبی ادا ہوتا ہے؛

محنت کے اقسام

۲۔ مدت سے محنت کی دو قسمیں چلی آتی ہیں، پیدا آور اور غیر پیدا آور۔ یہ تفریق بھی محض قدیم ناواقفیت اور تنگ نظری کی یادگار ہے۔ وہ محنت ہی کیا جو غیر پیدا آور ہو اس سے گویا اجتماع ضدین لازم آتا ہے۔ مگر چونکہ یہ بحث تاریخی حیثیت سے بہت دلچسپ ہے اور ترقی خیالات کا تمام سلسلہ اس سے پیش نظر ہو جاتا ہے، ہم اس کا لبِ لباب بیان کرنا مناسب سمجھتے ہیں؛

سترھویں صدی میں تجاریئین کا زمانہ معاشیات کا دورِ اول خیال کیا جاتا ہے، ان معاشیئین کے نزدیک صرف سونا چاندی ٹھیٹ دولت تھی اور جس محنت کا معاوضہ براہِ راست چاندی سونا ملتا تھا وہ تو پیدا آور تھی اور باقی غیر پیدا آور؛

انقلاب فرانس کے زمانے میں جب فطر آئین کا گروہ نمودار ہوا تو اس نے معاوضے میں سیم و طلا کی شرط تو اڑا دی لیکن صرف زراعت کو محنت پیدا آور اور باقی کو غیر پیدا آور قرار دیدیا اور وجہ تفریق یہ قائم کی کہ تمام پیداوار کا مخزن و منبع زمین ہے؛ باقی تمام پیشے اسی زمین کی پیداوار میں تغیر و تبدل کرتے رہتے ہیں، اپنی ذات سے پیداوار میں کوئی اضافہ نہیں کرتے ؛

دولت کی تعریف اور پیدائش دولت کے مفہوم سے صاف ظاہر ہے کہ صنعت کی مدد بغیر زمین کی پیداوار دولت نہیں کہلا سکتی؛ اس کی کافی تشریح کی جا چکی ہے۔ پس جب پیدائش دولت کے واسطے صنعت شرط لازمی ہے تو وہ محنت غیر پیدا آور نہیں ہو سکتی؛ صنعت بھی مثل زراعت محنتِ پیدا آور ہے ؛

حمالی و بار برداری کسی زمانے میں محنت غیر پیدا آور مانی جاتی تھی؛ کیونکہ کسی چیز کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے میں کوئی نئی چیز پیدا نہیں ہوتی، وہی کی وہی چیز باقی رہتی ہے۔ پھر بار برداری کیونکر محنتِ پیدا آور ہو سکتی ہے۔ لیکن مفہوم پیدائش کی بحث میں ثابت ہو چکا ہے کہ پیدائش کی ایک حالت محض نقل مقام ہوتی ہے۔ کان کنی اور بار برداری میں فرق ہے، صرف یہی نا کہ ایک معدنیات کو غار سے سطح زمین پر لاتی ہے، گویا حرکت عمودی ہوتی ہے؛ اور دوسری ایک جگہ سے دوسری جگہ چیزیں پہنچاتی ہے، گویا حرکت افقی ہوتی ہے صرف حرکات کی سمت میں فرق ہے، ورنہ نتیجہ دونوں کاموں کا ایک ہی ہے: یعنی ایک ایسے مقام سے جہاں چیز ناکارہ پڑی ہے یعنی صفتِ دولت سے معرّا ہے ایسی دوسری جگہ لیجانا جہاں وہ کار آمد ہو کر دولت بنجائے؛ دونوں کاموں سے محض بذریعۂ نقلِ مقام دولت پیدا ہوتی ہے۔ پھر کیا وجہ کہ کان کنی تو محنت پیدا آور ہو اور بار برداری نہ ہو؟ اگر زمین کی پیداوار زمین ہی پر چھوڑ دیجائے اور مصنوعات کارخانوں میں انبار ہوتے رہیں اور منڈی تک نہ لائے جائیں تو کسی طرح پر دولت نہیں شمار ہو سکتے۔ نقلِ مقام ان کے دولت بننے کی شرط لازمی ہے اور خصوصاً اس زمانے میں تو بار برداری پیدائش دولت میں بیحد مدد دیکر بدرجۂ اولی محنت پیدا آور کہلانے کی مستحق ہے ؛

کسی زمانے میں تجارت اور بار برداری دونوں کام ایک ہی شخص کے متعلق تھے۔

تاجر اپنے ذاتی اہتمام اور نگرانی سے مال شہر بشہر لیے پھرتے تھے۔ مگر معاشی ترقیات کی بدولت اب یہ دونوں کام جدا ہو گئے۔ تاجر اپنی دکان سے مال روانہ کرتے ہیں اور دکان پر وصول کرتے ہیں۔ باربرداری کا کام اب ریلوے کمپنی نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ باربرداری تجارت سے اس قدر وابستہ ہے، جیسے چولی سے دامن اور جسم سے روح۔ باربرداری کا باعث اور غرض تجارت نہیں تو اور کیا ہے؟ پس جب باربرداری محنت پیدا آور قرار پاچکی تو اسکی رُوحِ رواں یعنی تجارت اس سے بڑھ کر محنتِ پیدا آور سمجھنی چاہیے۔ زراعت، صنعت، باربرداری اور تجارت درحقیقت ایک ہی عمل پیدائش کے لازمی حصے ہیں اور ہر ایک بطور خود محنت پیدا آور ہے ؎

لیکن اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خدمات عامۃ بھی محنتِ پیدا آور ہو سکتی ہیں: مثلاً جج جو فیصلے لکھتا ہے، ڈاکٹر نسخہ گاف دیتا ہے، طبیب دوا تجویز کرتا ہے، پروفیسر لڑکے پڑھاتا ہے، اڈیٹر اخبار، رسالے چھاپتا ہے، مصنف کتابیں لکھتا ہے، ان کاموں سے کیا دولت پیدا ہوتی ہے؟ اس کے دو جواب ہیں: اول تو مقدمے سے ان خدمات کا دولت ہونا ثابت ہے، لہٰذا محنتِ پیدا آور ہیں۔ کیونکہ افادے اور مبادلہ پذیری کے ہوتے ہوئے غیر پیدا آور ہونے سے اجتماع ضدین لازم آتا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ تقسیم عمل کے اصول پر کام کی بیشمار قسمیں تو پیدا ہو گئیں لیکن وہ ایک دوسرے سے یوں منسلک ہیں کہ کسی ایک کا بھی باقی سے جدا کرنا محال ہے۔ اگر انسان تمام پیشوں کے باہمی تعلق پر غور کرے تو وہ ہر ایک کو باقی تمام کا جزو ضروری پائیگا۔ تحقیق ہوا ہے کہ جو روٹی ہم کھاتے ہیں اسکی تیاری سے براہ راست اور بالواسطہ تین سو پیشے متعلق ہیں؛ حتیٰ کہ ادیب و شعرا اور تمام علوم کے حکما جو ملک میں پاکیزہ خیالات، عمدہ جذبات اور بیداری پیدا کرتے ہیں، طرح طرح کے مفید معلومات پھیلاتے ہیں، وہ بھی روٹی کے اہتمام میں کم و بیش شریک ہیں۔ فرق ہے تو بس اتنا کہ کسی کا تعلق قریبی ہے اور کسی کا بعید، کسی کا ظاہر کسی کا پوشیدہ؛ مگر سلسلۂ تعلق میں سب تسبیح کے دانوں کی طرح پروئے ہوئے ہیں جدا ایک بھی نہیں ؎

تفصیل بالا سے واضح ہوا کہ تمام قسم کی محنت پیدا آور ہے۔ اگر کوئی کام غیر پیدا آور ہے تو وہ محنت ہی کہاں رہا! پس محنت پیدا آور اور غیر پیدا آور کی تفریق سراسر بے معنی ہے۔ لیکن کسی زمانے میں جبکہ پیدائش کا مفہوم صاف نہ تھا محنت کی

یہ تفریق بہت اہم خیال کیجاتی تھی۔ یہ خیال کرنا بیجا ہوگا کہ مذکورۂ بالا خامیوں سے متقدمین کی علمیت پر کچھ الزام آتا ہے؛ کوئی علم دنیا میں کامل ہوکے نہیں آتا بلکہ صدہا سال کی مسلسل کوشش سے بتدریج ترقی پاتا ہے؛ اور خواہ کسی درجے پر پہنچ جائے لیکن جو متقدمین کسی علم کی بنا ڈالتے ہیں اور جہالت کی ابتدائی تاریکی سے نکال کر دنیا سے متعارف کرتے ہیں انکا فخر کسی دوسرے کو کب نصیب ہوسکتا ہے۔ جن علما کی تنگ نظری کا ہم نے ذکر کیا ہے انھوں نے اپنی قابلانہ تحقیق سے اس علم میں بیش بہا معلومات کا اضافہ کرکے اگر سچ پوچھو تو دنیا پر احسان کیا ہے۔ انکے علمی خیالات میں جو آجکل خامیاں نظر آتی ہیں آئندہ چل کر موجودہ خیالات میں اس سے بڑھ کر نقص نکالے جائیں گے۔ یہ تو ترقی علم کا لازمی نتیجہ ہے، اس سے کسی کی قابلیت پر حرف نہیں آتا ؛

محنت کی ایک تقسیم اور بھی کی گئی ہے، محنتِ بامہارت و بے مہارت۔ دونوں قسموں کے کچھ خواص مقرر نہیں، صرف اتنا فرق ضرور ہے کہ جس کام کے سیکھنے میں کچھ وقت اور ذہانت درکار ہو وہ بامہارت کہلاتا ہے، اور جو بلا غور جلد آجائے وہ بے مہارت۔ لیکن ان دو قسموں کے درمیان کوئی بیّن اور مستقل حد فاصل قائم نہیں ہوسکتی۔ علمی اخلاقی اور معاشی پسماندگی اور ترقی کے مطابق انکے حلقوں میں کام داخل یا خارج ہوتے رہتے ہیں؛ چنانچہ گاؤں کی محنتِ بامہارت، قصبے میں بے مہارت، اور قصبے کی بامہارت شہر میں بے مہارت شمار کی جاتی ہے۔ درزی کی محنت فرض کرو گاؤں میں معمولی کرتا پاجامہ، قصبے میں اچکن، انگرکھا، اور شہروں میں فیشن ایبل کوٹ، پینٹ محنت بامہارت سمجھے جاتے ہیں۔ اس طرح گاؤں میں ہل، چرخہ، قصبے میں صندوق چوکی، اور شہروں میں خوشنما میز کرسی، بڑھئی کی محنت بامہارت مانی جاتی ہے۔ عام شناخت تو وہی ایک ہے، سیدھا سادہ آسان کام بے مہارت اور دقیق و دشوار بامہارت۔ البتہ ترقی کے ساتھ آسانی اور دشواری کے معیار بدل جاتے ہیں اور اسی کے مطابق کام داخل خارج ہوتے رہتے ہیں۔ محنت کا مفہوم اور اس کے اقسام بیان ہوچکے، اب ہم ضروری خواص بتانا چاہتے ہیں ؛

محنت کے خواص

۳ – (ل) جب کوئی شخص مکان تعمیر کراتا ہے، باغ لگاتا ہے، ہاتھی، گھوڑے وغیرہ جانوروں کے سدھانے میں روپیہ صرف کرتا ہے، یا کوئی قیمتی

مشین خریدتا ہے، تو وہ جس چیز پر روپیہ صرف کرتا ہے اس کا پورا مالک ہوتا ہے، اور اسکے استعمال یا فروخت سے اپنی لاگت وصول کر سکتا ہے۔ لیکن جو روپیہ انسان کی تعلیم اور تربیت پر صرف کیا جاتا ہے اسکی حالت بالکل جداگانہ ہے، ماں باپ محض فطری محبت کے جوش میں اولاد کی پرورش اور تعلیم و تربیت پر ہزار ہا روپیہ لٹا دیتے ہیں، لیکن ان کو اپنے مصارف کی واپسی کا کوئی اطمینان نہیں ہو سکتا۔ اگر اولاد اہل ہو تو شاید اپنی کمائی سے بوڑھے والدین کی خدمت کرے ورنہ والدین تمام عمر کی کمائی اور محنت سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں، خصوصاً جب سے رسم غلامی بند ہوئی اور شخصی آزادی نے زور پکڑا، ہر کوئی خود مختار بن بیٹھا۔ کسی کی ملک ہونا تو درکنار اب انسان سوائے قانون کے کسی کا مطیع نہیں رہا۔ جب یہ حالت ہے تو غیروں کو کیا پڑی ہے کہ کسی کی تعلیم و تربیت پر روپیہ صرف کریں۔ چنانچہ حیوانات، نباتات، مکانات، آلات اور دیگر مادی سامان کی اصلاح و ترقی میں روپیہ جس قدر بیدریغ صرف کیا جاتا ہے، تعلیم و تربیت کے خرچ میں اسی قدر بخل کیا جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مصارف اول الذکر کی بنا منفعت طلبی ہے، اور آخر الذکر کی محبت و انسانی ہمدردی۔ اور ان دو جذبات کی قوت اور وسعت عمل میں زمین آسمان کا فرق ہے، محبت اور ہمدردی سے پاک جذبات تو کمتر دلوں میں بستے ہیں، مگر منفعت طلبی سی قوی خواہش کی کسی دل میں کمی نہیں۔ پس جن مصارف میں منفعت طلبی داخل ہے انکی کثرت ہے اور جو محض ہمدردی پر مبنی ان کی قلت ؛

جو روپیہ غیروں کی تعلیم پر صرف کیا جاتا ہے اسکی واپسی میں قانون سے مدد لیجا سکتی ہے مگر وہ مدد بھی پوری کارگر نہیں ہوتی۔ فرض کیجئے کہ کوئی شخص وظیفے سے تعلیم حاصل کر کے اسکی واپسی میں تساہل کرے تو اس سے روپیہ وصول کرنا بہت دشوار ہے، البتہ وہ حیران و پریشان کیا جا سکتا ہے۔ تعلیمی وظائف کی واپسی زیادہ تر نیک نیتی اور خوش معاملگی پر منحصر ہے نہ کہ جبر اور قانونی کارروائی پر۔ اگر وظائف جائداد کی ضمانت پر دیے جائیں تو جائداد ہوتے ہوئے وظیفے کی حاجت کیا۔ وظیفے کی غرض تو نادار اور ذہین طلبہ کی امداد ہے، جائداد کی ضمانت سے گویا وظیفے کی اصلی غرض فوت ہوتی ہے۔

اور اگر ضامن طلب کئے جائیں تو وظیفہ چاہنے والے حیثیت کے لوگوں کو ضامن میسر آنا معلوم غرضکہ وظیفہ عاریتہً محض اعتماد پر دیا جاتا ہے یا مفت بطور ہمدردی۔ مثل اور مصارف کے وظائف کا دینا کبھی کاروباری حیثیت اختیار نہیں کر سکتا۔ ہندوستان کا تو ذکر کیا ہے انگلستان سے بیدار اور ترقی یافتہ ملک میں جہاں گورنمنٹ اور قوم کی جانب سے بیشمار روپیہ عوام کی تعلیم پر صرف کیا جاتا ہے نادار طلبہ کو تعلیم میں خاص دقتیں پیش آتی ہیں اور وہاں بھی زیادہ تر والدین ہی کو تعلیمی مصارف کا متحمل ہونا پڑتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جبتک انسان انسان ہے اور ذاتی منفعت کا شوق محبت و ہمدردی کے جذبات پر غالب ہے، ممکن نہیں کہ تعلیم و تربیت پر روپیہ ایسی بے تکلفی سے خرچ کیا جائے جیسا کہ پرورش حیوانات و باغات اور تعمیر عمارات و خرید آلات پر۔ اور وجہ صرف وہی ہے جو بیان کی گئی کہ انسان آزاد ہے اور اپنے فعل کا مختار، وہ اپنی محنت بمعاوضۂ اُجرت فروخت کر دیتا ہے مگر خود اپنی ملک رہتا ہے۔ مشین کی طرح وہ محنت خریدنے والے کے ہاتھ خود نہیں بک جاتا، اور نہ اسکی محنت پر خریدار کو مشین کے کام کی طرح پورا اقتدار ہے پس جب مزدور اسقدر آزاد اور مختار ٹھیرا تو اسکی تعلیم و تربیت میں منفعت کی غرض سے روپیہ لگانا بعینہٖ ایسا ہے کہ کوئی کسان جس کو زمیندار حسب شرائط پٹہ بلا معاوضہ ہر وقت بیدخل کر سکے، اپنے کھیت کی درستی میں لاگت لگائے۔

مذکورۂ بالا خصوصیت کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی تعلیم و تربیت میں سخت دقّت پیش آرہی ہے، اس کا زیادہ تر دارومدار والدین کی کوشش پر ہے۔ مگر بہت سے بچّے کم عمری میں والدین کے ظلِّ عاطفت سے محروم ہو جاتے ہیں، بہت سے والدین اسقدر نادار ہوتے ہیں کہ تعلیم تو درکنار اولاد کا روٹی کپڑا ہی بارگراں ہوتا ہے؛ بہت سے والدین اسقدر بے مہر اور دولت پرست ہوتے ہیں کہ وہ بچوں کی تعلیم و تربیت پر کافی روپیہ صرف کرنا گوارا نہیں کرتے؛ بہت سے اسقدر کم عقل اور ناعاقبت اندیش ہوتے ہیں کہ محبت میں اندھے ہو کر اولاد کو بیجا صرف سے ناکارہ اور بدا طوار بنا دیتے ہیں؛ اور جو تھوڑے باقی بچے وہ البتہ دنیا کے حالات سے باخبر، اولاد کے سچے بہی خواہ اور روپے کے صحیح مصرف سے واقف ہوتے ہیں، اپنی اولاد کو خاص اہتمام سے تعلیم دلا کر اس قابل

حصہ دوم
باب ششم

بنا دیتے ہیں کہ وہ دنیا میں عزت و ناموری کی زندگی بسر کر سکے۔

(ب) تعلیم و تربیت پر روپیہ صرف کرنے میں ایک اور امر بھی مانع ہوتا ہے، وہ یہ کہ اعلیٰ قابلیت حاصل کرنے کے واسطے بہت سا وقت اور صرف درکار ہے۔ پھر اگر کوشش میں کمی رہ جائے یا استعداد ناقص ہو یا حالات ناساعد پیش آجائیں تو وقت اور صرفہ سب اکارت جاتا ہے۔ چنانچہ اسوجہ سے اکثر کی تو ہمت ہی نہیں بندھتی اور کوشش کرنے والوں میں بھی صرف تھوڑے سے تو منزل مقصود تک پہنچتے ہیں، باقی سب تھک کر منزل بمنزل پڑاؤ ڈالدیتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ اگر خوش قسمتی سے کوئی بصد کوشش بہت سا بیش بہا وقت اور زر کثیر صرف کر کے کمال حاصل کرتا ہے اور کسی کام کے قابل بنتا ہے تو اس کی زندگی کا ایک لمحہ اعتبار نہیں، خواہ سالہا سال قابلیت سے فیض پہنچائے، فائدہ اٹھائے، خواہ اس کو اچھوتا اپنے ساتھ قبر میں لے جائے۔

پھول تو دو دن بہار جانفزا دکھلا گئے حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

گویا انسانی تعلیم و تربیت مثل ایک لب دریا کاشت کے ہے کہ جس کے طغیانی سے تباہ ہو جانے کا اندیشہ ہر لمحہ لگا رہتا ہے۔

(ج) محنت کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ مزدور سے جدا نہیں کیجا سکتی جہاں محنت درکار ہوتی ہے مزدور کا اپنی ذات سے وہاں موجود ہونا لازمی ہے۔ برخلاف اس کے دیگر عاملین پیدائش یعنی زمین و اصل اکثر اپنے مالک سے جدا رہتے ہیں۔ زمیندار کی زمینیں بہت سے گانوؤں میں مصروف کاشت رہتی ہیں، اور زمین تو غیر منقولہ ہے، اصل کو دیکھئے کہ وہ مالک سے جدا رہکر ہر جگہ کام کر سکتا ہے۔ ان یوروپینوں کا کروڑہا روپے کا قیمتی اصل ہندوستان میں لگا ہوا ہے جنھوں نے سوائے نقشے کے ہندوستان کی صورت بھی نہیں دیکھی، مگر خاص محنت ان کی ذات سے وابستہ ہے۔ جسم سے سایہ جدا ہو سکتا ہے، مگر مزدور سے محنت جدا نہیں ہوتی۔ اس خصوصیت کا اثر محنت کی مقامی نقل و حرکت پر بہت پڑتا ہے کبھی گھر کی محبت کبھی آمد و رفت کی دقت، کبھی نئے ممالک کی آب و ہوا کی ناموافقت کبھی زبان و معاشرت کی ناواقفیت کبھی خریدار محنت یعنی آجر کی سخت گیری

وتند مزاجی، کبھی خود پیشے کی ناخوشگواری اور اسی قسم کی بہت سی مزاحمتیں نقل محنت میں پیش آتی ہیں اور مزدور وطن نہ چھوڑنے کی وجہ سے دور افتادہ مقامات میں جاتے اور اعلیٰ اجرت حاصل کرنے سے محروم رہ جاتا ہے ؛

حاصل کلام یہ ہے کہ محنت نہ تو مانند زمین قطعاً غیر منقولہ ہے اور نہ اصل کی مانند سریع الانتقال منقولہ ضرور ہے مگر مزدور کے ساتھ ساتھ؛ اور برخلاف زمین و اصل کے مزدور کی ذات سے جدا نہیں کیجا سکتی؛ اور یہ خصوصیت محنت کی نقل و حرکت میں مزاحم ہوتی ہے؛

(د) مزدور کی چوتھی کمزوری یہ ہے کہ اس کو محنت کئے بغیر کوئی چارہ نہیں۔ اسکی دو وجہیں:- اوّل تو وہ اسقدر خوشحال نہیں کہ کچھ روز بھی بیکار بیٹھ کر فراغت اور اطمینان سے بسر اوقات کر سکے؛ یہی سبب ہے کہ بیکاری کے نام سے وہ سہم جاتا ہے۔ اکثر کی تو حالت یہ ہے کہ کچھ کمایا تو روزی ورنہ روزہ۔ دوسرے اگر مزدور کو کچھ استطاعت بھی ہو، تو بیکار پڑے رہنے سے اسکی کاریگری اور مہارت کو بٹہ لگتا ہے۔ ہاتھ میں وہ پہلی سی صفائی اور تیزی نہیں رہتی، کام سے دل اُچاٹ سا ہو جاتا ہے؛ مزدور اگر کام چھوڑ بیٹھے تو اس کی حالت بھی کچھ دنوں میں ایسی ہوگی جیسے کہ بیکار پڑے پڑے کسی مشین کو زنگ لگ جاتا ہے۔ گویا مزدور کے واسطے یہ ضروری اور مفید ہے کہ وہ اپنے کام سے لگا رہے؛ البتہ کبھی کبھی آرام لینا دوسری بات ہے۔ اس خامی کا نتیجہ یہ ہے کہ آجر کے مقابل مزدور کمزور بلکہ بے بس ہو جاتا ہے؛ اجرت کے معاملے میں پوری آزادی سے ردّ و قدح نہیں کر سکتا؛ جو کچھ ملتا ہے اکثر اسی کو غنیمت سمجھتا ہے۔ البتہ کچھ روز سے اس فرقے میں جان پڑنی شروع ہوئی ہے اور خصوصاً انجمہائے اتحاد مزدوراں مزدوروں کی بہت حمایت کر رہی ہیں؛ اور ان کی مالی حالت سدھارنے کی تدابیر نکالنے میں بہت سرگرمی سے مصروف ہیں۔ چنانچہ ہم آگے چل کر اس واقعے کی مختصر تفصیل پیش کریں گے ؛

(س)۔ زراعت حسب قوانین قدرت پیدا ہوتی ہے؛ مشین بھی ایک معمول پہ چلتی ہے مگر محنت کی حالت جداگانہ ہے۔ اس میں مزدور کی مرضی کو بھی دخل ہے؛ مزدور اگر چاہے تو باوجود تاکید و نگرانی کام سست کرے، بگاڑ دے، اور چاہے تو بحالت آزادی کام جلد سے جلد اور عمدہ سے عمدہ کر دکھائے۔ مزدور

کو سرزنش اور جرمانے کے ذریعے سے قابو میں لانے کی کوشش کی جاتی ہے، ترقی اور انعام کے لالچ سے کام کی ترغیب دیجاتی ہے؛ لیکن فی نفسہٖ مرضی کا عمل محنت سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ "گندم از گندم بروید جو زجو" سنگر مشین ایک سا بخیہ کرتی ہے لیکن وہی درزی ایک ہی کپڑے کا عمدہ سے عمدہ اور خراب سے خراب لباس قطع کر سکتا ہے۔ گویا محنت مزدور کی مرضی کے تابع ہے۔ چنانچہ مقولہ ہے کہ "مزدور خوش دل کند کار بیش" اور یہی وجہ ہے کہ قانوناً کام لینے کا دعویٰ نہیں ہو سکتا البتہ کام سے روکنے کا دعویٰ ہو سکتا ہے۔

(ص) محنت پر بھی قدرت نے وقت کی پابندی کسی طرح پر لازم کردی ہے: اول تو طوالت عمر کا حال سنئے! یورپ کی مردم شماری کے تازہ ترین اعداد سے واضح ہوتا ہے کہ ایک چہارم بچے چھ سال کی عمر تک ضائع ہو جاتے ہیں۔ انکو شامل کر کے سولہ برس کی عمر تک مرنے والوں کی تعداد نصف کے قریب ہوتی ہے۔ ایک تہائی ۵۰ ؍ اور ۶۰ سال کے درمیان عمر پاتے ہیں اور ۶۵ سال سے تجاوز کرنے والوں کا اوسط صرف ایک فی صدی پڑتا ہے۔ اب دیکھنا چاہئے کہ اس مختصر عمر کا کتنا حصّہ محنت میں صرف ہوتا ہے: ابتدائی چھ سات سال تو بچپن کے کھیل کود کی نذر ہوتے ہیں، اسکے بعد تعلیم شروع ہوئی، اگر استعداد مناسب ہو کوشش کافی کی جائے، اور حالات بھی ساعد ہوں تو آجکل کم از کم بیس سال، اور زیادہ سے زیادہ تیس سال کی عمر تک تکمیل تعلیم و تحصیل فن سے فارغ ہو کر انسان کام کے قابل بنتا ہے۔

مزدور کل تو ہے نہیں کہ رات دن چلے اور تھکنے کا نام نہ لے، کھانا، پینا، سونا، سیر تفریح، اس کی قیام صحت کیواسطے لازمی ہیں۔ اگر قانون قدرت کی خلاف ورزی کریگا جلد سزا پائیگا اور پچھتائیگا۔ تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ بالعموم صحت کو مضرت پہنچائے بغیر تندرست انسان آٹھ گھنٹے روزانہ سے زیادہ محنت نہیں کر سکتا۔ ہفتے وار یک روزہ تعطیل اور متفرق تعطیلات کا مجموعہ تین ماہ اور بعض محکموں مثلاً تعلیمات میں چار مہینے سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ علالت اور اتفاقی ضروریات کی رخصتوں کا اوسط بھی سال میں ایک مہینے سے کم نہیں پڑتا۔

مذکورۂ بالا حساب سے کل وقت جو جزواً محنت میں صرف ہوتا ہے سال میں ڈھائی ماہ کی تعداد سے زیادہ نہیں ہوتا بلکہ بعض پیشوں میں اس سے بھی کم۔ پچیس سال کی عمر میں لوگوں نے کام شروع کیا، پچاس سال کے بعد سے ضعف پیری کے ہاتھوں جلد ناکارہ بنکر بحالت ملازمت مستحق پنشن قرار پاگئے؛ ورنہ اندوختے پر بیکاری کی زندگی بسر کرنے لگے ؛

غرض کہ اوقات کی مذکورہ پابندی نے محنت کی مقدار بہت گھٹا دی اور معاشی ترقیات کے ساتھ ساتھ صرف محنت کی بیشمار راہیں پیدا ہوگئیں۔ مگر بایں ہمہ محنت ضرورت سے زیادہ پائی جاتی ہے، اور بیکار مزدور روزگار کے جویا نظر آتے ہیں۔ بیکاری کا مسئلہ ہر ملک میں باعث تشویش بنا ہوا ہے۔ اجرت اور ترقی آبادی کے تحت میں ہم بھی اس سے مزید بحث کریں گے ؛

کارگزاری اور اس کے لوازم۔

۴۔ سخت محنت خواہ جسمانی ہو یا دماغی بلا اکراہ و تکان دیر تک برداشت کرنا، کام میں سمجھ بوجھ، معاملہ فہمی اور ہوشیاری دکھانا غرضکہ طاقت، چستی، استقلال، تندہی اور ہوشیاری، ایسے صفات جو عمدہ مزدور کا باعث امتیاز ہوتی ہیں مجموعۃً کارگزاری یا کارکردگی کہلاتی ہیں۔ مہارت اور کارگزاری دو جداگانہ چیزیں ہیں۔ جو قابلیت کسی ایک کام سے مخصوص ہو مثلاً جراحی، مصوری، انجنیری، یا درزی کی فیشن ایبل تراش، مہارت کہلاتی ہے۔ مگر جو صفات ہر ایک کام کی عمدگی کیواسطے عموماً لازمی ہیں، وہ کارگزاری میں شامل ہیں ؛

اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ کیا حالات خاص طور پر کارگزاری کی ترقی کے واسطے مناسب اور مساعد ہیں ؛

(ل) سب سے مقدم آب و ہوا اور موسم کا اثر ہے۔ انتہا درجے کی گرم اور سرد آب و ہوا اور موسموں کا جلد جلد تبدیل ہونا، کارگزاری پر مضر اثر ڈالتا ہے۔ منطقۂ حارہ میں سخت محنت خصوصاً جسمانی زیادہ دیر تک برداشت نہیں کیجا سکتی اور محنت کی وہاں ضرورت بھی کم ہے۔ بوجہ کثرت نباتات زمین کی پیداوار سے بلا مشقت غذا حاصل ہو جاتی ہے۔ گرمی میں اتنا کپڑا کافی کہ بدن ڈھک جائے گھنے درختوں کے ٹھنڈے سائے سے زیادہ آرام کہاں مل سکتا ہے؟ مختصر چیز بست رکھنے کو ایک جھونپڑا کافی۔ گرم اور خشک ممالک کی زندگی بھی نہایت سادہ ہوتی ہے، بوجہ قلت پیداوار

وہاں کی ضروریات بھی احتیاج زندگی سے آگے کم بڑھ سکتی ہیں۔ چنانچہ منطقۂ حارہ کی معاشی زندگی ہمیشہ سے ایسی ہی چلی آتی ہے اور غالباً کبھی قابل لحاظ تغیر واقع نہ ہو سکے گا۔ اسی طرح پر منطقۂ باردہ میں بوجہ شدت سرما و کثرتِ برف، نہ زمین سے پیداوار ہوتی ہے، نہ باشندوں کو محنت کا موقع ملتا ہے۔ ہفتوں جھونپڑوں میں بند رہکر خدا جانے جانوروں کے گوشت پر کیونکر زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ریگستان اور برفستان کبھی زراعت، صنعت وحرفت، تجارت اور دیگر معاشی ترقیات کے مرکز بن سکیں۔ موسم جلد جلد تبدیل ہونا کارکردگی کیواسطے مضر ہے۔ ہندوستان میں تین موسم ہوتے ہیں: کبھی تڑاقے کی گرمی، کبھی کڑاکے کا جاڑا، اور کبھی موسلا دھار بارش۔ طبیعت ایک موسم کی عادی نہیں ہونے پاتی کہ دوسرے کی پیروی لازم ہو جاتی ہے، اور دوسرے کی طرف متوجہ ہوئی کہ تیسرا موسم آپہنچا۔ بغرضکہ تمام سال اسی ردوبدل میں ختم ہو جاتا ہے۔ طبیعت کو کبھی سکون اور یکرنگی میسر نہیں آتی، نتیجہ کمزوری اور اضمحلال ہوتا ہے۔ چنانچہ علاوہ دیگر اسباب کے تغیرات موسم بھی ہندوستانیوں کی آرام طلبی کا باعث خیال کئے جاتے ہیں۔ یہ تو عام تجربہ ہے کہ تبدیلی موسم کے زمانے میں کم از کم ہفتہ عشرہ طبیعت کند اور کسلمند ضرور رہتی ہے۔ اور بارش و سرما کے درمیانی زمانے میں بوجہ گرمی و رطوبت ملیریا اور ہیضہ اکثر مقامات میں بلاناغہ ہر سال پھیلتا ہے۔ چونکہ طبیعت پورے طور پر عادی نہیں ہوتی، ہر موسم کی شدت سے مغلوب ہو جاتی ہے۔ جون جولائی میں ہاتھ سے پنکھا اور گلاس نہیں چھوٹتا، ہر شخص کسی تاریک کوٹھری میں دن بھر خاموش پڑا رہنا پسند کرتا ہے۔ صبح کی خنکی میں سب ضروری کام کر لیتے ہیں، یا غروب آفتاب کے قریب لوگ گھر سے نکلتے ہیں، دوپہر کو شہر بھر میں ہو کا عالم ہوتا ہے۔ بارش میں سوائے زراعت کے کھلے میدان کے اکثر کاروبار بند ہو جاتے ہیں، آب و ہوا کی خرابی محنت کرنے سے مانع ہوتی ہے۔ البتہ جاڑے کے چار مہینے کام کاج کیواسطے نہایت مناسب ہیں۔ اسی موسم میں عدالتیں، دفتر، اسکول، کالج، فیکٹریاں، کارخانے، منڈیاں اور بازار آباد اور مصروف کار نظر آتے ہیں ⁂

اسکے برعکس منطقۂ معتدلہ خصوصاً شمالی حصے کے ممالک میں خوشگوار آب و ہوا اور یکرنگ موسم بدن کو چست اور طبیعت کو قوی و بشاش رکھتے ہیں۔ نہ پسینہ آئے، نہ بدن ٹھٹھرے بہت دیر تک محنت کی تکان محسوس نہیں ہوتی۔ موسمی تغیرات نہ طبیعت کو پراگندہ کریں

نہ محنت میں ہارج ہوں، سال بھر کاروبار ایک رفتار پر چلتا ہے۔ پیداوار زمین کی نہ اس قدر کثرت کہ آدمی قناعت کرکے بیٹھ رہے نہ اسقدر قلت کہ مجبور بن بیٹھے، بلکہ اسکی مقدار ایسی مناسب ہوتی ہے کہ عمل پیدائش میں محنت اور اصل کو بھی حصہ لینے کا کافی موقع ملجاتا ہے۔ حاصلِ کلام یہ کہ منطقۂ معتدلہ کارگزاری کی نشوونما اور معاشی ترقیات کیواسطے نہایت موزوں ہے۔ منطقۂ حارہ کمتر اور منطقۂ باردہ سب سے کم، چنانچہ واقعات اس اصول پہ بالاتفاق شاہد ہیں:

(ب) آب وہوا اور موسم کا اثر کم وبیش تمام ضروریاتِ زندگی پر پڑتا ہے۔ سب سے اول خوراک کو فرض کیجئے کہ وہ زمین سے پیدا ہوتی ہے اور جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے پیداوار زمین کی نوعیت بیشتر آب وہوا اور موسم سے وابستہ ہے۔ ہندوستان کا آم افغانستان میں نہیں پھلتا اور نہ کشمیر کا سیب دکن میں۔ برار کی عمدہ روئی ہندوستان بھر میں کہیں نہیں ہوتی، جوٹ کی کاشت مشرقی بنگال تک محدود ہے، کھجور ریگستان کی نعمت ہے اور ایسا ہی حال تمام نباتات کا ہے۔ ہماری خوراک نباتات سے مرکب ہے اور نباتات کے خواص مختلف۔ بعض میں مادۂ نشوونما بہت زیادہ، بعض میں متوسط، اور بعض میں بہت کم۔ اسی طرح پر بعض مفید اور معاونِ صحت ہیں اور بعض مضر اور مخرب۔ افغانستان میں میوے کی وہ کثرت کہ کھائے بن نہیں پڑتا اور قریب ہی راجپوتانے میں جوار باجرا نعمت عظمیٰ سمجھا جاتا ہے اور ان دونوں غذاؤں کا فرق باشندوں کی حالت جسمانی سے صاف ظاہر ہے۔ مدراس اور بنگال کی غذا عام طور پر چاول مچھلی ہے، یہ دونوں پانی کی مقدار بڑھا کر خون کو رقیق اور اسکی حرارت کو کم کردیتے ہیں لیکن چونکہ گندھک کا جزو غالب ہے دماغ کو خاص طور پر تقویت پہنچاتے ہیں۔ چنانچہ بنگالی نہایت ذہین وطباع، دیکھنے میں بھی جسیم مگر جسمانی محنت سے کمتر مانوس ہوتے ہیں۔ برعکس اسکے پنجاب کی خوراک گیہوں اور گوشت دونوں چیزیں خون میں فولادی ذرات پیدا کرکے حرارت بڑھاتی ہیں، جسم کو قوی کرتی ہیں۔ چنانچہ بالعموم پنجابی لوگ ذہین تو کچھ ایسے ہی، مگر اکھڑ، غصیل، مستعد اور جفاکش خاص طور پر ہوتے ہیں۔ ترشی اور منشیات کی کثرت سے دکن میں اکثر لوگ ضعیف وناکارہ ہوجاتے ہیں۔ عرب دیکھنے میں کیسے دُبلے پتلے مگر چونکہ ان کی غذا عموماً گرم خشک

ہوتی ہے ایکے پٹھے فولاد سے مضبوط اور دل شیر کا سا قوی ہوتا ہے۔ اسکے برعکس سرد تر چیزوں کی کثرتِ استعمال سے بنیوں کے جسم خمیر کے مانند پھول کر کس قدر بے قابو ہوجاتے ہیں۔ غرضکہ صحت وقوت کا دارومدار خاص طور سے خوراک پر ہے اور خوراک مقامی آب وہوا اور موسم سے مخصوص ہوتی ہے۔ پس آب وہوا کا گزاری پر بذریعہ خوراک بھی بہت قوی اثر ڈالتی ہے اور کسی ملک میں عمدہ نباتات کی کثرت خدا کی بہت بڑی نعمت ہے ؛

ریل اور جہازوں نے ہر ایک پیداوار تمام دنیا میں پھیلادی ہے۔ گوشت جیسی جلد سڑنے والی چیز کو طرح طرح کے مصالحے لگا کر اور پھل جیسی گلنے والی چیز کو شہد و شراب میں ڈال کر ہزاروں میل لے جاتے ہیں اور مہینوں رکھ کر کھاتے ہیں۔ علم نباتات کے زور سے غیر ملکوں کی چیزیں بھی بوسکتے ہیں: چنانچہ ولایت میں گرم ملکوں کے پھل اور ترکاریاں شیشے کے مکانات میں عارضی گرمی کی مدد سے پیدا کر لیتے ہیں۔ مگر ان ترکیبوں سے قدرتی پیداوار کی سی کثرت کہاں ہوسکتی ہے، صرف امرا اور دولتمند اپنا شوق پورا کر لیتے ہیں، عوام کو تو خواب وخیال میں بھی وہ چیزیں میسّر نہیں آتیں ؛

(ج) خوراک کے بعد لباس اور مکان قابل غور ہیں۔ سرد ممالک میں انکی خاص طور پر ضرورت ہوتی ہے۔ اگر حسب ضرورت میسّر نہ آسکیں، تو بیماری کا اندیشہ قوی ہوجاتا ہے۔ گرم ممالک میں کپڑا صرف بقدر ستر پوشی درکار ہوتا ہے۔ اگر گھنے درختوں کی کثرت ہے تو ان کے سائے میں جنت کا لطف آتا ہے ورنہ دھوپ سے بچنے کے لیے جھوپڑے کافی ہیں، ان کو سرد ملک والوں کے برابر محفوظ اور مضبوط مکان کی ضرورت نہیں۔ لیکن اگر موسم معتدل ہو تو لباس و مکان اس قدر ضروری نہیں کہ اگر میسّر نہ آسکیں تو جان پر آبنے اور صحت خراب ہوجائے۔ جب بارش نہیں ہوتی اور سردی نہیں پڑتی تو بہت سے محتاج اور مفلس ہمارے قصبوں اور شہروں کی سڑکوں کے کنارے اور دھرم شالوں، مسافر خانوں کے پختہ چبوتروں پر خواب راحت کا وہ لطف اٹھاتے ہیں جو امرا کو نرم بستروں پر خواب میں بھی میسّر نہیں آسکتا، ان کو نہ بچھونے کی ضرورت نہ اوڑھنے کی۔ وہی ایک کپڑا جو جسم ڈھانکے ہوئے ہے ہر حال میں کافی۔ غریب لوگ

بھی مکان اور لباس میں زیادہ صرف کرنے پر مجبور نہیں۔ دھوتی کرتا اور ٹوپی
وہ بھی ادنی نہیں بلکہ سستے گاڑھے مارکین کی ہمارے مزدوروں کا ضروری لباس
اور ایک چھوٹا سا چھپر کا کچا مکان اس کی آرامگاہ ہے۔ جوتا وہ صرف بیاہ شادی
یا عید یا تیوہار میں پہنتا ہے، مگر چونکہ محض تکلف ہے، راستے بھر ہاتھ میں لٹکا کر
لے چلتا ہے اور صرف منزل مقصود کے قریب اس کو پاؤں میں ڈال لیتا
ہے۔ سرد ملکوں کی حالت اس سے مختلف ہے، وہاں غربا جن کا کوئی
ٹھکانا نہیں اپنی بھیک میں سے کم از کم ایک پیسہ بچا لیتے ہیں، تاکہ کرایہ دیکر
کسی پینی بیڈ میں رات بسر کر سکیں، ورنہ شدت سردی سے ٹھٹھر کر مرجانا
یقینی ہے۔ اب ان پینی بیڈوں کی کیفیت سنئے! یہ عموماً زمین دوز کوٹھریاں
یا تہ خانے ہوتے ہیں جن میں پیال کے مثل کوئی گھانس بچھی ہوتی ہے، اکثر میں
بخوف سردی ہوا کی آمد و رفت کیواسطے کافی دریچے بھی نہیں ہوتے۔ تمام کو
صدہا غریب پینی بیڈوں میں کھچا کھچ بھر جاتے ہیں: بوڑھے، بچے، جوان، مرد
اور عورت کی کوئی تفریق نہیں ہوتی۔ سب اسی گھاس پر پال کے آموں
کی طرح ایک دوسرے سے بھڑے ہوئے سو رہتے ہیں، اور صبح کو پھر منتشر
ہو جاتے ہیں۔ خیال کرو کہ ہمارے ملک کے غربا کی رات بمقابلے انکے کس قدر
راحت سے کٹتی ہے اور اس فرق کا باعث آب و ہوا اور موسم نہیں تو کیا
ہے۔ اب مزدور کا حال سنئے کہ تمام جسم کو گرم ادنی لباس سے ڈھانکنا اس کیواسطے
لازمی ہے؛ نہ صرف جوتا بلکہ ادنی موزے بھی سردی سے محفوظ رہنے کیواسطے ضروری
ہیں۔ مکان بھی اس قدر پختہ ہونا چاہئے کہ برف باری کا مقابلہ کر سکے اور
سرد ہوا کو پورے طور پر روکے۔ غرضکہ لباس و مکان جن کا صحت سے
قریبی تعلق ہے آب و ہوا اور موسمی حالت کے مطابق ہوتے ہیں؛ کہیں وہ
ضروری ہوتے ہیں اور کہیں راحت کا سامان خیال کئے جاتے ہیں؛ کہیں ان پر
کمائی کا معقول حصہ صرف کرنا پڑتا ہے، اور کہیں بہت کم۔ لیکن ہر ملک کی
ضروریات کے مطابق کافی مکان و لباس ملنا کارگزاری کیواسطے ضروری
ہے۔ اگر کمی ہوگی تو صحت میں کمی، نشو و نما ادھوری اور کارگزاری ادنی درجے کی

ہو جائے گی۔

(د) امنگ، آزادی اور سیاحت بھی کارگزاری کے لئے از حد موزوں و موافق ہیں۔ امنگ تو تمام ترقی کا منبع ہے۔ آزادی کام کو آسان اور خوشگوار بنا دیتی ہے، نفسیات سے ثابت ہے کہ آدمی جو کام شوق سے کرتا ہے اس میں تکان بہت کم ہوتی ہے؛ چنانچہ تفریح کھیل کود اور مزدوری کے کاموں کا طبیعت پر مختلف اثر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ بطور چہل قدمی چار میل جانا اتنا گراں نہیں گزرتا جتنا کہ کسی ضروری کام سے دو میل جانا۔ غلام جو کوڑے کے ڈر سے کام کرتا ہے اور آزاد مزدور جو کمائی کے شوق میں جان کھپاتا ہے ان کی کارگزاری میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ رہی سیاحت، اس سے اول تو معلومات میں اضافہ، خیالات میں وسعت اور حوصلے میں بلندی پیدا ہوتی ہے؛ ہر قسم کے حالات آنکھ سے دیکھ کر انسان بُرائی بھلائی اور ان کے اسباب سمجھنے لگتا ہے۔ چنانچہ سفر تعلیم کا لازمی جزو مانا جاتا ہے؛ انسان کتنا ہی کتابی علم حاصل کرے جبتک سفر کے تجربوں اور مشاہدات سے اپنے علم کی تصدیق اور اصلاح نہیں کریگا اسکی تعلیم ناقص رہیگی اور وہ تالاب کے مینڈک سے کچھ زیادہ بہتر نہ ہوگا۔

دوسرے ایک عجیب بات یہ ہے کہ وطن میں انسان کی ہمیشہ نسبتاً کم قدر کی جاتی ہے۔ ہندی مثل ہے "گھر کا جوگی جوگنا اور آن گاؤں کا سدھ" اسی مضمون کی ضرب المثلیں تقریباً دنیا کی ہر زبان میں موجود ہیں، جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ انسان کا عام تجربہ ہے اور کسی ملک و قوم کی خصوصیت نہیں۔ احباب و اعزا پر قابلیت و کمال کا اثر اور رعب اتنا نہیں پڑ سکتا جتنا کہ اغیار اور ناواقف لوگوں پر؛ چنانچہ بالعموم بڑے بوڑھے ترقی یافتہ نوجوانوں کو جتایا کرتے ہیں کہ "تم پڑھ لکھ کر قابل بن گئے تو اوروں کے لیے ہماری نظر میں تو وہی ہو جو بچپن میں تھے، تمھارے بھولے پن اور ناسمجھی کی باتیں سب یاد ہیں"۔ دوست احباب کو بھی ترقی و امتیاز کا اثر ناگوار معلوم ہوتا ہے اور وہ بھی کسی کا قدیم سطح سے بلند ہونا کم از کم اپنے مقابلے میں ناپسند کرتے ہیں۔ ان وجوہ سے

قابل آدمی اپنے وطن میں زیادہ نہیں ابھر سکتا اور غیر جگہ ترقی کرتے کرتے کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے۔ وکیل، طبیب سے پیشہ ور جن کو حسن ظن اور رعب کی ضرورت ہوتی ہے، ہمیشہ وطن سے دور جا کر کامیاب ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہر شہر اور قصبے کی معزز پیشہ ور جماعتوں میں سر برآوردہ لوگ اکثر باہر والے ہوتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ اگر وطن میں بھی ان کو یہی ترقی و امتیاز نصیب ہو سکتا تو احباب و اعزا کو چھوڑ کر دور کیوں جاتے۔ سفر کے متعلق عربی کے مشہور مقولے ہیں "السفر وسیلۃ الظفر" "السفر کالسقر" انقلاباتِ زمانہ سے سفر نے ظفر کے تو صدہا نئے راستے نکال لئے اب وہ سقر نہیں رہا اور حضر سے بدرجہا لطف اور راحت میں بڑھ گیا؛

(۲) عام معاشرتی اور اخلاقی حالت کا بھی کارگزاری پر نہایت اہم اثر پڑتا ہے۔ صحبت کا اثر مشہور ہے "خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے" اور پھر بچوں کی طبیعت موم کی طرح نرم ہوتی ہے، جس سانچے میں چاہو ڈھال لو۔ پس جس فرقے کا طرز معاشرت ہمت افزا اور جہد پرور ہے، وہ لوگ بالعموم بلند خیال، عالی حوصلہ اور مرفہ الحال ہوتے ہیں۔ چنانچہ تجارتی مرکزوں کے مصروف کار اور پسماندہ قصبوں کے کاہل پسند باشندوں کی حالت کے موازنے سے معاشرت کا اثر بخوبی واضح ہوتا ہے۔ ہندوستان کے سکون پسند نو وارد کو انگلستان کی ہلچل سب سے زیادہ حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے، جسے دیکھو چیونٹی اور شہد کی مکھی کے مانند اپنے کام میں پوری تندہی اور توجہ سے مصروف ہے، لمحہ لمحہ جان سے زیادہ عزیز ہے۔ ہفتے میں ایک روز اتوار کا آرام کے واسطے مخصوص اور اس روز کاروبار قانوناً ممنوع ورنہ کام کے شوق میں لوگ صحت کو کھو بیٹھتے۔ ہندوستان میں اس گرم جوشی کا عشر عشیر بھی نظر نہیں آتا اور نو وارد یورپین کو یہاں کی سہل انگاری، افسردہ دلی اور وقت کی ناقدری کچھ کم عجیب نہیں معلوم ہوتی۔ اور کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ شہر شہر اور قصبے قصبے میں بہبودی کی امنگ اور کاروبار کا شوق پیدا ہونا ہندوستان کی ترقی کا پہلا زینہ ہے؛

(۳) اس زمانے میں ہر قسم کے کام اور پیشوں کے واسطے تعلیم کس قدر ضروری ہے اور ہوتی جاتی ہے۔ ہر ایک سمجھدار آدمی خود اندازہ کر سکتا ہے۔

افراد کیا ہیں جسم قوم کے بیشمار اعضا، اور ہر عضو کا کام جداگانہ مخصوص ہے۔ اگر کسی عضو کو معطل کیا جائے یا اس کے مخصوص کام کے عوض اُس سے دوسرا کام لینے کی کوشش کی جائے تو ممکن نہیں کہ جسم قوم کی صحت و قوت کو مضرت نہ پہنچے۔ کیونکر ممکن ہے کہ سب۔ آدمی زبان دان، مؤرخ، فلسفی، مہندس، طبیب، یا عالم الٰہیات بن جائیں، اور اگر ایسا ہو تو اس کا نتیجہ نظام عالم کی درہمی و برہمی نہیں تو اور کیا ہے؟ بہت سے بدقسمت نوجوان اپنا قیمتی وقت اور بہت سا روپیہ مروجہ تعلیم میں ضائع کرکے ناکام و نامراد رہجاتے ہیں۔ لیکن ان میں بہت سے صنعت و حرفت کے واسطے ایسی موزوں طبیعت اور اس قدر وافر استعداد رکھتے ہیں کہ اگر ان کو **ٹکنیکل تعلیم** (صنعتی تعلیم) میسر آسکتی تو بہت بڑی کامیابی اور نام و نمود حاصل کرتے۔ کون انکار کرسکتا ہے کہ یورپ کا عروج و اقتدار، ادنیٰ مزدوروں، صناعوں، پیشہ وروں، اور تاجروں کی کارگزاری کا نتیجہ ہے۔ یہی وہ طبقے ہیں جو بجا طور سے قومی پشت و پناہ کہلاتے ہیں، حکومت اور سوسائٹی میں ان کا روز افزوں رسوخ و احترام ان کی اہمیت کا بدیہی ثبوت ہے۔ لیکن ہمارے طریق تعلیم میں ان ضروریات کو خدا جانے کیوں اسقدر نظر انداز کیا گیا ہے۔ **لبرل تعلیم** (غیر صنعتی تعلیم) تو بھلی بُری میسر آبھی جاتی ہے، لیکن ٹکنیکل تعلیم بیحد نایاب ہے۔

حاصل کلام یہ کہ محنت کے مسائل بہت اہم اور وسیع ہیں۔ ملک کی گوناگوں ترقیات پر ان کا بہت نمایاں اثر پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہر ملک ان مسائل کو سمجھنے اور سلجھانے میں ہمہ تن معروف ہے۔

باب ہفتم

اصل

(۱) اصل و دولت کا فرق (۲) پیدائش اصل کی شرط (۳) افزونیٔ اصل کے اسباب (۴) اصل کے خواص (۵) اصل کے اقسام۔

اصل و دولت کا فرق

۱- اصل کی پیدائش اور کارگزاری کا مختصر حال عاملان پیدائش کی بحث میں بیان ہو چکا ہے، لیکن تھوڑی سی مزید تشریح یہاں بھی ضروری معلوم ہوتی ہے بلحاظ ماہیت اصل و دولت میں کوئی فرق نہیں، دونوں ایک ہی چیزیں ہیں لیکن بلحاظ طریق استعمال انمیں بہت بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ جب کسی چیز کو ہم عامل پیدائش بنائیں یعنی اس کو اسطرح پر کام میں لائیں کہ اس سے مزید دولت پیدا ہو تو وہ اصطلاحاً اصل کہلاتی ہے۔ اور اگر اسی چیز کو ہم ما حصل پیدائش مانیں اور اسطرح پر صرف کریں کہ بجائے مزید دولت پیدا ہونیکے اس سے ہماری کوئی احتیاج پوری ہو تو وہ دولت کہلائیگی: مثلاً رہنے کا مکان دولت ہے، لیکن اگر اس میں کوئی کارخانہ چلایا جائے یا وہ کرایہ پر دیدیا جائے تو اصل ہو جائیگا۔ اسی طرح کرایہ پر چلنے والی گاڑی اصل شمار ہوتی ہے اور سیر و تفریح کی گاڑی دولت۔

لیکن نہ صرف دولت کی وسعت مفہوم کی وجہ سے اصل کا تعین دشوار ہے، بلکہ یہ سوال بھی کہ مزید دولت کی پیدائش میں علاوہ زمین و محنت کے کونسی چیزیں معاون ہیں، فی الحقیقت اسقدر مبہم ہے کہ اس کا کوئی قطعی جواب ناممکن ہے۔ چنانچہ ایک گروہ نے تو یہ تفریط کی کہ صرف آلات، پیداوار خام، اور زر نقد کو جو اجرت میں صرف ہو اصل قرار دیا کیونکہ پیدائش سے ان ہی تین چیزوں کا نہایت قریبی تعلق ہے۔ دوسرا گروہ افراط پر اسقدر جھکا کہ اس نے دولت اور اصل کو مرادف قرار دیدیا: کیونکہ انسان جس قدر چیزیں استعمال کرتا ہے وہ بر رشتۂ قریب یا بعید پیدائش دولت میں ضرور مدد دیتی ہیں: مثلاً خوراک، لباس، مکان اور دوسری ضروریات قیام صحت و قوت کیواسطے لازمی

حصۂ دوم
باب ہفتم

ہیں اور صحت و قوت محنت کیواسطے ضروری - لہٰذا مذکورۂ بالا چیزیں بھی بالواسطہ پیدائش دولت میں معین ہونے کی وجہ سے اصل میں شامل ہیں لیکن تیسرے اعتدال پسند گروہ نے افراط و تفریط دونوں کو ترک کر کے یہ فیصلہ کیا کہ اصل کے معنی کو صرف ان چیزوں تک محدود کرنا جن کا پیدائش سے بہت قریب کا تعلق ہے، یا اسقدر وسعت دینا کہ تمام دولت داخل ہو جائے دونوں غلط اصول ہیں۔ گو اصل کا مفہوم اسقدر متحقق اور متعین نہیں ہو سکتا کہ اصل اور غیر اصل دولت کی کوئی کامل فہرست تیار ہو سکے لیکن جو چیزیں عرف عام کے مطابق پیدائش دولت میں شریک مانی جائیں ان کو اصل اور باقی کو دولت شمار کرنیکا اصول ہماری عملی ضروریات کے واسطے کافی طور پر ہدایت کر سکتا ہے ؛

اصل و دولت میں ایک فرق یہ بھی قرار دیا گیا ہے کہ اگر کسی چیز کے استعمال سے کچھ آمدنی ہو تو وہ اصل ہے ورنہ دولت۔ لیکن آمدنی کے معنی میں وہی عدم تعین کی دقت پیش آتی ہے، اگر آمدنی صرف مادی معاوضے تک محدود کیجاتی ہے تو اصل کا مفہوم نہایت تنگ ہو جاتا ہے، اگر ہر قسم کا معاوضہ شامل کرتے ہیں تو پھر اصل و دولت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ اس حالت میں بھی سب سے بہتر طریقہ یہی ہے کہ آمدنی سے مراد وہ کل معاوضے لینے چاہئیں جو عرف عام کے مطابق آمدنی کہلا سکیں، اور جن چیزوں کے کام میں لانے سے ایسی آمدنی حاصل ہو وہ اصل ہیں باقی دولت۔ اصل و دولت کے فرق کی بحث بھی اسی واقعے کی مثال ہے کہ جو علوم انسان کے افعال ارادی سے بحث کرتے ہیں ان کے اصول کبھی پورے طور پر مقرر اور متعین نہیں ہو سکتے، کم و بیش کسر ضرور باقی رہتی ہے۔ اور اخلاقی، معاشرتی اور معاشی مسائل پر جو اسقدر اختلاف رائے کی کثرت ہے اس کا باعث یہی عدم تعین ہے ؛

گو کوئی قطعی معنی تحقیق نہ ہو سکے لیکن اتنا ضرور معلوم ہو گیا اور ہماری ضرورت کیواسطے اتنی معلومات کافی ہے کہ اصل و دولت میں صرف اتنا فرق ہے کہ ایک عامل پیدائش مانا جاتا ہے اور مزید دولت پیدا کرتا ہے۔ دوسرا حاصل پیدائش ہوتا ہے اور ہماری احتیاجیں پوری کرتا ہے۔ ایک ہی چیز مختلف اوقات میں حسب طریق استعمال اصل و دولت دونوں ہو سکتی ہے ؛

پیدائش اصل کی شرط

۲- عاملین پیدائش کے بیان میں یہ تو واضح ہو چکا کہ اصل زمین و محنت کے اتفاق عمل کا نتیجہ ہے، گویا ان سے پیدا ہوتا ہے۔ لیکن جسقدر دولت پیدا ہو اگر کل صرف

باب ہفتم

کر دی جائے تو کچھ نہ بچیگا اور باوجود اتفاقِ عمل زمین و محنت اصل پیدا نہ ہوسکیگا۔ اسکی مثال بعینہٖ یہ ہے کہ بچہ انڈے سے اور انڈا جوڑے کے اتفاق عمل سے پیدا ہوتا ہے پس اگر انڈا کھالیا جائے تو باوجود جوڑے کے اتفاق عمل کے بچہ پیدا نہ ہوسکیگا۔ گویا جو انڈا کھالیا جائے وہ محض دولت ہے اور جس کو سے کر بچہ نکالا جائے وہ اصل ہے۔ پس ظاہر ہے کہ پس اندازی بغیر اصل کا پیدا ہونا ممکن نہیں اور یہ ایسا صریح واقعہ ہے کہ کوئی اس سے ناواقف نہیں۔ آمدنی بچا بچا کر لوگ جائداد خریدتے ہیں، کارخانے چلاتے ہیں، تجارت کرتے ہیں، اگر کل کمائی ضروریات میں صرف کر دی جائے اور کچھ پس انداز نہ ہو تو ان میں سے ایک چیز بھی میسر نہیں آسکتی۔ پس ثابت ہوا کہ زمین اور محنت کا اتفاق عمل اصل کا منبع اور پس اندازی پیدائش اصل کی شرط لازمی ہے:

افزونیٔ اصل کے اسباب

۳۔ اصل کی ماہیت اور پیدائش کا حال بیان کرنے کے بعد یہ بتانا ضروری ہے کہ افزونی اصل کیواسطے مساعد حالات کیا ہیں۔ بالفاظ دیگر اصل کیونکر کسی ملک میں بڑھتا ہے:

(الف) پس انداز کی مقدار آمد و خرچ کی باہمی نسبت سے متعلق ہوتی ہے۔ محض آمد کی زیادتی یا خرچ کی کمی سے جداگانہ کچھ نتیجہ پیدا نہیں ہوتا۔ جس شخص کی آمد و خرچ حسب ترتیب ایک ہزار اور نو سو روپے ہو، وہ صرف سو روپے بچا سکتا ہے حالانکہ پانسو روپے آمدنی والا تین سو روپے کے خرچ سے اپنے سے دوگنی آمدنی والے سے دوگنا پس انداز کرتا ہے:

محض بچت کے لالچ سے ضروریات جائز کو بھی نظر انداز کر کے دولت اندوزی زندگی کا مقصد قرار دینا ہرگز پسندیدہ اور قرین عقل نہیں۔ ایسی کفایت شعاری نہ صرف عقلاً و اخلاقاً مذموم ہے بلکہ کارگزاری گھٹا کر معاشی لحاظ سے بھی سخت مضر ہے، اور بالآخر خود افزائش اصل میں مانع ہوتی ہے۔ تخفیفِ مصارف کسی حالت میں قیام و ترقی کارگزاری کی مانع نہ ہونی چاہئے ورنہ خود مطلب کا فوت ہونا یقینی ہے۔ لیکن تمام دولت کو محض عشرت پرستی پر لٹانا اس سے کہیں زیادہ معیوب اور قابل اعتراض ہے۔ اعتدال ہر حالت میں بہتر ہے:

اس معاشی شعبے کی مناسب اصلاح اور ترمیم سے بڑے بڑے کام نکل سکتے ہیں۔ ہر قوم کی معاشرت کا معیار کچھ مقرر سا ہوتا ہے، اگر کوئی معیار سے بالاتر

چڑھے تو امتیاز و وقعت پاتا ہے؛ لیکن اگر اس سے نیچے گرے تو سبکی اور تحقیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ افلاس کی مجبوری سے اس ذلت کو گوارا کیا جاتا ہے؛ یا مصلحان قوم جن کے اعلیٰ خیالات رواج کے اثر سے بالاتر ہیں عمدہ مثال قائم کرنے کی غرض سے باوجود بیش قرار استطاعت کے مروجہ معیار سے تنزل کرتے ہیں۔ مگر عوام میں اتنی اخلاقی جرأت کہاں کہ وہ برائے نام ذلت کو برداشت کر سکیں؛ جبتک دم میں دم رہے تباہی کی حد تک رسم و رواج کا ساتھ دیتے ہیں۔ چنانچہ بہت سے متوسط الحال شرفا کی خستہ حالی کا باعث شادی و غمی کی رسمیں ہوتی ہیں ؛

قصہ مختصر افزونی اصل کی پہلی شرط یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے مقدار پیداوار بڑھائی جائے اور مصارف حدّ مناسب کے اندر رکھے جائیں۔ افزائش پیداوار کے وسائل تو بکثرت اس کتاب میں جابجا مذکور ہیں؛ اور تحدید مصارف کی ترکیب؛ درستیٔ معاشرت اور اصلاح رسوم ہے ؛

(ب) اضافۂ اصل کی دوسری شرط امن و حفاظت ہے۔ پس انداز کرنے والے کو یہ اطمینان ہونا ضروری ہے کہ اس کا اندوختہ اس سے بجبر نہیں چھینا جائیگا؛ وہ اس کا مالک رہیگا اور حسب دلخواہ اس سے کام لے سکیگا۔ بدامنی کے زمانے میں ہر ایک کا عملدرآمد یہی ہونا چاہیئے کہ "ہر چہ داری بخور امروز غم فردا مخور"۔ برعکس اس کے جن ملکوں میں امن و امان کا تسلّط ہے وہاں مستقبل بعید کے واسطے بھی اہتمام پیش نظر رہتا ہے۔ اسی طرح سپاہی اور ملّاح جن کا پیشہ ہی جانبازی ہے فضول خرچی کیواسطے ضرب المثل ہیں۔ اور جو لوگ غیر مخدوش کاموں میں معروف ہیں بالعموم کچھ پس انداز کرتے رہتے ہیں؛ یہ واقعہ فطرت انسانی پر مبنی ہے اور ہر جگہ اس کی مثال موجود ہے؛ چنانچہ انگلستان میں موجودہ کثرت اصل کا بڑا باعث یہ بھی ہے کہ وہاں صدہا برس سے کوئی خانہ جنگی نہیں ہوئی۔ اور چونکہ بہت قدیم زمانے سے کم و بیش آئینی حکومت چلی آتی ہے لوگوں کا اندوختہ شاہی دستبرد سے بھی محفوظ رہا۔ سرمایے کی ضبطی کا خدشہ لوگوں کے دل سے قطعاً محو ہو گیا اور اطمینان کی بدولت اصل میں دن دوگنا رات چوگنا

اضافہ ہونے لگا۔ حتی کہ آج انگلستان کا اصل دنیا پر محیط نظر آتا ہے؛
انسان بالطبع امتیاز کا شائق ہے اور ہر ملک و قوم میں وسائل امتیاز مختلف پائے جاتے ہیں۔ کہیں جرائت، بہادری اور جسمانی طاقت کا دور دورہ ہے؛ مثلاً عرب، ٹرکی اور افغانستان یا روہیلکھنڈ اور پنجاب میں؛ کہیں علم کا جھنڈا لہلہا رہا ہے؛ جیسے جرمنی، فرانس، امریکہ اور انگلستان یا بنگال میں؛ اور کہیں دولت کا سکہ رواں ہے؛ جیسے یورپ، امریکہ، بمبئی، یا من حیث القوم یہودیوں، مارواڑیوں اور بوہروں میں۔ لیکن بالعموم ترقی و استحکام امن و امان کا خاصہ ہے کہ پہلے امتیاز کے مقابلے میں دوسرے کا اثر قوی کرتا ہے۔ یورپ و امریکا میں تو تجارت کے اقتدار کا ذکر کیا ہے خود ہندوستان میں اس طبقے کا رسوخ ہر طرف بکثرت پھیل رہا ہے۔ اہل قلم و اہل سیف جو اب تک تجارت کو بنیوں کا ادنی کام خیال کرتے تھے، اب اس کے روز افزوں اقتدار سے چونک کر حیران و ششدر نظر آتے ہیں۔ میونسپلٹی سے لیکر امپیریل کونسل تک تمام نیابتی انجمنوں میں؛ قومی جلسوں اور کانفرسوں میں؛ ملکی بہبودی کے تمام منصوبوں اور تجویزوں میں؛ پبلک اور سرکاری حلقوں میں؛ غرضکہ ہر طرف دولت کا رسوخ پیش پیش اور غالب نظر آتا ہے۔ ایسے حالات بھی جو امن و امان کے نتیجے ہیں، اضافۂ اصل کے بیحد معاون ہیں؛

(ج) اصل سے کام لینے اور فائدہ اٹھانے میں جو آسانیاں پیدا ہورہی ہیں ان کا اثر بھی اضافۂ اصل پر قابل لحاظ پڑ رہا ہے۔ گو دفینہ بھی اڑی پر کام آتا ہے اور اس کی یہی صفت پس اندازی کے واسطے کافی سفارش ہے؛ لیکن اگر اندوختہ سے کچھ فائدہ بھی حاصل ہوسکے تو کیا اچھا ہو؛ مصرع چہ خوش بود کہ بر آید بیک کرشمہ دو کار۔ اس زمانے میں ہر شخص کارخانوں اور تجارت کے بکھیڑوں میں پڑے بغیر بذریعۂ شراکت اصل اپنے اندوختہ سے بلا دقت و اندیشہ کافی نفع اٹھا سکتا ہے۔ چنانچہ ریلوں، بنکوں اور کمپنیوں کے حصے خرید کر اندوختہ سے فائدہ اٹھانے کا عام رواج ہو چلا ہے۔ غریب مزدوری پیشہ لوگ بھی چند روپے سیونگ بنک میں جمع کر کے نہ صرف اندوختہ کی نگہداشت سے سبکدوش ہو جاتے ہیں بلکہ حسب قواعد کچھ سود بھی پاتے ہیں۔

سیونگ بنکوں کی روز افزوں ترقی سے ثابت ہے کہ پس اندازی کی عادت غربا اور مزدوروں میں بھی پیدا ہو رہی ہے ؛

(ج) انسانوں کے فطری خواص کو بھی افزونیٔ اصل میں بہت بڑا دخل ہے۔ پس اندازی کی طاقت قوتِ متخیلہ اور قوتِ ارادی پر منحصر ہے۔ نہ صرف مستقبل قریب بلکہ بعید کی احتیاجات کا پورا پورا اندازہ کرنا اور انکی بہم رسانی کے واسطے موجودہ احتیاجات میں ترمیم کر کے پس انداز کرنا، یہ دو قوتیں سب میں یکساں نہیں پائی جاتیں۔ بعض لوگ جو کوتہ بین کہلاتے ہیں مستقبل کو صاف طور پر دیکھنے سے فطرۃً معذور ہوتے ہیں؛ حاضر کے سوا انکو کچھ نظر نہیں آتا۔ بعض لوگ دور بین تو ہوتے ہیں لیکن انکی قوتِ ارادی اسقدر قوی نہیں ہوتی کہ موجودہ احتیاجات کی جو بوجہ قرب کے زیادہ دلکش ہوتی ہیں اصلاح کر کے کچھ بچا سکیں۔ اس کمزوری کے اسباب اخلاقی لحاظ سے اچھے برے دونوں قسم کے ہو سکتے ہیں، مثلاً تن پروری عیش پرستی، یا سخاوت و فیاضی۔ لیکن معاشی طور پر افزائش اصل میں اس سے رکاوٹ ضرور پیدا ہوتی ہے ؛

پس اندازی کی مذکورۂ بالا طاقت کے محرک ذاتی اغراض اسقدر نہیں ہو سکتے جتنا کہ اولاد کی محبت یا ترقی یافتہ ممالک میں قوم پرستی۔ معاشی دنیا میں جن لوگوں نے جھنڈے گاڑے ہیں اور جن کا آج ڈنکا بج رہا ہے، انھوں نے ملک اور قوم کی ترقی و اقتدار کی خاطر سے یہ سب کارگزاریاں دکھائی ہیں۔ بعض اپنی زندگی کے واسطے وہ اسقدر جد و جہد ہرگز برداشت نہیں کرتے۔ ہر کوئی صاحب اولاد اپنے دل سے دریافت کر سکتا ہے کہ پس انداز کرنے کی بڑی غرض اولاد کے مستقبل کی بہبودی ہوتی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ قوتِ متخیلہ اور قوتِ ارادی پس اندازی کے دست و پا اور دوسروں کی محبت و خیر طلبی اس کی زبردست محرک ہوتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ معاشرتی اور معاشی حالات ان خواص کو قوی اور ضعیف کر دیتے ہیں لیکن بایں ہمہ ان کا جداگانہ اثر قابل لحاظ ہوتا ہے ؛

حاصل کلام یہ ہے کہ پیدائش اصل کے واسطے زمین و محنت کا اتفاقِ عمل لابدی اور پس اندازی شرط لازمی ہے۔ پس اندازی کی مقدار آمد و خرچ کی باہمی نسبت، ملکی

حصہ دوم
باب ہفتم

امن و امان، حصول منفعت کی آسانی اور فطری خواص سے کم و بیش متعلق ہے ؛

اصل کے خواص۔

۴ - (ا) یوں تو ہر چیز حتیٰ کہ کرۂ ارض کی بھی ایک حد ہے۔ لیکن اصل کی مقدار اس معنیٰ میں محدود اور معین نہیں کہی جا سکتی جس معنیٰ میں زمین کہی جاتی ہے کہ اسکی مقدار بڑھ ہی نہ سکے۔ اصل میں اضافے کی بہت گنجائش ہے، چنانچہ واقعہ ہے کہ اصل کی مقدار بہ نسبت سابق صدہا گنی ہو گئی ہے اور برابر بڑھ رہی ہے ؛

(ب) زمین کی قوتِ پیدائش قدرت نے معین کر دی ہے۔ محنت بھی ایک حد تک قوانین قدرت کی پابند ہے۔ کچھ عرصے میں تھک کر انسان کام چھوڑنے پر مجبور ہو جاتا ہے لیکن اصل سب سے زیادہ آزاد ہے اور اسکی قوتِ پیدائش بھی دوسرے عاملوں سے زیادہ ہے۔ اصل سے سالہا سال دن رات برابر عمل پیدائش جاری رکھا جا سکتا ہے حتیٰ کہ وہ فرسودہ ہو کر بیکار ہو جاوے۔ یہ کچھ تعجب کی بات نہیں، خود دنیا فانی ہے ؛

(ج) زمین تو قطعاً غیر منقولہ ہے جس کی وجہ سے اسکی قدر و قیمت میں حسب موقع زمین آسمان کا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ محنت منقولہ مگر مزدور کی ذات سے لاینفک، نتیجہ شرح مزدوری میں اختلاف ہے لیکن اصل پانی کی مانند سیال، جہاں ضرورت ہوئی فوراً پہنچ گیا، شرح سود میں کوئی قابل لحاظ فرق ممکن نہیں۔ یہ جو کمپنیوں اور بنکوں کی شرح سود میں تین فی صدی سے لے کر عموماً دس بارہ فی صدی تک اختلاف پایا جاتا ہے، محض سطحی دھوکا ہے۔ اس کی اصلیت تقسیم دولت کے بیان میں واضح کی جائے گی ؛

اصل کے اقسام۔

۵ - معاشیئین نے یوں تو کئی اصول پر اصل کی مختلف قسمیں قرار دی ہیں، لیکن ان سب میں مل کی تقسیم خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ مل نے دو قسمیں قرار دیں: اصل دائر و اصل قائم۔ جو اصل عمل پیدائش میں اوّل ہی مرتبہ اپنا کام پورا کرے وہ اصل دائر کہلاتا ہے: مثلاً پیداوار خام، تیل، کوئلا، اور اُجرت جو مصنوعات کے بنانے میں صرف ہو؛ اور جو اصل عمل پیدائش میں عرصے تک اپنا کام سر انجام دیتا رہے وہ اصل قائم کہلاتا ہے۔ مثلاً انجن، مشین، آلات اور عمارت کارخانہ

جو ایک مرتبہ مہیا ہو نے پر عرصے تک مصنوعات کی پیدائش میں مدد دیتے رہتے ہیں ؛

اصل دائرو قائم کی تفریق میں ایک خاص اہمیت مُضمر ہے جس کو ہم مختصراً واضح کئے دیتے ہیں۔ فرض کرو جوتے کی دو فیکٹریاں ہیں، ایک میں نسبتہً اصل دائر کی مقدار بہت زیادہ ہے، دوسرے میں اصل قائم کی۔ اب اگر جوتے کی تجارت سرد ہوکر مقدار منافع بہت گھٹ جائے تو پہلی فیکٹری اس سرد بازاری کی متحمل نہ ہوسکیگی اور غالباً کاروبار بند کرنے پر مجبور ہوگی۔ لیکن دوسری فیکٹری ان حالات نامساعد میں بھی کام جاری رکھ سکیگی اور ایسا کرنا بالکل غیر مفید بھی نہ ہوگا۔ وجہ غور کرنے سے سمجھ میں آسکتی ہے: اصل دائر میں تو جلد جلد گرہ سے خرچ کرنا پڑتا ہے، اور جب نقصان کا اندیشہ صریح ہو تو بھلا کون اپنا روپیہ خطرے میں ڈالے گا! لیکن اصل قائم میں ایک مرتبہ روپیہ لگتا ہے اور مدتوں وہ اصل کا کام دیتا ہے۔ جب ایسا اصل موجود ہو تو اس کو بیکار ڈالنے سے کیا فائدہ، اگر تھوڑے مصارف نقد یعنی اصل دائر پر بھی کچھ منافع ملتا رہے، تو اصل قائم کا منافع نظرانداز کرکے کاروبار جاری رکھنا بہتر ہوگا، مثل مشہور ہے "نہ ہونے سے بیگار بھلی"۔ علاوہ اس کے ایسے زمانے میں جبکہ دوسری مقابل کی فیکٹریاں بند ہوں، کاروبار سے حیثیت اور ساکھ بڑھنے کی اُمید ہوسکتی ہے۔ اور اسی دوران میں جبکہ میدان خالی ہو عمدہ تجارتی تعلقات پیدا کرنے کا اچھا موقع ملتا ہے۔ اگر دونوں فیکٹریوں کی اصل دائرو قائم کی مقدار حسب ترتیب دس ہزار و چار ہزار اور چار ہزار و دس ہزار ہے اور کم سے کم قابل لحاظ شرح منافع ۲ فی صدی ہو تو دونوں فیکٹریاں کم از کم اصل دائر پر بشرح مذکور حسب ترتیب دو سو روپے اور اسی روپے منافع تک بحالت مجبوری کام جاری رکھ سکتی ہیں۔ گویا بمقابلہ فیکٹری اول فیکٹری دوم کمتر مقدار منافع پر کام کرنے کی قوت رکھتی ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ دوسری بھی عرصۂ دراز تک ان ناموافق شرائط پر کام نہیں چلا سکتی۔ البتہ دو چار مہینے کی عارضی کساد بازاری جس استقلال سے یہ برداشت کرسکتی ہے پہلی نہیں کرسکتی ؛

اصل کی مذکورۂ بالا تقسیم سے معاشی مباحث میں اور بھی جا بجا کام لیا گیا ہے جس کی حسب موقع ہم آئندہ تشریح کریں گے ؛

باب ہشتم

طریق پیدائش

(۱) اصولِ تقسیمِ عمل کی تشریح (۲) تقسیمِ عمل کے فوائد (۳) تقسیمِ عمل کی مضرت (۴) مشین کا رواج (۵) مشین کے فوائد (۶) مشین کا اثر مزدوروں پر (۷) پیدائش بر پیمانۂ صغیر و کبیر (۸) پیدائش بر پیمانۂ کبیر کے فوائد (۹) کفایتِ داخلی و خارجی (۱۰) قوانین تکثیر حاصل و استقرار حاصل (۱۱) تحصیر صنائع (۱۲) صنائع تضمینی و تضیمی (۱۳) کمپنیاں (۱۴) آجر و مستجیر اور تخمین و مخمن۔

اصولِ تقسیم عمل کی تشریح

۱۔ اصولِ تقسیمِ عمل کوئی جدید تحقیق نہیں، ہزارہا سال سے انسان کا اس پر عملدرآمد چلا آتا ہے۔ وحشی قوموں میں بھی اس کا برابر رواج ہے، البتہ اتنا فرق ہے کہ متمدن اقوام میں تہذیب و ترقی کی بدولت اس اصول کا دائرۂ عمل نہایت وسیع ہوتا جاتا ہے۔ اس اصول کا اثر اول اول پیشوں پر پڑا جیسے کھیتی کرنا، کپڑا بننا، جوتا سینا اور ایسے ہی ضروری کام مختلف لوگوں نے جداگانہ اپنے اپنے ذمے لے لئے، اور کسان، جلاہے، موچی وغیرہ قدیم فرقوں کی بنا پڑی۔ جوں جوں انسان ترقی کرتا گیا، تقسیم عمل کا رواج بھی پھیلتا گیا۔ پیشوں کی تفریق کے بعد ہر پیشے کے کام میں تقسیم شروع ہوئی، اور اس طرح کام سے کام نکلنے لگے، جیسے پیاز کی گٹھی میں پرت کے نیچے پرت نکلتے ہیں۔ کام کی اتنی مختلف اور بیشمار قسمیں ہوگئیں گویا کہ عمل پیدائش کا عالیشان پہاڑ کٹتے کٹتے محض سنگریزوں کا انبار بن گیا۔ کپڑا سینا یا جوتا بنانا جیسا سادہ کام دس دس بارہ بارہ حصوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ کام کا ہر جزو مقررہ لوگوں کے سپرد ہوتا ہے اور سوائے مخصوص جزو کے وہ کسی دوسرے کام کو ہاتھ نہیں لگاتے ؎

کسی ایک چیز پر اپنی تمام تر توجہ اور محنت صرف کرنا تاکہ کمال حاصل ہو اصول تخصیص

حصہ دوم
باب ہشتم

کہلاتا ہے۔ اور اس طریقے سے کمال حاصل کرنے والے اپنے کام کے ماہر کہلاتے ہیں اور ہر ایک ماہر کی رائے اور مشورہ اس کے کام کے متعلق مستند اور قابل ترجیح مانا جاتا ہے۔ اصول تخصیص کا علم تو اور قوموں کو بھی مدت سے تھا چنانچہ "یک در گیر و محکم گیر" اور اسی مضمون کی ہدایات دوسری زبانوں میں بھی موجود ہیں؛ مگر کبھی اس اصول پر اسقدر اہتمام سے عملدرآمد نہیں کیا گیا جیسا کہ کچھ عرصے سے یورپ اور امریکا میں ہو رہا ہے۔ ہمارے ملک کے ہونہار دل و دماغ سے بھی بحر العلوم و عقل کل ہونے کا خبط جلد رفع ہو جانا چاہیئے مصرع "ہر کسے را بہر کارے ساختند" اپنی خداداد استعداد اور قوتوں کا صحیح اندازہ کر کے ہر شخص کو موزوں اور مناسب کام منتخب کر کے اس میں کمال حاصل کرنا چاہیئے تاکہ کوشش کا کوئی خاص نتیجہ نکلے ؛

تقسیم عمل کے فوائد

۳ - (ا) عمل پیدائش کی اعلیٰ تنظیم کی خصوصیت یہ ہے کہ ہر شخص سے پورا پورا کام اور صرف وہی کام لیا جاوے جس کیواسطے وہ موزوں ہے۔ کسی کام کے کل حصے یکساں نہیں ہوتے بلکہ بعض نسبتہً دشوار اور بعض آسان ہوتے ہیں۔ اگر ایسا کل کام کمزور آدمی سے لیا جاوے تو یقیناً خراب ہو جائیگا، اور اگر قوی آدمی سے لیا جائے تو آسان کاموں کے کرنے میں اس کا وقت ضائع ہوگا۔ اس لیے بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہر کام کے دشوار اور آسان حصے جدا جدا کر دیے جائیں، اور ہر مزدور کے مناسب حال کام اس کے سپرد کیا جائے۔ چنانچہ اس طریق سے جو پیشے اب تک محض مردوں سے مخصوص تھے عورتیں اور بچے بھی اب ان میں ہاتھ بٹانے لگے ہیں۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ کام بھی عمدہ ہوتا ہے اور محنت بھی ضائع نہیں ہوتی۔ علاوہ بریں جو کام بحیثیت مجموعی نہایت دقیق اور پیچیدہ معلوم ہوتا ہے اور جس کے انجام دینے کے لیے بہت سمجھ درکار ہوتی ہے، جب چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے تو ہر حصہ جداگانہ اس قدر سہل ہو جاتا ہے کہ معمولی سمجھ کا آدمی بھی بلا تکلف اس کو کر سکتا ہے۔ غرضکہ تقسیم عمل کا اول نتیجہ یہ ہے کہ کام آسان ہو کر کفایت کے ساتھ عمدہ طور پر سر انجام پا سکتا ہے ؛

(ب) یہاں یہ نکتہ ظاہر کرنا بھی غالباً بے محل نہ ہوگا کہ تقسیم عمل آجر اور مزدور دونوں کے واسطے حسب ترتیب بلحاظ کفایت مصارف و اضافہ اجرت مفید ہے:

مثلاً کسی گھر میں ایک مرد، چار لڑکے، دو عورتیں اور تین لڑکیاں ہیں، اگر گرد و نواح میں صرف طاقت طلب کام ملتا ہے تو غالباً دس آدمیوں کے کنبے کا گزارہ ایک مرد کی کمائی پر ہوگا۔ کیونکہ بموجب حالت مفروضہ سہل کام لڑکوں، عورتوں اور لڑکیوں کے کرنے کے قابل نایاب ہے؛ اور آجر خواہ کتنی ہی زیادہ اجرت دے، بسر اوقات فراغت سے نہ ہو سکیگی۔ لیکن اگر وہی دشوار کام بہت سے حصوں میں تقسیم کر کے بعض کام عورتوں اور بچوں کے قابل آسان نکال لیے جائیں تو گھر کے اکثر لوگ کام سے لگ جائیں۔ اور اگر مرد کی شرح اجرت بہ نسبت سابق کم کر دی جائے اور عورتوں بچوں کو مرد سے بھی کمتر اجرت دی جائے تو کام بھی مقدار اور عمدگی میں پہلے سے کم نہ ہوگا؛ آجر کو بشکل اجرت صرف کرنا پڑیگا اور ساتھ ہی اس کے مزدور کے گھر کی مجموعی آمدنی بہ نسبت سابق کہیں زیادہ ہو جائے گی مصرع "چہ خوش بود کہ برآید بیک کرشمہ دو کار"۔ البتہ اس نتیجے کیواسطے یہ شرط لازمی ہے کہ کام کی مقدار اس قدر ہو کہ سب لوگ پورے طور پر مصروف رکھے جاسکیں۔ اگر کام کی مقدار قلیل ہے تو ایک آدمی کا کام چند سے لینا سراسر فضول ہے؛

(ج) تجربہ شاہد ہے کہ مشق سے کمال حاصل ہوتا ہے۔ اول اول جب ہم گھوڑے یا سائیکل پر چڑھتے ہیں تو کس قدر خوف معلوم ہوتا ہے اور گر گر پڑنا لازمی ہوتا ہے۔ لیکن اسی مشق کی بدولت سرکسوں میں لوگ گھوڑوں اور بائیسکلوں پر وہ کرتب دکھلاتے ہیں کہ کرامات معلوم ہوتے ہیں۔ اسی مشق کی بدولت درزی کیسے موزوں اور ٹھیک کپڑے تراشتا ہے اور مصور کیسی تصویر بناتا ہے کہ جان ڈالنی باقی رہجاتی ہے۔ دماغی کاموں کا بھی یہی حال ہے؛ اول اول طبیب اور وکیل کو بہت غور و خوض اور ورق گردانی کی ضرورت ہوتی ہے لیکن کچھ تجربے کے بعد دماغ اس قدر مشاق ہو جاتا ہے کہ تشخیص مرض یا مشورہ قانونی میں بہت کم اہتمام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ پس جب مدت تک آدمی ایک ہی چھوٹے سے کام کو بیشمار مرتبہ دہراتا رہیگا تو اس کو جو کمال حاصل ہوگا، ظاہر ہے۔ چنانچہ ادنیٰ اور اعلیٰ کارخانوں کا عام فرق تقسیم عمل کی قلت و کثرت ہوتی ہے۔ عام دکانوں پر عموماً ایک ہی درزی کپڑے تراشتا اور سیتا ہے لیکن

اسکوٹھ اینڈ لارڈ یا بادشم پائل ایسے اعلیٰ سلائی کے کارخانوں میں لباس کے مختلف پارچے بلکہ ایک ہی چیز کے مختلف اجزا تک، تراشنے اور سینے والے جدا جدا ہوتے ہیں۔ بالعموم ایک کپڑے کی تیاری میں کچھ نہیں تو پانچ سات کاریگروں کا ہاتھ لگتا ہے۔ اور نتیجہ ظاہر ہے ؛

(ک) جب کوئی شخص متواتر ایک ہی کام دُہراتا رہتا ہے تو بصورت دیگر جو وقت کام بدلنے میں ضائع ہوتا وہ بچ جاتا ہے، اور کام کی مجموعی مقدار بڑھ جاتی ہے۔ خصوصاً بڑے بڑے کاموں میں اس وقت کی کفایت کا اثر نمایاں ہوتا ہے ؛

تقسیم عمل کے فوائد کا کچھ اندازہ ذیل کی مثال سے ہو سکیگا: آڈم اسمتھ اپنے زمانے کے الپن سازی کے کارخانے کا چشم دید حال لکھتا ہے کہ جو الپن بلاشق دن بھر میں ایک بھی بمشکل تیار ہو سکتی ہے تقسیم عمل کی بدولت حیرت انگیز سہولت اور سرعت سے بنائی جاتی ہے۔ اس کے بنانے کا طریق یہ ہے کہ ایک شخص تار کھینچتا ہے، دوسرا اس کو سیدھا کرتا ہے، تیسرا چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کاٹتا ہے، چوتھا نوک نکالتا ہے، پانچواں گھنڈی بٹھانے کے لیے دوسرے سرے کو درست کرتا ہے، تین چار مسلسل ترکیبوں سے گھنڈی تیار ہوتی ہے۔ گھنڈی جاتا، الپن نکھارنا، اور ان کو کاغذ میں ترتیب سے لگانا سب جدا جدا کام ہیں۔ گویا الپن سازی کا طریقہ تقریباً اٹھارہ کاموں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ جس کارخانے کا آڈم اسمتھ نے حال لکھا ہے وہ نہایت ادنیٰ درجے کا تھا لیکن تقسیم عمل کے زور سے دس آدمی دن بھر میں تقریباً اڑتالیس ہزار الپن بنا لیتے تھے۔ تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ تخمیناً چالیس پیشے گھڑی سازی سے اور سَو سے زیادہ کپڑے کی تیاری سے متعلق ہیں ؛

لیکن ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ تقسیم عمل مفید ہونے کیواسطے شرط لازمی یہ ہے کہ کام کی اس قدر کثرت ہو کہ سب لوگ برابر مصروف رہ سکیں جسقدر کام کی قلت ہوگی یہ طریق غیر مفید اور ناقابل عمل ثابت ہوگا ؛

تقسیم عمل کی مضرت

۳۔ تقسیم عمل پر جو سب سے بڑا نقص نکالا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ مزدور کی واقفیت اور مہارت نہایت کم اور محدود ہو جاتی ہے۔ اور فی نفسہٖ یہ ایک ناپسندیدہ

حالت ہے۔ اس کے دو جواب ہیں: اول تو مہارت میں جو کمال پیدا ہو رہا ہے اور جو محض بصورت تخصیص ممکن ہے، اس نقص کی مضرت سے مقابلتہً کہیں زیادہ مفید ثابت ہوا ہے۔ علاوہ اس کے تخصیص سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ انسان اپنے کام کے علاوہ دنیا کی تمام باتوں سے بیخبر ہو جائے۔ بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ سب باتیں کچھ کچھ اور چند باتیں پوری پوری جانے۔ خصوصاً علمی تخصیص کا یہی طریق ہے کہ بہت سے علوم سے ابتدا کرکے بڑھتے بڑھتے ایک علم پر آ رہے اور اسی میں کمال حاصل کرے۔ چونکہ تمام علوم میں باہمی رشتہ اور تعلق ہے، اس لیے جو شخص ایک ہی علم سے ابتدا کرکے ایک ہی پر اکتفا کریگا وہ نہ صرف کم علم بلکہ اپنے علم میں بھی ادھورا رہ جائیگا۔ اگر کوئی شخص سوائے طب یا قانون کے کچھ نہ پڑھے اور دنیا کے حالات سے بیخبر رہے تو وہ "نیم حکیم خطرۂ جان اور نیم وکیل خطرۂ ایمان" ثابت ہوگا؛ لہٰذا تخصیص سے قلت واقفیت لازم نہیں آتی۔ رہی مزدوروں کی حالت کہ ان کا حلقۂ مہارت تنگ ہو جاتا ہے اور وہ اپنے کاروبار میں دوسروں کے بیشتر محتاج ہو جاتے ہیں تو جو کام آسان اور سیدھے سادے ہیں ان پر تو یہ اعتراض عائد نہیں ہو سکتا، اور جو کام دشوار و مہارت طلب ہیں وہ اکثر مشین سے متعلق ہوتے ہیں۔ اور ایسے کاموں میں بوجہ خامی مہارت مزدور کو مضرت کا جو اندیشہ ہو سکتا ہے، اس کے دفعیے کا بھی قابل اطمینان طریقہ نکال لیا گیا ہے، جس کا مفصل حال مشین کی بحث میں بیان کیا جائیگا۔

مشین کا رواج

۴۔ مشین اور آدمی کے کام میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ مشین ایک ہی کام کو ایک طریق پر دُہراتی رہتی ہے۔ لیکن انسان کے کام میں اس کی مرضی کو بھی دخل ہے اور وہ جب چاہے کام میں تغیر تبدل کر سکتا ہے۔ پس جب تقسیم عمل سے کام کے بہت سے ٹکڑے کر دیے جاتے ہیں تو ایسے ٹکڑے جن کو صرف دُہرانا کافی ہے مشین کے سپرد کر دیے جاتے ہیں، اور جن ٹکڑوں میں حسب ضرورت تغیر و تبدل کرنا پڑتا ہے وہ انسان اپنے ذمے لے لیتا ہے: مثلاً سنگر مشین یکساں بخیہ کرتی چلی جاتی ہے، لیکن کپڑے کو اس طرح پر گھماتے رہنا کہ تمام جوڑوں پر بخیہ ہو جائے ہاتھ کا کام ہے۔ یا ریلوے انجن کا کام صرف

حصہ دوم باب ہشتم

دوڑتا ہے، لیکن رفتار کی کمی بیشی اور روکنا، چلانا، ڈرائیور کے متعلق ہے۔ پس معلوم ہوا کہ تقسیم عمل اور استعمال مشین میں نہایت قریبی تعلق ہے۔ مشاہدے سے ظاہر ہوگا کہ مصنوعات اور وسائل آمد و رفت میں مشین بیحد مستعمل اور کارآمد ہے۔ اور اس کے برعکس تعمیرات میں کمتر اور زراعت میں بہت ہی کم رائج ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ان کاموں میں اول تو تقسیم عمل کی گنجائش زیادہ نہیں، اور علاوہ اس کے ایسے کام کے ٹکڑے جن کی محض تکرار درکار ہو اور جن کو مشین کر سکے، معدودے چند نکالے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ دونوں کام اب تک بیشتر انسان کے ہاتھ پر منحصر ہیں، حالانکہ مصنوعات میں بہت سی چیزیں ہیں جن کی ساخت میں انسان شاید برائے نام ہاتھ لگاتا ہو، اور آمد و رفت پر تو ریل، جہاز، ٹریم کار اور موٹر نے پورا پورا قبضہ کر لیا ہے؛

مشین کے فوائد

۵۔ (ا) جو کام ہزارہا آدمی مل کر نہیں کر سکتے تھے، مشین دو چار آدمیوں کے سہارے سے کر سکتی ہے۔ انجنوں کی طاقت کا تخمینہ گھوڑے کی طاقت کے حساب سے کیا جاتا ہے اور ایک گھوڑے کی طاقت چھ قوی آدمیوں کی طاقت کے برابر مانی جاتی ہے۔ اب اندازہ کرنا چاہیئے کہ دس پندرہ بلکہ بیس ہزار گھوڑوں کی طاقت کے انجن جو چند چلانے والوں کی مدد سے ہر طرف کام کر رہے ہیں کسقدر بیشمار آدمیوں کی جگہ کام کرتے ہیں۔ ایک ریل ہی کو دیکھو کہ کس تیز رفتاری سے کتنا وزن ایک انجن اور دو تین چلانے والے ہزارہا میل بے تکان لیے پھرتے ہیں۔ کیا بغیر انجن کے ایسا کرنا ممکن تھا؟ چنانچہ مشین نے انسان کا اقتدار اور تصرف فطرت پر اسقدر بڑھا دیا ہے کہ وہ بہت کم باتوں کو محال سمجھتا ہے؛

(ب) مشین اسقدر نازک کام کرتی ہے کہ اس کا انسان کے وہم و گمان میں بھی گزرنا مشکل ہے۔ ایک انچ کو دس ہزار مساوی حصوں میں تقسیم کرنا مشین کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے؛

(ج) مشین نہ صرف سخت سے سخت اور نازک سے نازک کام کرتی ہے بلکہ جو کام کرتی ہے جلد سے جلد کرتی ہے؛ چنانچہ اس کی بیشمار مثالیں ہماری آنکھوں کے سامنے موجود ہیں۔ تقسیم عمل کے بیان میں ایک قدیم الپن سازی کے کارخانے کا حال آڈم اسمتھ سے نقل کر چکے ہیں، جس میں بتایا گیا ہے کہ

دس آدمی ۴۸ ہزار پن روز بنا لیتے تھے۔ اب مشین کی مدد سے ایک ہزار آدمی فی ہفتہ ۵ ۲ ٹن پن تیار کرتے ہیں۔ فی پونڈ چار ہزار سے زیادہ پنیں بنتی ہیں، لہذا روزانہ اوسط فی کس تیس ہزار پن ہوتا ہے۔ حالانکہ بلا تقسیم عمل ہاتھ سے دن بھر میں ایک پن بھی بمشکل تیار ہو سکے گی ؛

(۲) جو کام دستی محنت کے زمانے میں خاص خاص لوگوں کا حصہ مانا جاتا تھا اور برسوں کی کوشش سے آتا تھا اب معمولی عورتیں اور بچے چند مہینوں کی مشق سے کرنے لگتے ہیں۔ سنگر مشین چلانا کیا دشوار ہے، اور اسکی سلائی کے سامنے بڑے بڑے کاریگروں کی دستی سلائی ہیچ ہے۔ اس سہولت اور وسعت کام کے فوائد آجر اور مزدور دونوں کے حق میں تقسیم عمل کے فوائد میں واضح ہو چکے ہیں ؛

(۳) مشین کے ذریعے سے اسقدر یکساں چیزیں تیار ہو سکتی ہیں کہ ان میں سے کسی دو میں تفریق کرنا محال ہے۔ اس سے ایک تو تجارت کو بہت فروغ ہوتا ہے، صرف ایک نمونہ دیکھ کر اسی قسم کی ہزار چیزوں کی فرمائش بے تکلف دے سکتے ہیں، کیونکہ ہم کو اطمینان ہے کہ مشین کی بنی ہوئی چیزیں سب یکساں ہوتی ہیں۔ دوسرے خود مشین کے رواج میں اس سے بیحد مدد ملتی ہے : مثلاً اگر کوئی پرزہ خراب ہو جائے تو اس نمبر کا بعینہ ویسا نیا پرزہ کارخانے سے منگا کر مشین درست کی جا سکتی ہے۔ اس کی مرمت میں کوئی دردِ سر نہیں اٹھانا پڑتا ہے ؛

(۴) تقسیم عمل پر جو اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ حلقۂ مہارت کو تنگ کرکے مزدور کو دوسروں کا محتاج بنا دیتا ہے، اسکے دو جواب دیے جا چکے ہیں۔ سیدھے سادے آسان کام تو اس اعتراض سے بری ہیں، رہے دشوار اور مہارت طلب کام، وہ آجکل مشین سے زیادہ تر متعلق ہیں۔ اور اب مختلف مشینوں کی ساخت میں اسقدر مشابہت پیدا کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ جو شخص گھڑی سازی کی مشین جانتا ہے وہ تھوڑی سی مشق سے بے دقت بندوق اور سینے کی مشین بنانے کے کارخانے میں مشین چلا سکتا ہے ؛ اور

باوجودِ تخصیص کام بدلنے میں وقت نہیں ہوتی۔ البتہ جو مہارت محض ہاتھ کے کام سے متعلق ہو اس پر یہ اعتراض بظاہر بجا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن تجربہ شاہد ہے کہ کسی چیز کی تجارت کے فروغ اور تنزل کا اثر بنانے والوں پر دونوں حالتوں میں یکساں پڑتا ہے؛ خواہ وہ کل چیز بنائے یا ایک جزو۔ پس تنگی مہارت سے مضرت کا اندیشہ زیادہ تر وہمی ہے، عملاً کچھ اہمیت نہیں رکھتا؛

مشین کے مذکورۂ بالا فوائد کے متعلق یہاں یہ جتانا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کام کی کثرت شرطِ لازمی ہے، قلت، کار کی صورت میں مشین بیکار ہے؛

مشین کا اثر مزدوروں پر

۶۔ آیا مشین کا رواج بحیثیتِ مجموعی ادنیٰ مزدوری پیشہ لوگوں کے حق میں مضر ہے یا مفید؟ اس پر بہت کچھ بحث ہو چکی ہے، جس کا ماحصل ہم بیان کئے دیتے ہیں:۔

(ا) پہلی شکایت یہ ہے کہ مشین کام سہل بنا کر شرحِ اُجرت بہت گھٹا دیتی ہے۔ جواب دیا جاتا ہے کہ مشین مصارفِ پیدائش میں تخفیف کرکے شرحِ قیمت بھی کم کر دیتی ہے۔ لہٰذا جو نقصان مزدور کو بشکل تخفیفِ اُجرت پہنچتا ہے، اس کی تلافی ضروریات کی ارزانی سے ہو جاتی ہے: یعنی آمدنی کے ساتھ خرچ بھی گھٹ جاتا ہے اور بالجملہ کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ جواب الجواب ہے کہ جو قیمتی سامان اور تعیشات اکثر مشین سے تیار ہوتے ہیں اور جن کی قیمت میں نمایاں کمی ہو جاتی ہے، وہ مزدوروں کی ضروریات سے بالاتر ہیں؛ اور بالعموم مشین کی بنی ہوئی چیزیں انکی ضروریات کا اس قدر جزوِ قلیل ہوتی ہیں کہ ان کی قیمت کی بچت کمی اُجرت کا معاوضہ نہیں ہو سکتی۔ البتہ اگر تخفیف اجرت کے ساتھ ساتھ مزدور کی تمام ضروریات کی قیمت بھی نسبتہً گھٹ جائے تو بیشک نقصان نہ ہوگا؛ لیکن یہ ممکن نہیں۔ کیونکہ مشین کا عمل وسائلِ آمد و رفت اور مصنوعات میں بیشتر پایا جاتا ہے اور زراعت و عمارت جن سے مزدوروں کی ضروریات کا خاص تعلق ہے، مشین کے حلقۂ عمل سے باہر ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ مشین سے خوشحال لوگوں کو ارزانی مصنوعات کی صورت سے فائدہ پہنچتا ہے اور مزدوروں کی اُجرت کی تخفیف سے نقصان۔

یہاں ہم یہ جتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ مشین نے عورتوں اور بچوں کے واسطے بھی طرح طرح کے نئے کام پیدا کر دیے ہیں اور اگر شرح اجرت گھٹ بھی جائے تو گھر کی مجموعی آمدنی بہ نسبت سابق زیادہ ہوگی، کم نہ ہوگی؛ اور مزدوری پیشہ لوگ خوشحال رہیں گے۔

(ب) دوسری شکایت یہ ہے کہ مشین بہت سا کام تھوڑے وقت میں کر کے اکثر مزدوروں کو بیکار کر دیتی ہے۔ جواب دیا گیا ہے کہ مشین مصنوعات کی قیمت گھٹا کر ان کی تجارت اسقدر بڑھا دیتی ہے کہ پہلے سے زیادہ مزدور کام سے لگ جاتے ہیں۔ آج کروڑ ہا لوگ کتابیں، رسالے اور اخبار چھاپنے میں مصروف ہیں۔ چھاپے کی ایجاد سے پہلے کتنے خوشنویس کتابیں لکھتے ہوں گے! پس ثابت ہوا کہ مشین بجائے کام چھین لینے کے مزدوروں کے واسطے کام بڑھاتی ہے۔ اس جواب پر بھی یہ شکایت باقی رہتی ہے کہ مشین کے رواج کا اثر تو فوراً مزدوروں پر پڑتا ہے اور ہزارہا بیکار ہو جاتے ہیں، لیکن قیمت کی تخفیف سے پیداوار میں اضافہ ہونے کے لیے وقت درکار ہوتا ہے؛ گویا باپ دادا کی بیکاری کی مصیبت کا پھل بیٹوں پوتوں کو ملتا ہے۔ یہ شکایت بجا بھی سہی؛ لیکن اکثر حسب ضرورت عام مستقبل بہبودی پر موجودہ ذاتی منفعت قربان کرنے سے قطع نظر کرنا پڑتا ہے؛ جو سپاہی وطن کی حفاظت اور ملکی فتوحات میں مارے جاتے ہیں ان کی آئندہ نسلیں آزادی اور حکمرانی کا لطف اٹھاتی ہیں۔ مشینوں کی فوری مضرت اور مستقبل فوائد کو اس روشنی میں دیکھنا ہوگا۔

دوسری شکایت کا ایک جواب یہ بھی دیا جاتا ہے کہ مشین سے اگر کچھ مزدور بیکار ہو جاتے ہیں تو بوجہ تخفیفِ مصارف کچھ اصل بھی ضرورت سے زائد بچ رہتا ہے؛ اور چونکہ محنت اور اصل میں کشش مقناطیسی ہے، بیکار مزدوروں کیواسطے نئے نئے کارخانے جاری ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اصل تو نہایت سریع الانتقال گویا پانی کی مانند سیال ہے، ہر جگہ پہنچ جاتا ہے؛ مگر محنت جو مزدور کی ذات سے لاینفک

ہے، اصل کے ہمراہ ہر جگہ نہیں جا سکتی۔ نہیں معلوم زائد اصل کہاں کام سے لگایا جائے: مثلاً اگر ولایت کا اصل ہندوستان میں کام کرے تو اس سے ولایت کے بیکار مزدور کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ بیکاری کا مسئلہ ہر ملک میں کم و بیش تشویش پیدا کر رہا ہے، ہر جگہ بیکار مزدوروں کے چھوٹے بڑے گروہ موجود ہیں، ان کو کام سے لگانے کی بہت تدبیریں نکالی جاتی ہیں؛ بہترین دماغ اس مسئلے کے حل کرنے میں مصروف ہیں، مگر مستقل طور پر بیکاری کے نیست و نابود کر دینے کی کوئی سبیل نظر نہیں آتی۔ باکاری و بیکاری بھی نظام عالم کے لازمی جزو معلوم ہوتے ہیں ؛

پیدائش بر پیمانۂ صغیر و کبیر

۷۔ اگر کسی شہر میں سو موچی جداگانہ کام کر کے پانسو جوڑے جوتے ماہوار بنائیں اور کسی ایک فیکٹری میں بھی پانسو جوڑے ماہوار تیار ہوں، تو گو مقدار پیداوار برابر ہے لیکن طریق پیدائش میں بہت نتیجہ خیز فرق موجود ہے۔ اسی وجہ سے اول کو پیدائش بر پیمانۂ صغیر، دوم کو پیدائش بر پیمانۂ کبیر کہتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ بحالتِ اول محنت اور اصل بہت سے چھوٹے چھوٹے حصوں میں منتشر ہوتے ہیں اور بحالتِ دوم محنت و اصل کی معقول مقدار یکجا فراہم ہو کر عمل پیدائش میں صرف ہوتی ہے۔ جس زمانے میں صرف چند آلات اور اوزاروں سے کام لیا جاتا تھا، لوگ جدا جدا یا دو چار مل کے کام کرتے تھے۔ مگر جب سے ایجاد کی بدولت بڑے بڑے طاقتور انجن اور قیمتی مشینیں رائج ہوئیں، ہزار ہا لوگ مل جل کر یکجا کام کرنے لگے۔ چنانچہ آجکل کی ملیں، فیکٹریاں، کمپنیاں اور کارخانجات پیدائش بر پیمانۂ کبیر کی عمدہ مثالیں ہیں ؛

پیدائش بر پیمانۂ کبیر کے فوائد

۸۔ (ا) بہت سے کام اسقدر عظیم الشان اور اہتمام طلب ہیں کہ سوائے پیدائش بر پیمانۂ کبیر کے اور کسی طرح سرانجام نہیں پا سکتے: مثلاً انجن، مشین، آہنی پُل، ریل اور جہاز سازی کے کارخانے، ریلوے اور ٹریم کمپنیاں، نہریں کاٹنا اور کان کنی ؛

(ب) تقسیم عمل اور استعمال مشین کے متعدد فوائد کم و بیش صرف پیدائش بر پیمانۂ کبیر میں حاصل ہو سکتے ہیں، کیونکہ کام کی کثرت حصولِ فوائد کی لازمی شرط ہے ؛

(ج) کفایتِ محنت۔ اگر دس چھوٹے چھوٹے کارخانے ملاکر ایک بڑا کارخانہ بنا دیا جائے تو دس کلرکوں کے بجائے غالباً دو ہی ہوشیار کلرک تمام حساب و کتاب پہلے سے بہتر حالت میں رکھ سکیں گے، اور صرف ایک قابل منیجر بہ نسبت سابق کہیں عمدہ انتظام کرے گا۔ اس فائدے کی بہترین مثال ڈاک خانہ ہے کہ صرف چند ڈاکیئے شہر بشہر کے خطوط تقسیم کر دیتے ہیں۔ اور بوجہ کفایت محنت صرف ایک یا دو پیسے میں دور سے دور خط جا سکتا ہے۔ اگر دکانوں یا کارخانوں کی مانند کئی کئی ڈاک خانے لوگ ایک ہی شہر میں بطور خود جداگانہ قائم کریں تو مصارف بہت زیادہ اور کام کی حالت غالباً ابتر ہوگی۔ علاوہ ازیں مزدور اور کاریگر بھی بڑے بڑے کارخانوں میں کام کرنا بمقابلہ چھوٹے کارخانوں کے زیادہ پسند کرتے ہیں۔ لہذا پیدائش برپیمانۂ کبیر میں اچھی سے اچھی محنت میسر آسکتی ہے ؛

(د) کفایتِ مشین۔ دو دو ہزار گھوڑوں کی طاقت والے پانچ انجنوں سے دس ہزار گھوڑے کی طاقت والا ایک انجن زیادہ اور بہتر کام کر سکتا ہے۔ اور لطف یہ کہ کوئلا بھی کم خرچ ہوتا ہے، جگہ بھی کم گھرتی ہے، چلانیوالوں کی تعداد بھی کم ہوتی ہے، اور دوسرے ہر قسم کے مصارف انجن میں کفایت رہتی ہے؛ علاوہ اس کے بوجہ مستقل کثرت کار بڑے کارخانے نہایت اعلیٰ اور بیش بہا مشین لگاکر پورا پورا فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اسکے برعکس چھوٹے کارخانے معمولی مشین پر قناعت کرتے ہیں ؛

(س) کفایتِ زمین۔ صنعت و تجارت کے گنجان مرکزوں میں جہاں زمین بہت قیمتی اور کرایہ بہت گراں ہوتا ہے، جگہ کی کفایت ایک بڑی کفایت مانی جاتی ہے۔ دس گنا بڑا کارخانہ بنانے کیواسطے دس گنی زمین اور عمارت درکار نہیں ہوتی؛ کیونکہ انجن گھر، مشین گھر، دفاتر اور گوداموں میں اتنی جگہ نہیں گھرتی جتنی کہ دس گنی چھوٹی ایسی دس عمارتوں میں ؛

(ص) کفایتِ اصل۔ سو گنا زیادہ کاروبار چلانے کے لیے زیادہ سے زیادہ بیس پچیس گنا اصل کافی ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر سال بھر میں یہ چھوٹے

کارخانے دو مرتبہ مال تیار کرتے ہیں تو بڑے کارخانے اس کا ہر مرتبہ دوگنا مال سال میں دس مرتبہ تیار کر لیتے ہیں؛ اور خریدار بھی خوشی بخوشی نیا اور تازہ مال بڑے کارخانے سے بکثرت خریدتے ہیں۔ جب کسی چیز کا ایک سانچہ تیار ہو جاتا ہے، یا کسی کتاب کی کاپی پریس میں کمپوز ہو جاتی ہے، تو ان سے ہزارہا بلکہ لاکھوں ویسی ہی چیزیں اور کتابیں تیار ہو سکتی ہیں۔ اسی کام کے لیے بہت سے جداگانہ سانچے یا کاپیاں کمپوز کرانا مزید محنت، و اصل کو ضائع کرنا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر کسی کتاب کی کم کاپیاں چھپوائی جائیں تو شرح مصارف زیادہ اور جتنی زیادہ کاپیاں چھپیں شرح مصارف کمتر ہوگی۔ اسی طرح برقی طاقت اور روشنی جتنی زیادہ مقدار میں تیار ہوگی ارزاں پڑے گی۔ کفایتِ اصل اضافۂ پیداوار میں خاص طور پر تخفیفِ مصارف کا باعث ہوتی ہے۔

(ص) کفایتِ مصارف۔ اکثر مذکورۂ بالا فوائد سے مصارف میں تخفیف ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں چونکہ بڑے کارخانے پیداوار خام وغیرہ زیادہ مقدار میں خریدتے ہیں ان کو عمدہ سے عمدہ چیز تھوک فروشی کے کمتر نرخ سے ملتی ہے؛ اور ریل کے کرائے اور باربرداری کے مصارف میں بھی معقول کفایت ہو جاتی ہے۔ یہ فوائد چھوٹے کارخانوں کو کمتر میسر آتے ہیں۔

(ط) ازدیادِ منافع۔ ہر کارخانہ دار کی کوشش اصل پر زیادہ سے زیادہ شرح منافع فیصدی سالانہ حاصل کرنی ہوتی ہے۔ بڑے بڑے کارخانوں میں چونکہ زیادہ مقدار میں مال جلد جلد تیار ہوتا ہے خریداری بڑھانے کی غرض سے فی چیز شرح منافع کم رکھنے پر بھی سال بھر میں مجموعی منافع کی شرح نہایت اچھی پڑتی ہے۔ اور چونکہ ہر قسم کا تازہ مال ایسے کارخانوں سے مل سکتا ہے، لوگ دور دور سے مال منگاتے ہیں اور یہ تمام اسباب مل کر اور حلقے کے مانند گھوم گھوم کر کارخانہ دار اور خریدار دونوں کو بشکل ازدیادِ منافع و تخفیفِ قیمت فائدہ پہنچاتے ہیں:۔

مثلاً اگر ایک کارخانے میں پچاس ہزار کے اصل سے دو دو ہزار چیزیں سال میں چھ مرتبہ کل بارہ ہزار ایک روپیہ فی چیز کے صرفہ سے تیار ہو کر ایک روپیہ چار آنے

فی چیز کے حساب سے بکتی ہیں، تو شرحِ منافع خالص ۶ فیصدی سالانہ ہوگا۔ لیکن اگر دوسرا کارخانہ صرف دس ہزار کے اصل سے وہی چیز بنائے تو بوجوہات مذکورہ بالا صرفہ ایک روپے سے یقیناً زائد مثلاً تخمیناً ایک روپیہ دو آنے پڑیگا۔ اور چیز فی تعداد کا سالانہ اوسط بھی نسبتہً کم مثلاً چار ہزار رہیگا۔ اس حالت میں چھ فیصدی منافع حاصل کرنے کی غرض سے نرخ ایکروپیہ چار آنے سے بڑھا کر مقرر کرنا پڑیگا۔ یا اگر بڑے کارخانے کے مقابلے میں ایکروپیہ چار آنے کے نرخ سے چیزیں فروخت کرنی پڑیں تو چھوٹے کارخانے کو صرف پانچ روپیہ فیصدی منافع خالص مل سکیگا؛ یعنی بڑے کارخانے سے ایک روپیہ فیصدی کم؛ حالانکہ نرخ وہی ایک ہے۔ اس فرق کا باعث کفایتِ مصارف اور کثرتِ فروخت کے سوا کیا ہے؟

(ع) جدّت۔ اس زمانے میں جدّت بہت بڑی طاقت ہے۔ محض تجربوں پر بڑے کارخانے جتنی رقم صرف کر دیتے ہیں وہ چھوٹے کارخانوں کے سرمائے سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اور ان کے تجربے کامیاب ہو کر دنیا کے رواج اور فیشن میں داخل ہو جاتے ہیں تو معقول منافع و نیز مصارفِ تجارت بیشمار خریداروں سے بسہولت وصول ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ نت نئی چیزیں بنا بنا کر نئی نئی ضروریات پیدا کرنا اور لوگوں کو نئے نئے شوق دلانا آجکل اعلیٰ کارخانوں کا سب سے مہتم بالشان کام اور امتیازی نشان ہو گیا ہے۔

(ف) اشتہار۔ اس زمانے میں تجارتی ترقی کا ایک بڑا راز اشتہار بھی ہے؛ چنانچہ سنگر اور لپٹن کے مثل عالمگیر کاروبار والے کارخانے لاکھوں روپے ہر سال صرف اشتہار میں صرف کر دیتے ہیں۔ کوئی ریلوے اسٹیشن، ہوٹل، تماشگاہ اور اخبار ایسا نہیں کہ ان کے اشتہار سے خالی ہو۔ علاوہ اسکے ان کے سفری ایجنٹ دنیا بھر میں ذاتی کوشش سے خریدار بڑھاتے پھرتے ہیں، اور کل مصارفِ اشتہار علاوہ منافع بآسانی خریداروں کی بڑی جماعت سے وصول ہو جاتے ہیں اور کاروبار کو دن دونا رات چوگنا عروج ہوتا چلا جاتا ہے۔

۹۔ اوپر کے بیان سے ظاہر ہوا کہ بڑے کارخانوں کو چھوٹے کارخانوں سے کفایات پیدائش میں بہت زیادہ آسانیاں حاصل ہیں جن کی وجہ سے وہ مال عمدہ اور سستا داخلی خارجی

حصہ دوم
باب ہشتم

تیار کر کے حسبِ دلخواہ منافع اٹھاتے ہیں۔ ایسی کل آسانیاں کفایاتِ داخلی کہلاتی ہیں۔ لیکن کچھ آسانیاں ایسی بھی ہیں جو ترقی عام کا نتیجہ ہیں اور چھوٹے بڑے کارخانوں کو یکساں میسر ہیں: مثلاً ریل وجہاز کی آسانیاں، پیداوارِ خام اور مشینوں کی ارزانی، پیدائش کی نئی نئی آسان ترکیبیں جو علمی تحقیقات کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ انکو کفایاتِ خارجی کہتے ہیں۔ پریس اور تعلیم کی مدد سے کفایاتِ خارجی کفایاتِ داخلی پر غالب ہوتی جاتی ہیں ؛

قوانین تکثیر حاصل و استقرار حاصل۔

۱۰۔ تقسیم عمل اور استعمالِ مشین کی تمام بحث سے بخوبی واضح ہے کہ مصنوعات کی مقدار جس قدر بڑھتی ہے، مصارف کی نسبت گھٹتی جاتی ہے: یعنی چیزیں سستی تیار ہوتی ہیں، یا سابق مصارف کی وہی مقدار بیشتر چیزیں پیدا کر سکتی ہے۔ اس حالت کو اصطلاحاً قانون تکثیر حاصل کہتے ہیں۔ پیدائش جسقدر بر پیمانۂ کبیر ہوگی اس قانون کا اثر قوی ہوگا۔ چنانچہ ریل، جہاز، کپڑے کی ملیں، جوتے کی فیکٹریاں اور دیگر صنعات کے کارخانے سب اس قانون کے خاص طور پر تابع ہوتے ہیں ؛

یہ بتایا جا چکا ہے کہ زمین کی پیداوار قانون تقلیل حاصل کی تابع ہے، پس پیداوار خام میں قانونِ تقلیل حاصل کا اثر اور صنعت میں قانون تکثیر حاصل کا اثر مضمر ہوتا ہے۔ اگر دونوں مساوی ہوں تو مجموعی اثر مصنوعات میں بشکل قانون استقرار حاصل نمودار ہوتا ہے: یعنی مصارف کی نسبت ہمیشہ یکساں رہتی ہے، بیشی پیداوار سے بڑھتی گھٹتی نہیں۔ اور اگر کوئی اثر غالب رہا تو مصنوعات بقدرِ غلبہ اسی کے قانون کی متابعت کریں گی۔ عمل پیدائش کے یہ تینوں قانون یعنی تقلیل حاصل، تکثیر حاصل، و استقرار حاصل، اکثر مسائل خصوصاً ٹیکس یا محصول کی بحث میں بہت اہمیت رکھتے ہیں جس کی موقع بموقع ہم تشریح کریں گے ؛

تحصیر صنائع

۱۱۔ کچھ صنعتیں بعض مقامات سے اسقدر مخصوص پائی جاتی ہیں کہ کسی دوسری جگہ ان کو رواج دینے کی کوشش اکثر لاحاصل ثابت ہوتی ہے۔ حصر صنائع کے اسباب کئی ہیں: آب وہوا کی موافقت، پیداوار خام کی ارزانی، خریداری کی کثرت، سرکار کی سرپرستی، اور کبھی محض اتفاق بھی اس کا باعث ہوتا ہے۔ کشمیری شال دنیا بھر میں مشہور ہے، اگر کشمیری بھیڑیں دوسری جگہ پالی جائیں یا اون کشمیر سے لیکر دوسری جگہ

شالیں بنوائی جائیں، تو تجربے سے ثابت ہوا کہ کشمیر کی سی نفیس شال تیار نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ کشمیر کی آب وہوا اون کے ریشے کی نرمی، لمبائی اور مضبوطی کے واسطے بیحد مناسب ہے۔ علیٰ ہذا لنکا شائر اور مانچسٹر جو انگلستان بھر میں کپڑے کی صنعت کے مرکز ہیں، وہاں کی آب وہوا میں ایک خاص نمی پائی جاتی ہے جو تاگے کو نرم اور مضبوط بنا دیتی ہے۔ ترچناپلی کی آب وہوا عمدہ تمباکو کی کاشت اور سگرٹ کی ساخت دونوں کے واسطے موضوع ہے۔ بریلی کے گرد و نواح میں جنگل ہے، جہاں فرنیچر کے قابل لکڑی بکثرت دستیاب ہوتی ہے۔ لوہے کے کارخانے عموماً لوہے یا کوئلے کی کانوں کے قرب وجوار میں قائم کیے جاتے ہیں۔ بنارس میں ہر سال لاکھوں ہندو جاتری جمع ہوتے ہیں ان کی وجہ سے وہاں تانبے کے برتن بکثرت فروخت ہوتے ہیں۔ دہلی اور لکھنو جو مدتوں بادشاہوں، نوابوں اور امراء کا مسکن رہ چکے ہیں، آجتک وہاں سونے چاندی کے زیور نہایت عمدہ تیار ہوتے ہیں۔ آگرہ بھی کسی زمانے میں شاہان مغلیہ کا دارالسلطنت تھا، جے پور میں ابتک مہاراجہ رہتا ہے، گرد و نواح میں پتھر کی کانیں بھی موجود ہیں، یہاں کے عالیشان محلات مشہور عالم ہیں اور سنگ مرمر کا کام لاجواب مانا جاتا ہے۔ قصہ مختصر تخصیص صنائع کا رواج ہر ملک میں پایا جاتا ہے اور اس کے کچھ نہ کچھ اسباب بھی ضرور ہوتے ہیں۔ تخصیص صنائع بھی گویا ایک قسم کی تخصیص اور مقامی تقسیم عمل کی صورت ہے، اور اس سے وہی نتائج پیدا ہوتے ہیں:

تخصیص صنائع بھی تقسیم عمل کی مانند معاون کمال و مہارت ہے۔ آب وہوا میں ایک خاص کاروباری اثر پیدا ہوجاتا ہے؛ ایک کو مصروف و کامیاب دیکھ کر دوسرے کے دل میں کام کا شوق پیدا ہوتا ہے؛ ضروری معلومات، آلات اور پیداوار خام باسانی میسر آتے ہیں؛ بڑے بڑے ماہر کاریگر اور عمدہ مزدور سب اگر ایسی جگہ جمع ہوجاتے ہیں اور حسب دلخواہ محنت مہیا ہوجاتی ہے۔ مقابلے کے جوش میں ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، اور ان سب باتوں کا نتیجہ مقامی خوشحالی اور صنعت کی ترقی ہوتی ہے:

صنائع تضمینی و تفہیمی

۱۲۔ مقامی صنعت کے تعلق سے اور بھی چند ایسی صنعتیں پیدا ہوجاتی ہیں

حصہ دوم
باب ہشتم

جو اس خاص صنعت کو مختلف طور پر مدد دیتی ہیں۔ ایسی صنعتوں کو اصطلاحاً صنائع تضمینی کہتے ہیں: مثلاً کانپور میں چرمی سامان بالخصوص جوتا صنعت خاص ہے چمڑا دھونے اور رنگنے کے مصالحے تیار کرنا، جوتوں کے فرمے اور تسمے بنانا، جوتے رکھنے کے کاغذی ڈبے اور جوتے باہر بھیجنے کے واسطے لکڑی کی پیٹیاں تیار کرنا، سب صنائع تضمینی کہلائیں گے۔ اسی طرح جہاں مٹی کا تیل نکالنا صنعت خاص ہے، کنستر اور لکڑی کی پیٹیاں جن میں کنستر بند ہو کر آتے ہیں، صنائع تضمینی میں داخل ہیں۔ کاغذ، روشنائی، جلد سازی، پریس کی صنعت بطور خاص صنائع تضمینی سے متعلق ہیں ؛

اگر خاص مقامی صنعت طاقت طلب ہو جس میں سوائے مردوں کے عورتیں اور بچے شریک نہ ہو سکیں: مثلاً کان کنی، تو اس حالت میں شرح اجرت بھی زیادہ ہوتی ہے، اور مزدور کی خاندانی آمدنی کم۔ وجہ تقسیم عمل میں سمجھائی جا چکی ہے۔ پس اس ناگوار حالت کو رفع کرنے کی یہ سبیل نکالی گئی ہے کہ خاص اہتمام سے کچھ ایسی صنعتیں قائم کی جاتی ہیں کہ جن میں بوڑھے، بچے اور عورتیں شریک ہو کر خاندانی آمدنی بڑھا سکیں: چنانچہ ولایت میں لوہے کے کارخانوں اور کان کنی کے قرب و جوار میں آسان صنعتیں مثلاً اون صاف کرنا اور رنگنا، موزے جراب بننا، کشیدہ کاڑھنا، اکثر مروج پائی جاتی ہیں۔ ان کو اصطلاحاً صنائع تضمیمی کہتے ہیں۔ بعض صورتوں میں صنعت تضمینی و تضمیمی ایک ہی ہوتی ہے ؛

کمپنیاں

۱۳۔ جب تجربے سے پیدائش برپیمانۂ کبیر کے بیش بہا فوائد تحقیق ہو گئے تو بڑے بڑے کارخانوں، ملوں اور فیکٹریوں کی بنا پڑی جن کو ہم بغرض سہولت بیان کمپنی کہیں گے۔ کمپنی سے مراد محنت اور اصل کی مقدار کثیر یکجا فراہم کر کے عمل پیدا آوری جاری کرنا ہے۔ بعض دولتمند محض اپنے ذاتی سرمائے سے کمپنی قائم کرتے ہیں۔ لیکن آج کل اکثر کمپنیاں مشترکہ سرمائے سے چلتی ہیں، ہر طبقے کے لوگ حسب حیثیت و مرضی بشکل خریداری حصص جن کی کچھ قیمت مثلاً سو روپے فی حصہ مقرر ہوتی ہے، کمپنی کے سرمائے میں اپنا روپیہ شامل کر کے کاروبار کے نفع نقصان میں بحیثیت حصہ دار شریک ہو جاتے ہیں۔ ایک قانون کی رو سے اب کمپنیاں محدود (لمیٹڈ) ہو سکتی ہیں، اس سے نقصان کا اثر حصے کی مقدار تک محدود رہتا ہے، حصہ دار کی ذات اور دوسری ملک و جائداد پر

باب ہشتم

نہیں پڑ سکتا۔ حصہ داروں کی ایک مختصر انتظامی کمیٹی کی نگرانی میں اکثر تنخواہ دار منیجر کے اہتمام سے کمپنی کاروبار کرتی ہے۔ گورنمنٹ نے ایسے قانون نافذ کردئے ہیں کہ حصوں اور منافع کے روپے میں کوئی تغلب نہ کر سکے۔ سرکاری انسپکٹر وقتاً فوقتاً کارخانوں کا معائنہ کرتے ہیں، اور سرکاری سند یافتہ محاسبوں سے ہر سال حساب و کتاب کی جانچ پڑتال کرا کے مفصل رپورٹ شائع کرنا قانوناً لازمی ہے ؛

آجر و مہتمم اور تخمین و مخمن

۱۴۔ جو شخص ذاتی یا مستعار سرمائے سے کمپنی قائم کرے، وہ آجر کہلاتا ہے۔ کمپنی کے مہتمم کو مہتجیر کہتے ہیں، اور وہ اکثر تنخواہ دار ہوتا ہے۔ مہتجیر کے فرائض بہت ذمہ داری کے ہوتے ہیں، اس کی حیثیت بعینہ کپتان جہاز کی سی ہے۔ نہ صرف تمام مزدوروں کے کام کی نگرانی کرنا اس کا فرض ہے بلکہ وہ تمام دنیا پر نظر دوڑاتا ہے کہ بہترین پیداوار خام سب سے ارزاں کہاں ملتی ہے؟ کہاں کہاں مصنوعات کی خرید زیادہ ہے؟ دوسرے کارخانوں کے مقابلے میں خریدار کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے کیا کیا وسائل مفید اور کارگر ثابت ہونگے؟ بالفاظ مختصر کاروبار کے فروغ کی عمدہ سبیلیں نکالنا اور ان پر عملدرآمد کرانا مہتجیر کا فرض ہے، اور یہ کوئی آسان کام نہیں، اس کیواسطے بیحد توجہ، تندہی، دوراندیشی، وسعت معلومات اور زمانہ شناسی درکار ہے ؛

کچھ لوگ کمپنی قائم کرنے کے بجائے دوسروں کی کمپنیوں سے ٹھیکے پر کام کراتے ہیں اور قیمت خرید و فروخت کے فرق سے منافع اٹھاتے ہیں۔ یہ لوگ اگر دور بین ہوں، اور مستقبل کا صحیح اندازہ کر سکیں، تو ایسے کاروبار سے بہت منافع اٹھا لیتے ہیں۔ چونکہ یہ کاروبار محض مستقبل کے تخمینے سے متعلق ہوتا ہے، اسکو تخمین اور کرنے والے کو مخمن کہتے ہیں۔ بعض مخمن تو یہ غضب ڈھاتے ہیں کہ یا تو کل روپیہ قرض لیکر یا محض بہت تھوڑے ذاتی سرمائے سے محض تخمینے کے بھروسے پر لاکھوں روپے کا کاروبار چلاتے ہیں۔ ایسے لوگ عموماً بیحد ذہین، سمجھدار، باخبر، اور موقع شناس ہوتے ہیں۔ تخمینے میں شاذ و نادر غلطی کرتے ہیں، مگر جب کرتے ہیں تو بری طرح قرضخواہ یا فریق ثانی کو تباہ کر دیتے ہیں۔ چونکہ اہتمام کا درد سر کم اٹھانا پڑتا ہے تخمین کا یورپ میں بہت رواج ہو چلا ہے ؛

حصۂ سوم

تقسیم دولت

باب نہم

دولت کے حصہ دار

زمین، محنت اور اصل یہی تینوں مل جل کر دولت پیدا کرتے ہیں لیکن ان عاملین پیدائش کو یکجا کرنا، اپنی ذمہ داری اور نگرانی میں اُن سے کام لینا، اور انکے اتفاق عمل سے پیداوار دولت حاصل کرنا گو ایک قسم کی محنت ہی لیکن فی نفسہ اسقدر اہم اور مخصوص شئے ہے کہ بغرض امتیاز اس کو تنظیم کہتے ہیں۔ پیدائش دولت کیواسطے ملک میں قیام امن و امان بھی لابدی ہے؛ اور یہ دشوار کام ہر گورنمنٹ نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ پس بحیثیتِ مجموعی دولت کی پیدائش میں زمین، محنت، اصل، تنظیم اور گورنمنٹ، پانچ عامل شریک ہوتے ہیں۔ اور پیداوار میں ان کے جداگانہ حصے علی الترتیب، لگان، اجرت، سود، منافع اور ٹیکس کہلاتے ہیں۔ اب اگر ہر شخص جدا جدا ان تمام عاملوں کا مالک ہوتا تو اپنی کل پیداوار کا بھی بلا شرکتِ غیرے حقدار رہتا۔ ایسی صورت میں پیداوار کو مذکورۂ بالا عاملوں کے حصّوں میں جداگانہ ناموں سے تقسیم کرنا بھی فضول ہوتا! لیکن حقیقت حال اس کے برعکس ہے۔ زمیندار بہت کم اپنی زمین سے خود کام لیتے ہیں، بلکہ اکثر اپنے کھیت یا مکان یا دکان، لگان اور کرائے پر دوسروں کو اٹھا دیتے ہیں: علیٰ ہذا مزدور اکثر اجرت پر دوسروں کے کھیت اور کارخانوں میں کام کرتے ہیں، اصل میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ اصلداروں کا ایک

علیحدہ گروہ ہے جو آلات اور سامانِ ضروری مہیا کر دیتے ہیں اور محنت میں کوئی حصّہ نہیں لیتے؛ یہ لوگ کارخانوں اور کمپنیوں کے حصہ دار بھی کہلاتے ہیں۔ ایک مختصر مگر با اثر جماعت آجروں کی پیدا ہو چلی ہے جن کا خاص کام تنظیم عاملین ہے، جو اصل بھی اکثر دوسروں سے لیکر لگاتے ہیں اور سوائے نگرانی اور اہتمام کے کسی کام میں ہاتھ نہیں لگاتے۔ رہا امن و امان، اسکے قیام کیواسطے گورنمنٹ نے فوج، پولیس اور عدالت سے بیش خرچ متعدد محکمے قائم کر رکھے ہیں۔ پس جبکہ تمام عاملین پیدائش ہر شخص کی جداگانہ ملک نہیں بن سکتے اور ان میں سے ہر ایک مختلف گروہ کے ہاتھ میں ہے تو پیداوار دولت کو بھی لازماً جدا جدا حصّوں میں تقسیم کرنا پڑا، تاکہ ہر مالک اپنا حصّہ لے سکے۔ چنانچہ زمیندار لگان وصول کرتا ہے، مزدور اجرت پاتا ہے، اصلدار سود لیتا ہے، آجر منافع اٹھاتا ہے اور گورنمنٹ ٹیکس لگاتی ہے۔ کس اصول کے مطابق یہ مختلف حصّے تقسیم ہوتے ہیں اور ہونے چاہئیں؟ یہ ایک نہایت اہم، پیچیدہ اور معرکۃ الآرا مسئلہ ہے، اس پر نہایت قابلیت سے بہت کچھ لکھا جا چکا اور لکھا جا رہا ہے؛ ہم بھی اس حصے میں اسی بحث کا ایک سادہ خاکہ پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔

یہاں پر یہ واضح کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ لگان، اجرت، سود اور منافع اصطلاحی معنوں میں ایک دوسرے سے بالکل جدا اور ممیّز ہیں۔ لیکن عرف عام میں یہ اکثر مخلوط بھی کر دیے جاتے ہیں: مثلاً اجرت سے مراد پیداوار کا صرف وہ حصّہ ہے جو محنت کا ماحصل ہو لیکن اجرتِ عرفی میں اکثر مزدور کے اصل کا سود بھی شامل ہوتا ہے۔ لوہار، بڑھئی یا درزی کو جو اجرت دیجاتی ہے، وہ نہ صرف اسکی محنت کا معاوضہ ہوتا ہے بلکہ بشکل آلات، جو اصل وہ کام میں لگاتا ہے اسکا سود بھی جزواً اسمیں داخل ہوتا ہے: علیٰ ہذا لگان یعنی زمین کے ماحصل زائد میں کاشتکار کے ہل، بیل، چرس، زمیندار کے کنوئیں وغیرہ جیسے، اصل کا سود بھی شمار کر لیا جاتا ہے؛ ساہوکار کے سود میں لین دین چلانے کی محنت کی اجرت اور دوسرے مصارف کا معاوضہ بھی شریک ہوتا ہے؛ منافع میں بھی اجرتِ تنظیم کے علاوہ آجر کے ذاتی اصل کا سود اور بطالیات خطر داخل ہوتے ہیں۔ اختصار بیان اور سہولت حساب کی غرض سے اگر زبان عرفی میں یہ جداگانہ حصے حسبِ ضرورت مخلوط کر دئے جائیں تو کچھ مضائقہ نہیں، لیکن ان کے حقیقی مفہوم اور اختلاط کی ماہیت سے واقف ہونا ضروری ہے۔

باب دہم

لگان

(۱) لگان کی ماہیت (۲) قانونِ تقلیل حاصل کا تعلق لگان سے (۳) پیدائشِ لگان کے شرائط (۴) اقسام لگان (۵) لگان مصارف پیدائش کا جزو نہیں ہوتا (۶) لگان کیونکر بالواسطہ مصارفِ پیدائش کا جزو بن سکتا ہے (۷) قیمتِ پیداوار اور لگان کا تعلق (۸) زرعی ترقیات کا لگان پر اثر (۹) ملکِ اراضی اور کاشت (۱۰) زمینداری لگان (۱۱) سرکاری مالگزاری (۱۲) زمین کو قومی ملک بنانے کی تجویز۔

لگان کی ماہیت

۱۔ لگان کا مسئلہ، ملکی بہبودی اور مرفہ الحالی کے لحاظ سے جسقدر اہم اور قابل توجہ ہے، اسی قدر پیچیدہ اور بحث طلب ہے؛ اس کے اسباب گوناگوں اور پیچ در پیچ، اثرات ناقابل تفریق، اور تخمینی اصول دقیق و تشریح طلب، فروعات کثیر و گنجان۔ ترک تفصیل سے مسئلہ سمجھنا آسان، لیکن تنگی نظر سے مغالطے میں پڑنا بھی اغلب۔ ہم صحت معلومات کو سہل فہمی پر ترجیح دیتے ہیں: چنانچہ ماہیت سمجھنے کے واسطے جس قدر تفصیل ضروری معلوم ہوئی بلا تامل اختیار کی گئی ہے اور ساتھ ہی اس کے غیر ضروری پیچیدگیاں ترک بھی کر دی گئیں تاکہ یہ مسئلہ ع "شد پریشاں خوابِ من از کثرتِ تعبیرہا" کا مصداق نہ بن جائے۔ مگر باوجودیکہ صفائی اور سلاست کی بیحد کوشش کی گئی اس مسئلہ کی تحقیق پھر بھی خاص توجہ کی محتاج ہے۔

عرفِ عام میں لگان سے پیداوار زمین کا وہ حصہ مراد ہے جو کاشتکار زمیندار یا سرکار کو بموجب رواج یا معاہدہ دیتا ہے۔ لیکن معاشی لگان ایک بالکل مختلف چیز ہے

جو قوانینِ قدرت کے عملدرآمد سے پیدا ہوتا ہے۔ اول ایک مثال دیکھ کر ہم اس کی ماہیّت بیان کریں گے:۔

فرض کرو کہ دس ہزار من گیہوں کسی منڈی میں فروخت کے لیے آئیں۔ ظاہر ہے کہ یہ مقدار بہت سے مختلف الحالات کھیتوں کی پیداوار کا مجموعہ ہے۔ اب تقریباً کھیت کے مصارف پیدائش کی نسبت مختلف اور جداگانہ ہوگی: مثلاً دو اور تین روپے کے درمیان، اس کے بیشمار مدارج ہوسکتے ہیں۔ قلیل فرقوں کو نظرانداز کرکے ان کھیتوں کے چند بڑے بڑے طبقے بنائے جاسکتے ہیں، جن کی نسبت مصارف میں نمایاں فرق پایا جائے: مثلاً تین درجے مقرر کیے جائیں، اعلیٰ، متوسط، اور ادنیٰ، جن کے مصارف کی نسبت علی الترتیب دو روپے ڈھائی روپے اور تین روپے من ہو۔ لیکن باوجود فرق مصارف، منڈی میں گیہوں کا نرخ یکساں ہوگا، اور اگر مانگ اسقدر زیادہ ہو کہ ادنیٰ کھیتوں کے گیہوں خریدے بغیر نہ رہا جاسکے تو نرخ تین روپے من سے کسی حالت میں کم نہ ہوگا۔ ادنیٰ کھیت کا کاشتکار اگر حاصل زائد بھی نہ پاسکے تو ایسی حالت میں کم از کم مصارفِ پیدائش تو ضرور پیداوار کی قیمت سے وصول کرسکیگا۔ اعلیٰ اور متوسط کھیتوں کے کاشتکار تین روپے من کے نرخ سے علی الترتیب ایکروپیہ اور آٹھ آنے من نفع اٹھائیں گے، اور یہی حاصل زائد، جو فرق مصارف کی موافقت سے پیدا ہوتا ہے، معاشی اصطلاح میں لگان کہلاتا ہے۔

یہاں نرخ کے متعلق دو نکتے واضح کرنے ضروری معلوم ہوتے ہیں: بحثِ بالا سے تعین نرخ کا یہ اصول تحقیق ہوگیا کہ جس قدر مقدار مطلوب ہوتی ہے اس کا نرخ بیشترین مصارفِ پیدائش کی نسبت سے کم نہیں ہوسکتا، ہمیشہ برابر یا کچھ زیادہ ہوگا۔ مساواتِ نرخ کا مفروضہ جو بظاہر خلافِ واقعات معلوم ہوتا ہے تشریح طلب ہے۔ ایک ہی جنس کے چند حصوں کا نرخ بلحاظ خوبی مختلف ہوتا ہے، اور درحقیقت کل مقدار ایک نرخ سے فروخت نہیں ہوتی۔ لیکن اگر متوسط خوبی کی پیداوار کا نرخ معیار قرار دیکر اعلیٰ خوبی والی کے نرخ کا اضافہ تخفیف مصارف شمار کریں اور ادنیٰ خوبی والی کے نرخ کی کمی ازدیادِ مصارف سمجھیں تو باوجود فرق خوبی و اختلافِ نرخ، مساوات نرخ کا نتیجہ حاصل ہوگا، اور لگان کی بحث میں اس مفروضے سے یہی مراد ہے۔

صاف ظاہر ہے کہ بوجہ افزونی آبادی و معاشی ترقیات، پیداوارِ زمین کی طلب جس قدر زیادہ ہوگی ادنیٰ زمینوں پر کاشت پھیلتی جائیگی، جیسا کہ آجکل خود ہندوستان میں ہورہا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ اعلیٰ و متوسط زمینوں کے لگان میں بھی اضافہ ہوگا۔ اس کے برعکس اگر کسی وجہ سے طلب میں کمی آجائے تو ادنیٰ کھیتوں کی کاشت رفتہ رفتہ ترک ہوکر باقی کھیتوں کے لگان میں بھی تخفیف ہوجائیگی۔ پس ثابت ہوا کہ مصارفِ پیدائش کا فرق جس کے اسباب ہم ابھی واضح کرینگے اور جو طلب کی کمی بیشی سے گھٹتا بڑھتا ہے، لگان کا باعث ہے۔ لگان خود پانے والے کی کوشش سے پیدا نہیں ہوسکتا، بلکہ وہ اکثر غیر اختیاری اسباب کا نتیجہ ہوتا ہے؛ صرف لے لینا پانے والے کا کام ہے۔ لگان کی پیدائش میں اس کو زیادہ دخل نہیں ۔

اب ہم مصارفِ پیدائش کی تفصیل کرتے ہیں جس سے ان کے فرق کی وجہ خود ظاہر ہوجائیگی۔ معمولاً خرچ کی جو مدیں مصارف میں شمار کی جاتی ہیں، درحقیقت ان سے کہیں زیادہ مدیں مصارف میں شامل ہیں۔ گو روزمرّہ کے حسابات میں بغرض سہولت وہ نظرانداز کردی جائیں، لیکن علمی بحث میں بحیثیت جزو مصارف ان سب کا پورا لحاظ لازمی ہے: چنانچہ تخم اور کھاد کی قیمت، جتائی، نلائی، آبپاشی، رکھوالی، کٹائی، اور پیداوار کو قابل فروخت بنانے کے کل کاموں کی لاگت، کھیتی کے مویشیوں کا خرچ، ہل، بیل، اور دیگر سامانِ زراعت میں کاشتکار کا جو اصل لگا ہے، اور کنوئیں، پختہ برہے کے مثل مستقل ترقیاتِ اراضی جن میں زمیندار کا اصل صرف ہوا ہے، ان سب کا سود۔ یہ اصل قائم، دورانِ استعمال میں جس رفتار سے فرسودہ اور زائل ہورہا ہے اسکے مطابق مطالباتِ فرسودگی کی ایسی شرح سالانہ کہ بیکار ہونے تک کل اصل کی قیمت وصول ہوسکے، خود کاشتکار اور اسکے خاندانی محنت کی اجرت، نیز پیداوار کو منڈی تک لانے اور فروخت کرنے کا خرچ؛ یہ سب کچھ مصارفِ پیدائش میں شامل ہے۔ اتنے لحاظوں سے چند کھیتوں کا بھی مساوی الحالت ہونا محال ہے۔ اول تو قدرۃً زمینوں کی زرخیزی میں فرق، اسکے علاوہ کھیت تمام ملک میں منتشر؛ کوئی منڈی کے بالکل قریب، کوئی بیسیوں کوس دور، بعض ریل اور پختہ سڑکوں کے ارد گرد، بعض دور از راہ قطعات میں واقع، آبپاشی کہیں نہایت بیش خرچ اور کہیں بیحد ارزاں، زرعی ضروریات کی قیمت

جگہ جگہ مختلف، یہی حال زرعی مزدوروں کی اُجرت کا ہے، اور سب پر طرہ یہ کہ سب کاشتکار بھی یکساں ہوشیار اور محنتی نہیں۔ ان تمام اختلافات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بمشکل چند کھیتوں کے مصارف پیدائش کا اوسط برابر ہوگا ورنہ عموماً ہر کھیت کا اوسط جدا گانہ اور مختلف ہوتا ہے۔ اور جیسا کہ مثال بالا سے ظاہر ہے، ان ہی مصارف کے باہمی فرق سے لگان پیدا ہوتا ہے۔
کہتے ہیں کہ لگان، زمین کے قدرتی اور مستقل خواص سے پیدا ہوتا ہے۔ اس قول کی ایک شرح تو خواص زمین کی وہ تفصیل ہے جو اس سے قبل پیدائش دولت کے حصے میں بیان کی جا چکی ہے۔ لیکن علاوہ بریں اس قول سے ایک اور نکتے کا بیان بھی مقصود ہے، جس کی ہم یہاں وضاحت کرتے ہیں۔ فرق مصارف کے جو اسباب بیان کئے گئے اُن میں سے اکثر مثلاً زرخیزی، شرح اُجرت، نرخ ضروریات، موقع اراضی، محنت اور اصل کے زور سے بہت کچھ درست اور بہتر ہو سکتے ہیں۔ نیز یہ ممکن ہے کہ مزید پیداوار جو ان کی درستی اور بہتری سے حاصل ہو وہ اس محنت اور اصل کی معمولی اجرت اور سود کے برابر ہو یا کم رہے، یا کچھ بڑھ جائے۔ لیکن کمی و بیشی مصارف کے چند اسباب ایسے بھی ہیں جو انسان کے اختیار اور قابو سے باہر ہیں، اور اصل کا ان پر کوئی زور نہیں چلتا۔ عاملین قدرت: گرمی، بارش، روشنی اور ہوا، زراعت میں: زمین، محنت اور اصل کے دوش بدوش کام کرتے ہیں؛ اور پیداوار کی خوبی اور مقدار پر بہت بڑا اثر ڈالتے ہیں؛ ان کو مجموعاً قدرتی زرخیزی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ قدرت نے یہ عاملین مفت عطا کئے ہیں، ان کی پیدائش اور ترقی میں محنت اور اصل کا کچھ بس نہیں چلتا ہے؛ انکی موافقت سے مصارف کی نسبت بہت کچھ گھٹ سکتی ہے۔ ایسی تخفیف مصارف سے جو ماحصل زائد پیدا ہو وہ ہر حالت میں خالص لگان ہوگا حتیٰ کہ بعض علما تو معاشی لگان کی مقدار صرف اسی تک محدود کرتے ہیں، جو ماحصل زائد دیگر حالات کی موافقت سے پیدا ہوتا ہے۔ گو بظاہر لگان معلوم ہو لیکن کل یا اُس کا کوئی جزو در پردہ اس محنت اور اصل کی اجرت اور سود ہو سکتا ہے جو حالات کو موافق بنانے کی غرض سے صرف کیا گیا ہو۔ گویا آخری قسم کے ماحصل زائد کی ماہیت کم و بیش غیر متحقق ہوتی ہے، اور اس کا لگان ہونا نہ ہونا برابر ممکن ہے ؛

اسی سلسلے میں یہ نکتہ سمجھ لینے کے قابل ہے کہ اگر کسی زمین کی قیمت میں

حصہ سوم
باب نہم

لگان کا معاوضہ بھی شامل ہو تو ایسی زمین کے خریدار کے حق میں لگان بھی اصل کا سود بن جائیگا جو اس کے معاوضے میں قیمتاً دیا گیا۔ اسکے برعکس جو ماحصل زائد دوسری محنت اور اصل سے پیدا ہو: مثلاً جدید ریلوے لائن کھلنا، نہر جاری ہونا یا قرب و جوار میں منڈی قائم ہونا، تو وہ بے شک لگان شمار ہوگا۔ گویا کبھی خود لگان سود بن جاتا ہے اور کبھی وہ ماحصل زائد بھی، جو اصل و محنت کا پیدا کیا ہوا ہو، لگان ہو سکتا ہے ؛

یہ ماننا پڑتا ہے کہ مصارف پیدائش کا نہ تو کوئی اسقدر مفصل حساب رکھتا ہے اور نہ رکھ سکتا ہے۔ خاص خاص مصارف: مثلاً اجرت مزدوراں، خرچ آبپاشی، قیمت تخم و کھاد وغیرہ کا کاشتکار صرف تخمینہ کر لیتا ہے، صحیح مقدار انکی بھی نہیں جانتا۔ اسی وجہ سے کھیت کے معاشی لگان کی ٹھیک مقدار معلوم کرنا نہایت دشوار اور اہتمام طلب ہے۔ مگر تمام حالات متعلقہ بغور مطالعہ کر کے صرف لگان کے پیدا ہونے نہ ہونے اور اسکے گھٹنے بڑھنے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مصارف پیدائش سے خالص لگان کا جدا کرنا محال ہے۔ البتہ اس کی پیدائش اور کمی بیشی کے عام اصول بخوبی تحقیق ہو چکے ہیں اور علمی اغراض کے واسطے ان کو جاننا کافی ہے ؛

قانون تقلیل حاصل کا تعلق لگان سے

۴ - قانون تقلیل حاصل کو جو پیداوار زمین پر خاص طور سے مسلط پایا جاتا ہے اور جس کی تشریح خواص زمین کے بیان میں کی جا چکی ہے، مسئلہ لگان کا اصل بنیاد سمجھنا مبالغہ نہ ہوگا۔ اگر یہ قانون ہر کھیت کی کاشت کی حد معین نہ کرتا تو اعلیٰ درجے کے متوسط اور ادنیٰ درجے کے کھیت کبھی نہ بوئے جاتے اور موجودہ طریق سے لگان حاصل نہ ہوتا۔ لیکن اس سے یہ خیال کرنا کہ پیدائش لگان کے واسطے ادنیٰ زمینوں کی کاشت لازمی ہے درست نہ ہوگا۔ بلکہ بفرض محال اگر تمام کھیتوں کی زرخیزی، محل وقوع اور مصارف پیدائش کی نسبت سب یکساں ہوں، تو بھی اس قانون کے عمل سے لگان پیدا ہونا ممکن ہے: مثلاً محنت اور اصل کے پہلے جرعے کی پیداوار کے مصارف دو روپے فی من، دوسرے کی ۲½ روپے من، اور تیسرے کی تین روپے من ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب تک تیسرے جرعے کی پیداوار کی قیمت سے کم از کم مصارف پیدائش پورے نہ ہوں، کاشتکار تیسرا جرعہ نہیں لگا سکتا۔ پس اگر بوجہ اضافہ طلب تیسرے کی پیداوار بھی ناگزیر ہو جائے تو نرخ تین روپے من سے کم نہ ہوگا، اور ایسی حالت میں بھی

یکساں کھیتوں کے کاشتکاروں کو جرعۂ اوّل و دوم کی پیداوار پر ایک روپیہ اور آٹھ آنے من
لگان حاصل ہو سکیگا اور یہ محض اسی قانون کا نتیجہ ہوگا ؁

پس صاف ظاہر ہے کہ لگان، مصارف پیدائش کے فرق سے پیدا ہوتا ہے۔
یہ فرق، قانون تقلیل حاصل پر مبنی ہے: خواہ مختلف زرخیزی اور مختلف حالات کے
کھیتوں سے متعلق ہو یا یکساں حیثیت کے کھیتوں سے۔ اضافہ طلب سے اس فرق
کا اثر قوت پکڑتا ہے، اگر یکساں اور محدود زمین کاشت کے لیے میسر آسکے تاکہ قانونِ
تقلیل حاصل کے عمل کی نوبت ہی نہ آئے، یا پیداوار زمین قانون استقرار حاصل کی
پابند ہو، اور ہر جرعے کے مصارف یکساں ہوں، یا طلب اسقدر کمزور رہے کہ ادنےٰ
کھیتوں کی کاشت یا بیش خرچ جرعوں کے استعمال کی ضرورت پیش نہ آئے، تو ان
صورتوں میں سے کسی میں بھی لگان پیدا ہونا ممکن نہیں ؁

پیدائش لگان کے شرائط

۳۔ پیدائش لگان کی بحث میں ہم نے چند خاص حالتیں فرض کی ہیں جنکو
شرائط لازمی کہنا بیجا نہ ہوگا۔ سب سے اوّل تو کل پیداوار زیر بحث کا ایک ہی
منڈی میں فروخت ہونا، دوسرے خرید و فروخت میں کامل آزادی اور مقابلہ، تیسرے
طلب اور رسد کی قوت میں برابری۔ اوّل کی دو شرطوں کا اہم ترین نتیجہ مساوات نرخ ہے
اور شرط آخر سے نرخ کا بیشترین مصارف کے برابر ہونا یقینی ہو جاتا ہے۔ اگر پیداوار چند
منڈیوں میں فروخت ہو یا بوجہ پسماندگی نرخ، بجائے مقابلے کے، رسم و رواج اور دیگر اثرات کا
تابع ہو، یا طلب رسد سے کم ہو تو لگان پیدا ہونے کا موقع بہت کم رہ جاتا ہے۔ ایسی حالت
میں نہ نرخ کا یکساں ہونا یقینی، نہ بیشترین مصارف کے برابر ہونا ممکن: گویا شرائط قائم
نہ رہنے سے اسباب کا اثر ضعیف ہو کر لگان کا پیدا ہونا نہ ہونا محض اتفاق پر منحصر رہ جاتا ہے ؁

لگان کے اقسام

۴۔ اگر پیداوار کی طلب رسد پر غالب ہو جائے تو نرخ بیشترین مصارف پیدائش
سے بھی بڑھ سکتا ہے: مثلاً اگر ہزار من غلے کی طلب ہو اور صرف آٹھ سو من منڈی میں
موجود ہو تو باوجودیکہ بیشترین مصارف تین روپے من ہوں، نرخ کا ۳ ½ اور ۴ روپے
من تک چڑھنا دشوار نہ ہوگا۔ ایسی حالت میں ادنیٰ کھیتوں یا انتہائی جرعوں کی پیداوار سے
جو ماحصل زائد ملیگا اور اسی نسبت سے باقی کھیتوں یا جرعوں کے لگان میں جو کچھ اضافہ ہوگا
یہ کل معمولی معاشی لگان سے جداگانہ چیز ہے۔ اور چونکہ تعین رسد اور کثرت طلب سے

پیدا ہوتا ہے، اس کو لگانِ قلت کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ ایسا لگان جو اکثر فوری اسباب سے پیدا ہوتا ہے زیادہ دیرپا نہیں ہوسکتا۔ اضافۂ رسد بتدریج کچھ عرصے میں اسکو زائل کردیتا ہے۔ بہت کم زرعی پیداوار اسقدر مخصوص ہیں: مثلاً مشرقی بنگال کا جوٹ کہ جس سے عرصۂ دراز تک لگان قلت ملنا ممکن ہو۔ یہاں یہ بھی واضح کردینا مفید ہوگا کہ معاشی لگان اور لگان قلت میں کوئی بنیادی فرق نہیں، جو ماحصل زائد بیشترین مصارف کے مساوی قیمت سے پیدا ہوتا ہے وہ اوّل قسم کا لگان ہے اور جو قیمت کے مزید اضافے سے جدید ماحصلِ زائد ملتا ہے وہ امتیازاً قسم دوم شمار کیا جاتا ہے، یا بالفاظ دیگر معاشی لگان کی پیدائش میں چند ایسے کھیتوں کی کاشت یا جرعوں کا استعمال فرض کیا جاتا ہے کہ ان کی پیداوار کی قیمت مصارفِ پیدائش کے برابر ہوتی ہے۔ اور جب یہ قیمت مصارف سے بڑھ جائے تو جدید اضافہ لگان قلت متصور ہوگا۔ لیکن درحقیقت دونوں لگان، تعیّن رسد اور کثرتِ طلب یا بالفاظ دیگر قلتِ پیداوار کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر زمین کی پیداوار بھی ہوا اور روشنی کی مانند غیر محدود ہوتی تو لگان ہرگز وجود میں نہ آتا۔ زرعی زمین کی طرح سکنی زمین سے بھی لگان حاصل ہوتا ہے۔ فرق صرف اسقدر ہے کہ موقع، جو منجملہ اور بہت سے اسباب کے پہلی قسم کے لگان کا ایک سبب ہوسکتا ہے، دوسری قسم کے لگان کا خاص باعث ہوتا ہے۔ باموقع عمارت سے بمقابلہ بے موقع مساوی الحیثیت عمارت کے جو زیادہ کرایہ حاصل ہوتا ہے وہی سکنی زمین کا لگان ہے۔ اسی طرح کان کی زمین کا جو محصول لیا جاتا ہے اس کا بڑا حصہ تو معدنیات کی قیمت ہوتا ہے، باقی لگان بھی ہوسکتا ہے بشرطیکہ وہ فرق مصارف کا نتیجہ ہو۔ بعض علمانے تو لگان کے معنوں کو اس قدر وسعت دی ہے کہ اگر کسی خاص پیدائشی قابلیت کی وجہ سے کوئی شخص اپنے ہم پیشوں سے زیادہ اجرت کمائے یا کسی خاص اتفاقی آسانی سے کسی کارخانے کو دوسروں سے زیادہ منافع ملتا رہے تو اس مقدارِ زائد کو اصطلاحاً شِبہ لگان یا لگان اجارہ کہتے ہیں۔ پانے والے کی کوشش بغیر وہ محض کسی غیر اختیاری فرق کی موافقت سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس کے حاصل کرنے میں کچھ محنت اور اصل لگتا تو وہ بجائے لگان کے اجرت اور سود میں شمار ہوتا۔ اقسام کی بحث سے لگان کی سب سے زیادہ قابل توجہ خصوصیت کا پتا چلتا ہے کہ وہ ایک صفت عطیۂ ہے جو

اسباب کی قدرتی یا اتفاقی موافقت سے بلا صرف و محنت حاصل ہوتا ہے؛

لگان مصارف پیدائش کا جزو نہیں ہوتا

۵ - منڈی میں جو پیداوار آتی ہے اس کے مختلف حصوں کے صرف پیدائش میں فرق ہوتا ہے۔ لیکن کل مقدار مطلوبہ کا نرخ بیشترین مصارف کے کم از کم برابر ہوتا ہے، اسی وجہ سے کمتر مصارف والوں کو حاصل زائد ملتا ہے جسکو لگان کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ لگان کسی حصے کے مصارف میں بھی داخل نہیں اور اسی وجہ سے اسکے نرخ پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا، بلکہ اس کے برعکس یہ خود نرخ سے پیدا ہوتا ہے؛ نرخ کی کمی بیشی سے یہ بھی گھٹتا بڑھتا ہے؛ اپنی طرف سے نرخ میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ بالفاظ مختصر لگان اضافۂ نرخ کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کہ باعث: چنانچہ اگر زمیندار یا سرکار لگان (بشرطیکہ معاشی لگان کے برابر یا اس سے کم ہو) لینا چھوڑ بھی دے تو کل لگان کاشتکار کی جیب میں جانے لگیگا؛ اور نرخ پیداوار میں ترک مطالبۂ لگان سے کوئی تخفیف نہ ہوگی۔ لگان کو جزو مصارف نہ کہنے سے اسی واقعے کا اظہار مقصود ہے؛

لگان کیونکر بالواسطہ مصارف پیدائش کا جزو بن سکتا ہے

۶ - جبکہ تمام کھیتوں میں ایک ہی چیز کاشت کی جائے تو لگان نہ مصارف پیدائش کا جزو ہوتا ہے نہ اضافۂ قیمت کا باعث۔ لیکن جبکہ مختلف چیزیں کاشت ہوتی ہوں تو ایک پیداوار کا لگان دوسری پیداوار کے صرف میں بالواسطہ شامل ہو سکتا ہے۔ کسان تو وہی فصل بوئیگا جس سے سب سے زیادہ لگان ملنے کی اُمید ہو اور جبتک کم از کم اسی قدر لگان کی اُمید دوسری فصل سے نہ ہو، وہ فصل اول کی بجائے فصل دوم نہ بوئیگا؛ مثلاً کسی کھیت میں آلو کی کاشت سے پچاس روپے لگان حاصل ہو، آلو بوتے وقت کسان کو یقین ہوگا کہ اس سے زیادہ لگان بلکہ اسقدر بھی کسی دوسری فصل سے نہیں مل سکتا۔ اور اگر واقعہ بھی یہی ہو تو یہ کاشتکار بجائے آلو کے گیہوں اسی وقت بوئیگا جبکہ جدید فصل سے بھی کم از کم پچاس روپے لگان مل سکے بلکہ کسی قدر زیادہ۔ فرض کرو کہ گیہوں کی طلب بڑھے، ادنیٰ کھیتوں کی پیداوار بھی ملکر رسد ناکافی رہے، اور آلو کے کھیت میں گیہوں کے مصارف پیدائش ادنیٰ کھیتوں کے مصارف سے کم نہ ہوں، تو اس صورت میں آلو کا کل لگان گیہوں کے مصارف پیدائش کا جزو بنیگا اور اضافۂ نرخ کا باعث ہوگا۔ آلو کا لگان، گیہوں کا نرخ، بعینہ اس طرح چڑھائیگا جیسے نہر کی جھال پانی کی سطح بلند کرتی ہے۔

مثلاً ادنیٰ کھیتوں کے مانند آلو کے کھیت میں بھی گیہوں کے مصارف تین روپے من ہوں اور مقدار پیداوار سَو من : اب اگر یہ مقدار بوجہ قلت رسد ناگزیر ہو تو کاشتکار آلو کا پچاس روپے لگان گیہوں کے مصارف میں شمار کر کے تین روپے آٹھ آنے من کے نرخ سے گیہوں فروخت کریگا۔ صاف ظاہر ہے کہ آٹھ آنے فی من محض آلو کے لگان کی بدولت نرخ میں اضافہ ہوگا۔ نیز اگر آلو کے کھیت میں مصارف ادنیٰ کھیتوں سے زیادہ یا کم ہوں: مثلاً تین روپے چار آنے من یا دو روپے بارہ آنے من، تو نرخ علی الترتیب تین روپے بارہ آنے من اور تین روپے چار آنے من قرار پائیگا۔ لیکن آلو کا لگان ہر حالت میں داخل مصارف رہکر اضافہ قیمت کا باعث ہوگا۔ اس صورت میں ادنیٰ کھیتوں کو بھی ما حصل زائد ملیگا جس کو لگان قلت کہنا زیادہ موزوں ہوگا ؛

یہاں یہ واضح کر دینا غیر ضروری نہ ہوگا کہ اگر آلو کے کھیت میں گیہوں کے مصارف ادنیٰ کھیتوں کے مصارف سے اسقدر کم ہوں کہ آلو کا لگان شامل ہو کر آخر الذکر مصارف کے برابر رہیں تو گویا کسان کے نزدیک آلو یا گیہوں بونا دونوں یکساں ہے، ہر حالت میں ایک ہی لگان ملیگا۔ اور اگر اس سے کم ہوں تو گویا کاشتکار کو گیہوں کی کاشت سے بمقابلہ آلو کے زیادہ لگان حاصل ہوگا۔ اور ان دو صورتوں میں سے کسی میں بھی آلو کا لگان جزو مصارف نہ ہوگا۔ گویا آلو کا لگان گیہوں کے مصارف میں اسیوقت شامل ہو کر اضافۂ نرخ کا باعث ہو سکتا ہے جبکہ یہ مجموعی مصارف گیہوں کی ادنیٰ زمینوں کے مصارف سے زیادہ ہوں اور قلت رسد کی وجہ سے آلو کے کھیت میں پیدا ہوئے گیہوں بھی طلب پوری کرنے کیواسطے ناگزیر ہوں ؛

قیمت پیداوار اور لگان کا تعلق

۷۔ جب کسی زرعی پیداوار کی قیمت بڑھتی ہے تو نہ صرف ادنیٰ کھیتوں پر کاشت پھیلنے لگتی ہے بلکہ اعلیٰ کھیتوں کی کاشت بھی زیادہ دقیق ہوتی جاتی ہے، اور پیداوار کی بیشتر مقدار قانون تقلیل حاصل کے تحت میں پیدا ہوتی ہے۔ لیکن ہر کھیت میں اس قانون کے عمل کی رفتار یکساں نہیں، جہاں سست ہوتی ہے نسبت مصارف میں بتدریج اضافہ ہوتا ہے، جہاں تیز ہوگی چند ہی جرعوں کے مصارف کی نسبت میں بسرعت نمایاں فرق پیدا ہو جائیگا۔ اب ہم یکساں اور مختلف زرخیزی والی زمینوں کے لگان پر عمل قانون تقلیل حاصل کی سست اور تیز رفتار کے لحاظ سے اضافۂ قیمت کا اثر بذریعۂ اشکال واضح کرینگے کیونکہ محض الفاظ سے یہ مسئلہ ایسی اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہو سکتا۔ اس کے سمجھنے میں اشکال بیحد مفید ثابت ہوئی ہیں ؛

حالت اوّل: ابتدائی زرخیزی یکساں، عمل قانونِ تقلیل حاصل کی رفتار مختلف۔

پہلی شکل

(۱) سست رفتار

د ج ب ا م س ص
پیداوار
اول دوم سوم چہارم پنجم ششم ہفتم
جرعے

دوسری شکل

(۲) تیز رفتار

د ج ب ۲ م س ص
پیداوار
اول دوم سوم چہارم پنجم ششم ہفتم
جرعے
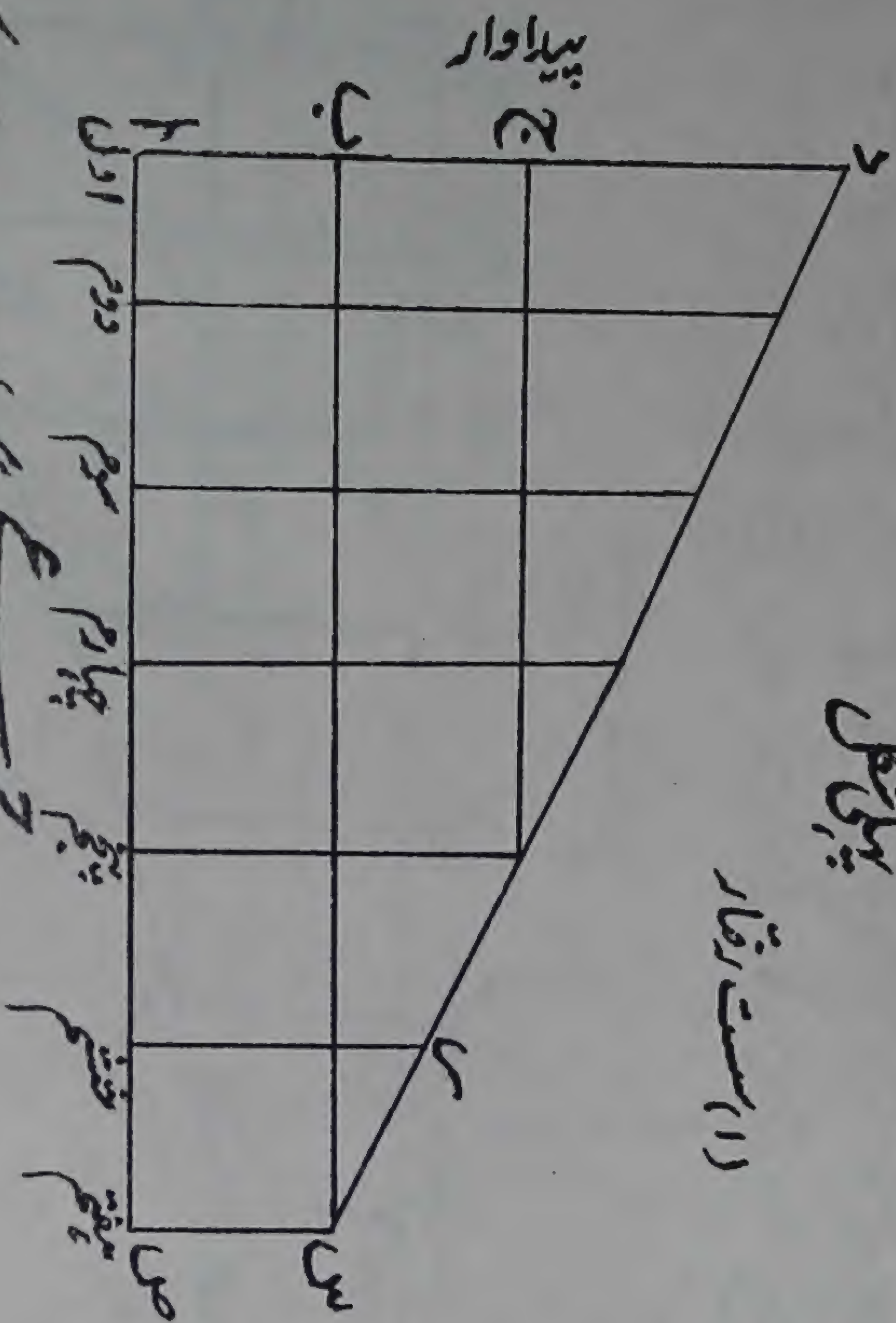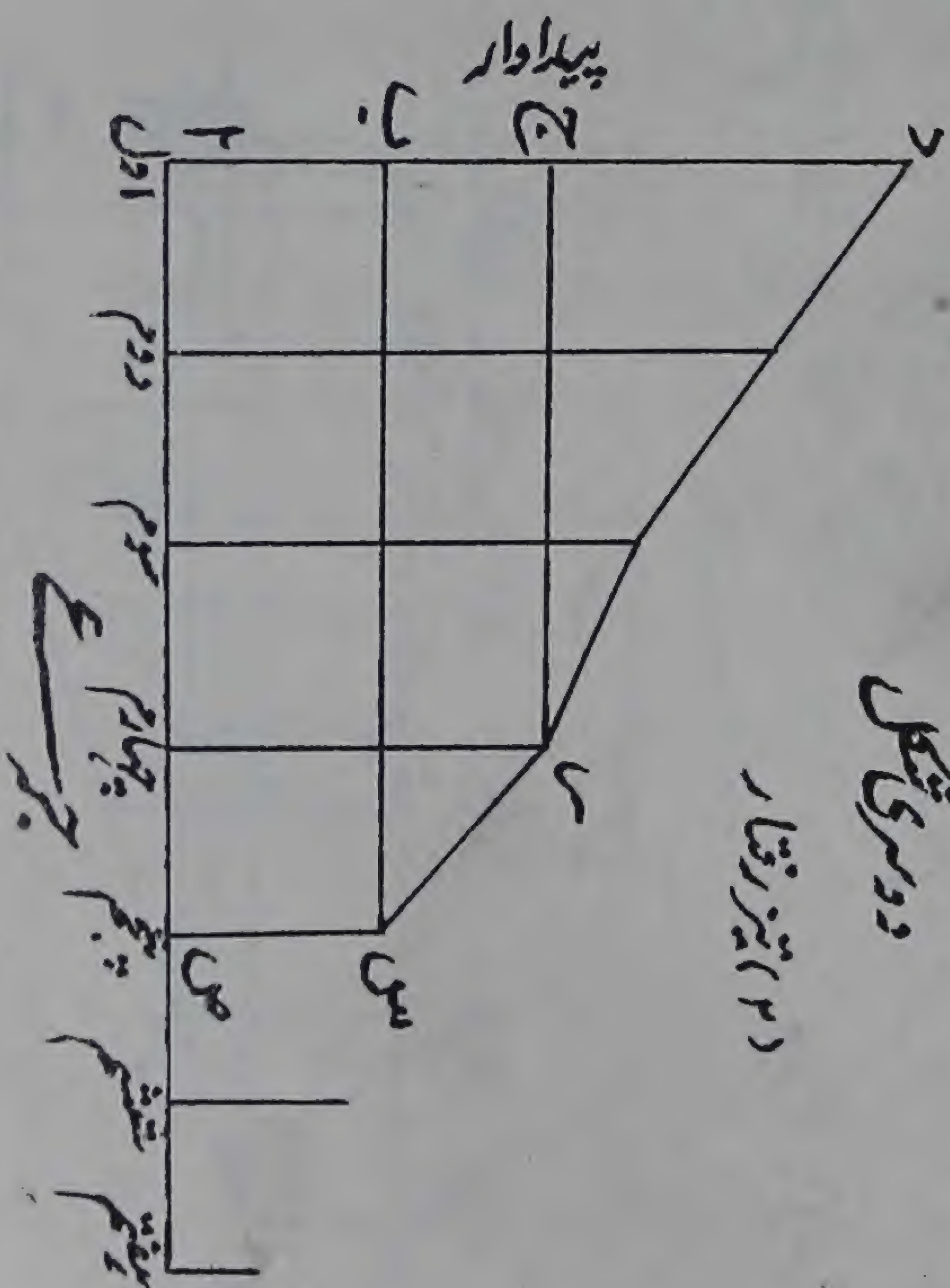
شکل اوّل میں ہر جدید جرعے کی پیداوار بتدریج گھٹتی ہے: یعنی مصارف نسبتاً آہستہ آہستہ بڑھتے ہیں اور دقیق کاشت بڑھانے کی زیادہ گنجائش ہے۔ اس کے برعکس شکل دوم میں جدید جرعوں کی پیداوار بسرعت گھٹتی ہے، اور نسبت مصارف جلد اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ کاشت دقیق پانچویں جرعے پر ختم کرنی پڑتی ہے۔ جبکہ پیداوار کا نرخ اس قدر بڑھے کہ بجائے مقدار ا ج کے اب ہر جرعے کے مصارف پورے کر دے تو لگان میں بمقدار ب ج م س اضافہ ہو کر مجموعی مقدار بجائے ج د م کے ب د س ہو جاویگی۔ مقابلے سے ظاہر ہے کہ شکل اوّل میں اضافۂ لگان ب ج م س کی مقدار نسبتاً شکل دوم کی مقدار سے بہت زیادہ ہے۔ نتیجہ نکلا کہ اضافۂ نرخ سے قانون تقلیل حاصل کے عمل کی تیز اور سست رفتار کے مطابق علی الترتیب لگان میں اضافہ کم و بیش ہوگا۔

حالتِ دوم: ابتدائی زرخیزی مختلف، عمل قانون تقلیل حاصل کی رفتار یکساں۔

تیسری شکل

(۳) زرخیزی بیشتر
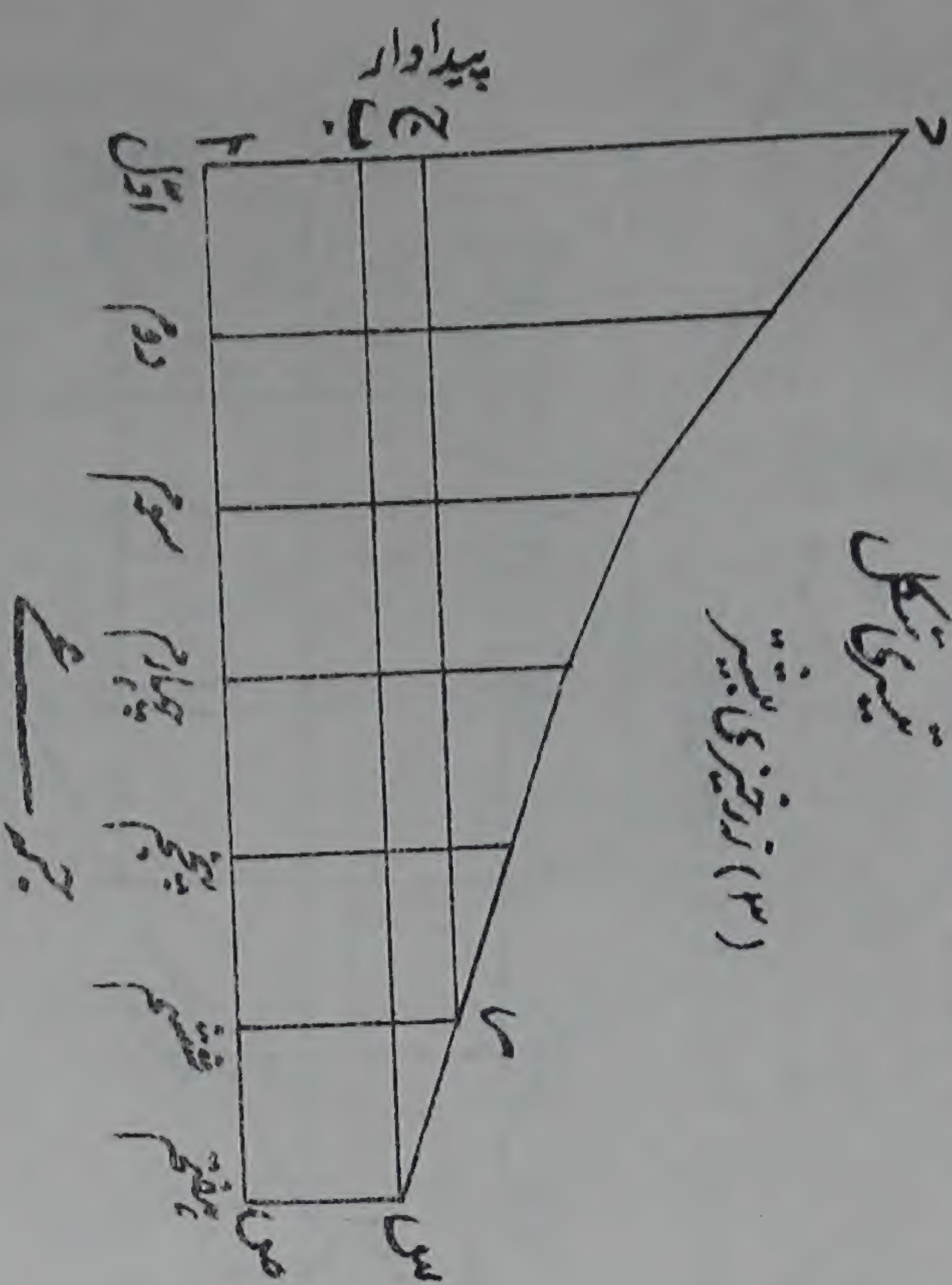
چوتھی شکل

(۴) زرخیزی کمتر
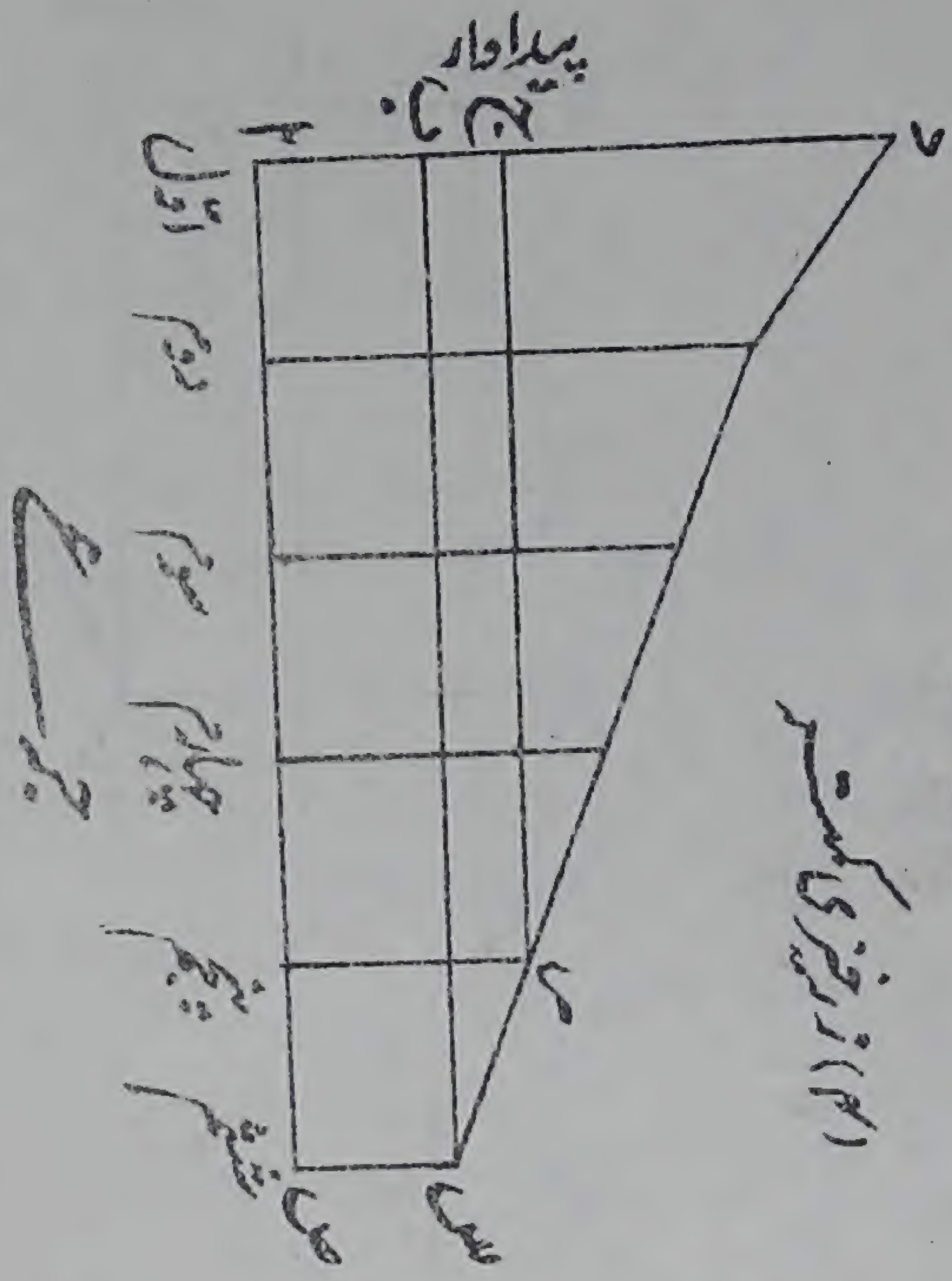
شکل ۳ کی زمین شکل ۴ کی زمین سے زیادہ زرخیز ہے، لیکن قانون تقلیل حاصل دونوں پر ایک ہی رفتار سے عمل کرتا ہے۔ اضافۂ نرخ سے جو جدید لگان ب ج م س حاصل ہوا اس کی نسبت سابق لگان ج د م سے شکل چہارم میں بمقابلہ شکل سوم کے زیادہ موافق ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگر قانون کے عمل کی رفتار یکساں ہو تو کمتر زرخیز زمین میں بمقابلہ زیادہ زمین کے لگان نسبتہً زیادہ بڑھیگا ؛

حالت سوم: زرخیزی مختلف، عمل قانون تقلیل حاصل کی رفتار مختلف

چھٹی شکل

(٦) سست رفتار

د
م
ج
ب
س
ص
۲
پیداوار
اوّل دوم سوم چہارم پنجم ششم
جرعے

پانچویں شکل

(٥) تیز رفتار

د
م
ج
ب
س
ص
۲
پیداوار
اوّل دوم سوم چہارم پنجم
جرعے
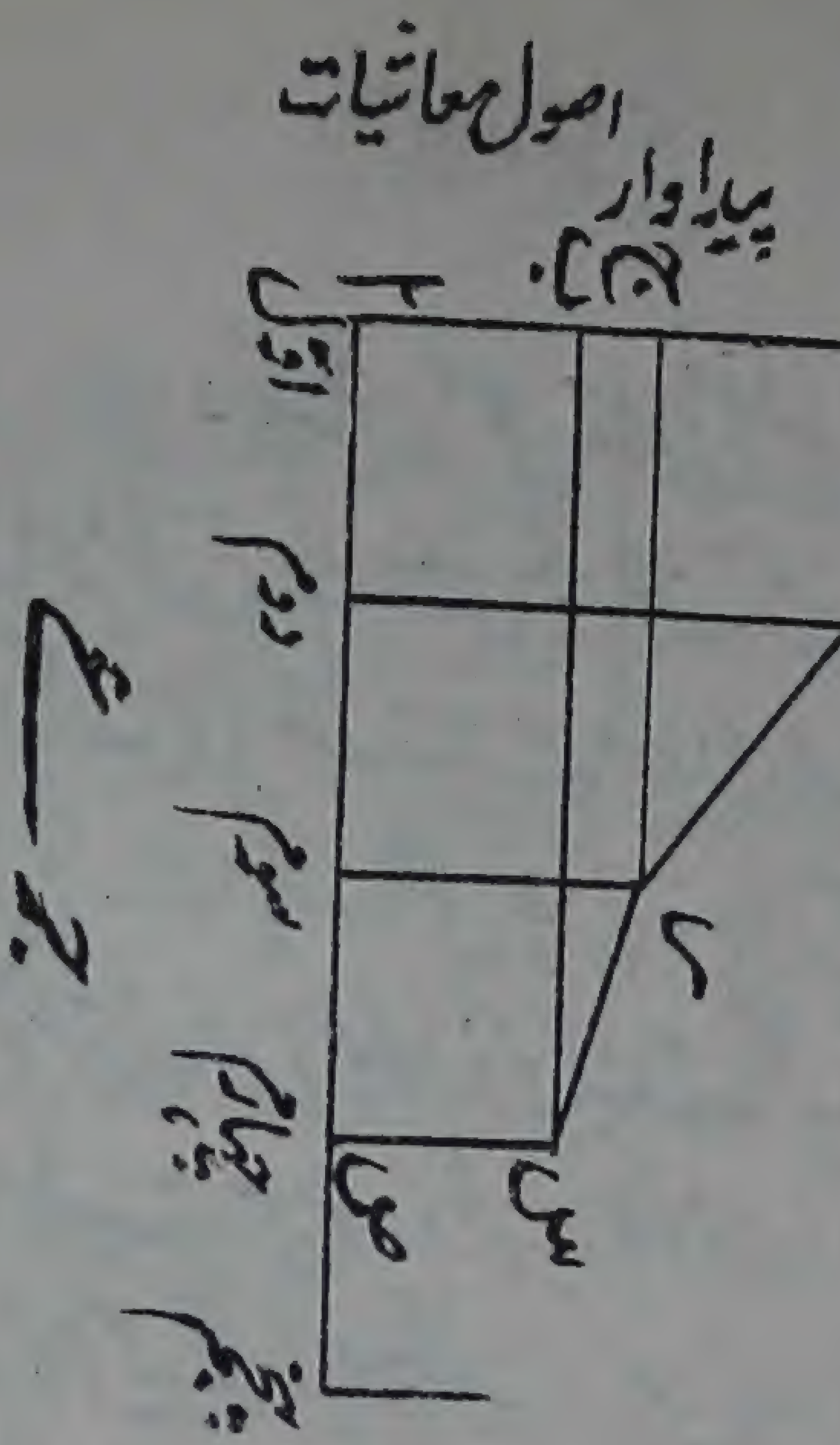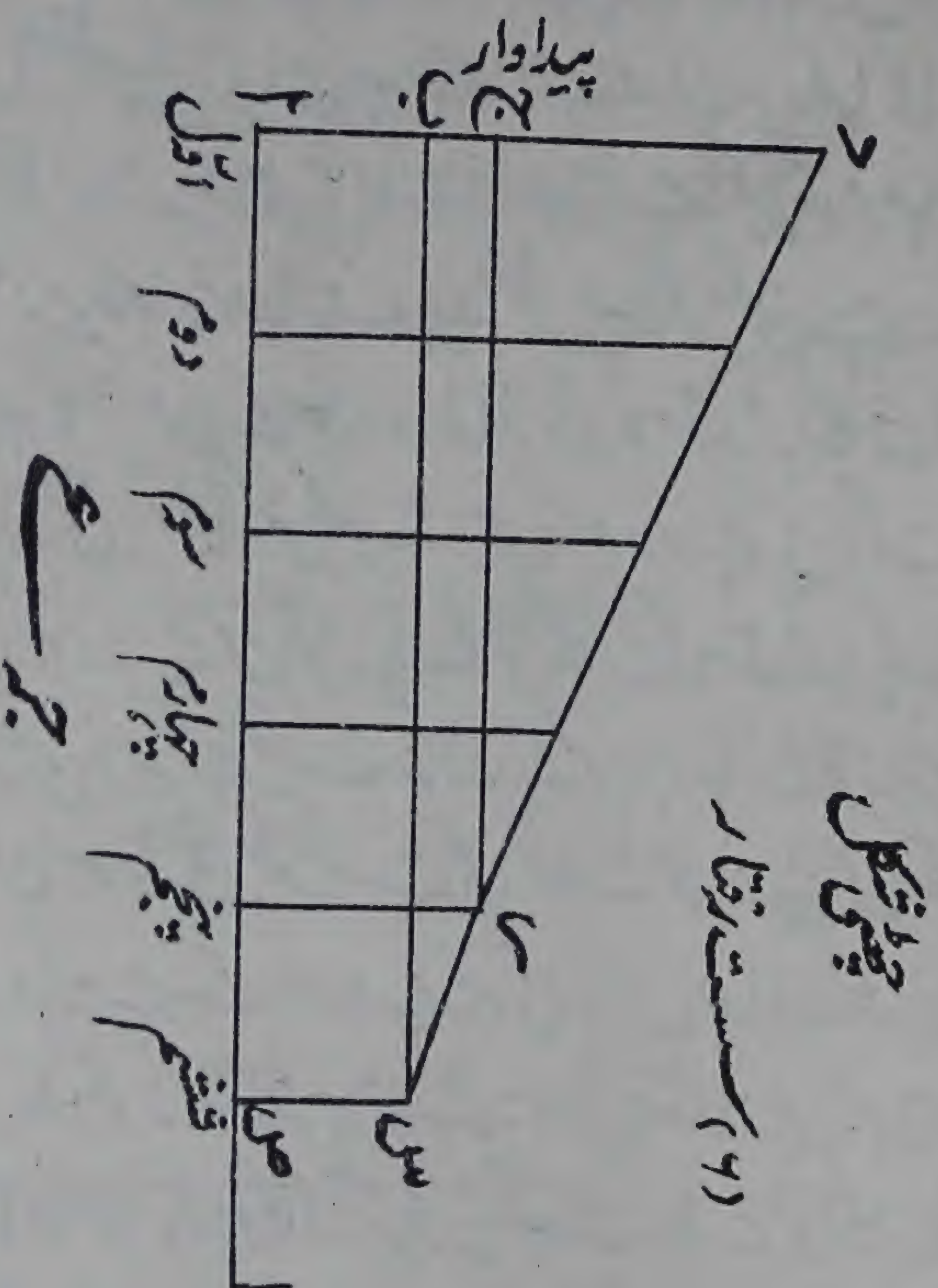
شکل پنجم کی زمین شکل ششم کی زمین سے زیادہ زرخیز ہے، لیکن ساتھ ہی اس کے زمین اول میں قانون تقلیل حاصل کا عمل نہایت تیز ہے اور زمین دوم میں سست۔ نتیجہ یہ ہے کہ نرخ بڑھنے سے رفتار عمل قانون کے فرق کی بدولت کمتر زرخیز زمین کے لگان میں بمقابلہ بیشتر زرخیز زمین کے نسبتہً زیادہ اضافہ ہوگا لیکن اس کے برعکس اگر شکل پنجم کی زمین میں قانون تقلیل حاصل کا عمل سست ہو اور شکل ششم کی زمین میں تیز، تو اضافۂ نرخ سے معکوس نتیجہ ظاہر ہوگا؛ یعنی اول الذکر زمین کے لگان میں نسبتہً زیادہ اضافہ ہوگا ٭

حالت چہارم: زرخیزی یکساں، عمل قانون تقلیل حاصل کی رفتار یکساں۔
ظاہر ہے کہ اضافۂ نرخ سے ایسی یکساں زمینوں کے لگان میں مقابلتہً کوئی فرق پیدا نہ ہوگا۔ ایک ہی نسبت سے لگان میں اضافہ ہوگا۔
مذکورۂ بالا نتائج سے ایک عملی ہدایت واضح ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر اضافۂ نرخ کی امید ہو تو کمتر زرخیز زمینوں کو جن میں عمل قانون تقلیل حاصل کی رفتار بھی سست ہو، بقیمت حیثیت موجودہ خریدنا آئندہ اضافۂ نرخ پر بہت کچھ منفعت کا باعث ہوگا؛ کیونکہ ایسے کھیتوں میں اضافۂ لگان کی نسبت سب سے زیادہ موافق ہوگی۔ چنانچہ واقع میں اعلیٰ کھیتوں کی قیمت نسبتہً اس قدر نہیں بڑھ رہی ہے جس قدر کہ اوسط اور ادنیٰ کھیتوں کی۔
مختلف اور یکساں زرخیز زمینوں کے لگان پر بلحاظ رفتار عمل قانون تقلیل حاصل اضافۂ نرخ کا اثر بالتفصیل بیان ہو چکا۔ اب صرف یہ دکھانا باقی ہے کہ کس طرح اضافۂ نرخ سے لگان میں دو طرح کا اضافہ ہوتا ہے، کیونکہ بوجہ اضافۂ نرخ بہ نسبت سابق کمتر مقدار پیداوار مصارف پیدائش پورا کر سکتی ہے۔ اوّل تو مقدار لگان میں اضافہ ہوگا، اس کے علاوہ اضافہ شدہ مقدار لگان کی قیمت بھی اسی نسبت سے بڑھ جائیگی: مثلاً کسی کھیت میں ۲۰ روپے کی لاگت سے ۶ من غلہ پیدا ہو، اب اگر نرخ ۴ روپے من قرار پائے تو لگان کی مقدار ایک من قیمتی ۴ روپے ہوگی۔ اور اگر کسی وجہ سے قیمت ۵ روپے من ہو جائے تو نہ صرف لگان کی مقدار ایک من سے دو من ہو جائیگی بلکہ قیمت بھی بجائے ۴ روپے من کے ۵ روپے من ہو جانے سے بجائے ۸ روپے کے ۱۰ روپے ہوگی۔ پس صاف ظاہر ہے کہ اضافۂ نرخ سے لگان میں دوگونہ اضافہ ہوتا ہے؛ اول مقدار میں، دوم اس کی قیمت میں۔ اب یہ سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ اگر نرخ گھٹ جائے تو لگان میں اسی طرح دوگونہ تخفیف ہوگی؛ اول مقدار میں، دوسرے اس کی قیمت میں۔

زرعی ترقیات کا لگان پر اثر

۸۔ زرعی ترقیات کی دو قسمیں ہو سکتی ہیں: ایک وہ کہ صرف مصارف پیداوار میں تخفیف کریں اور مقدار پر ان کا کچھ اثر نہ ہو: مثلاً جدید ریلوے لائن یا پختہ سڑک کا اجرا، قرب و جوار میں نئی منڈی کا قیام۔ دوسرے وہ کہ زمین کی زرخیزی بڑھا کر

کے ساتھ ہر جریب اور ہر کھیت کی قوتِ پیدائش میں اضافہ کریں، گویا تخفیف مصارف کے ساتھ مقدار پیداوار میں بھی اضافہ ہو: مثلاً کھاد، آبپاشی، زرعی محنت کی ارزانی، جدید آلات کا رواج اور طریق کاشت کی ترقی۔ اب ہم دونوں قسم کی ترقیوں کے نتائج سے جداگانہ بحث کرتے ہیں:-

۱۔ ترقی قسم اوّل: مقدار پیداوار قائم، مصارف میں تخفیف۔

اس ترقی سے اگر صرف اعلیٰ زمینیں مستفید ہوں اور ادنیٰ زمینیں بالکل محروم رہیں تو نرخ میں کوئی تخفیف نہ ہوسکیگی؛ صرف اعلیٰ زمینوں کا لگان اور بڑھ جائے گا۔ اس کے برعکس اگر یہ ترقی صرف ادنیٰ کھیتوں تک محدود ہو تو نرخ ضرور گھٹ جائیگا اور اعلیٰ کھیتوں کے لگان میں دوگونہ تخفیف ہوگی۔ لیکن اگر اعلیٰ ادنیٰ دونوں زمینیں یکساں مستفید ہوں یعنی سب کے مصارف میں بمقدار معین برابر تخفیف ہو تو نرخ گھٹیگا اور مقدار لگان میں اضافہ ہوگا؛ لیکن لگان کی قیمت میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ یہ پیچیدہ نتیجہ شکل ذیل سے بآسانی سمجھ میں آسکے گا:-

ساتویں شکل
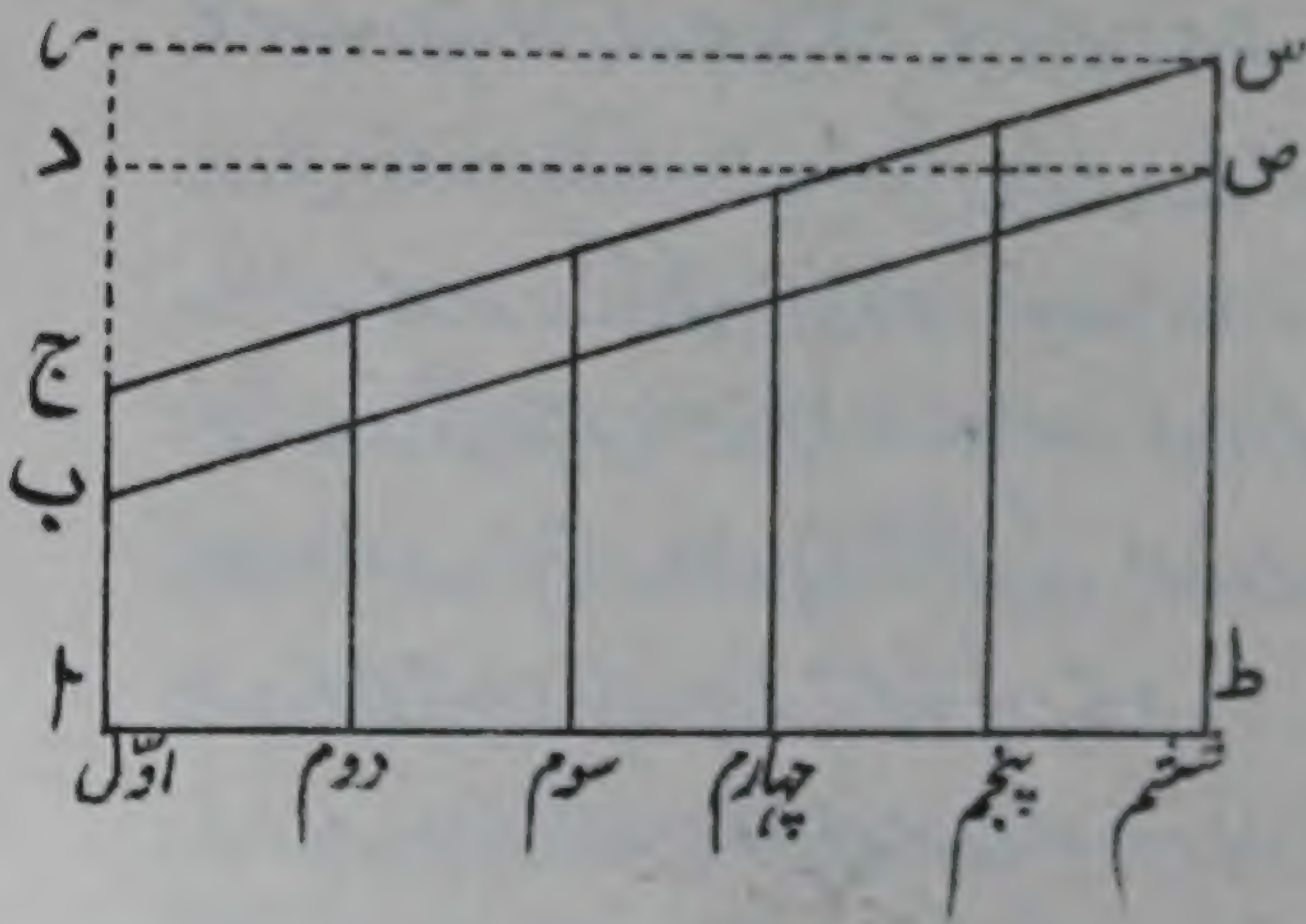
اس شکل میں اول کمترین و بیشترین مصارف اور قیمت لگان علی الترتیب اج۔طس اور ج ہس تھے۔ زرعی ترقیات کی بدولت مصارف میں بقدر ص س برابر تخفیف ہو کر ہر سہ مذکورۂ بالا میں علی الترتیب اب۔طص اور ب دص ہو گئیں۔ اصول اقلیدس کی رو سے ج ہس اور ب دص

دونوں مثلث برابر ہیں۔ گویا قیمتِ لگان میں اس تبدیلی سے کوئی فرق نہیں آیا؛ لیکن چونکہ نرخ میں تخفیف ہوگئی، ظاہر ہے کہ بہ نسبت سابق لگان کی مقدار بڑھ گئی ہوگی۔ واضح ہو کہ ادنیٰ اور اعلیٰ تمام کھیتوں کو جن کی پیداوار زیر بحث ہے ایک قطعۂ اراضی تصور کر کے ہر ایک کے مصارف بترتیبِ اضافہ اس شکل میں دکھا کر تخفیف مصارف کا اثر لگان کی مجموعی مقدار و قیمت پر دکھایا جا سکتا ہے۔ زمینوں کے جداگانہ لگان میں جو تبدیلیاں واقع ہوں گی وہ اسقدر گوناگون ہو سکتی ہیں کہ ان کے متعلق کوئی عام اصول قرار نہیں دیا جا سکتا۔

ب۔ ترقی قسم دوم: پیداوار میں اضافہ، نسبت مصارف میں تخفیف۔

ظاہر ہے کہ بوجہ اضافۂ پیداوار نرخ میں تخفیف ہوگی: فرض کرو کہ صرف اعلیٰ زمینوں پر ان ترقیات کا عملدرآمد ممکن ہے؛ اب اگر تخفیفِ مصارف کمی نرخ سے زیادہ رہے اور باوجود کمی نرخ اعلیٰ زمینوں کے لگان میں تخفیف مصارف کی بدولت اضافہ ہو سکے تو یہ ترقیات اعلیٰ زمینوں میں پیدا کی جائیں گی اور بقدر اضافۂ پیداوار ادنیٰ زمینوں کی کاشت رفتہ رفتہ ترک ہو جائیگی۔ نتیجہ یہ کہ نرخ گھٹ جائیگا اور لگان میں بھی اضافہ نہ ہو سکے گا۔ اس کے برعکس اگر کمی نرخ تخفیف مصارف پر غالب ہو اور نرخ کی کمی سے باوجود تخفیفِ مصارف لگان گھٹنے کا اندیشہ ہو تو اعلیٰ زمینیں ان ترقیات سے قصداً محروم رکھی جائیں گی اور باوجود امکان یہ ترقیاں وجود میں نہ آ سکیں گی۔ ادنیٰ زمینوں کی کاشت حسب سابق جاری رہیگی اور نرخ بھی قائم رہیگا۔

دوسرے فرض کرو کہ صرف ادنیٰ زمینوں تک یہ ترقیاں محدود ہوں، تو ان کے پیدا کرنے سے ادنیٰ زمینوں کو کچھ نہ کچھ ضرور فائدہ ہوگا۔ غالباً نرخ میں بقدر تخفیف مصارف جلد کمی نہ ہو سکے گی اور کم از کم کچھ عرصے تک مزید حاصل ملنا ممکن ہوگا۔ ایسی حالت میں اعلیٰ زمینیں بے بس اور لاچار ہونگی اور ادنیٰ زمینوں کی ترقیات کا نتیجہ بذریعۂ کمی نرخ اعلیٰ زمینوں کے لگان کی

وہی دوگونہ تخفیف ہوگی۔ لیکن اگر کل اعلیٰ و ادنیٰ زمینیں ان ترقیات سے یکساں مستفید ہو سکیں یعنی سب کی پیداوار میں برابر بقدر معین اضافہ ہو سکے تو بوجہ اضافۂ پیداوار نرخ میں کمی ہو کر اکثر ادنیٰ زمینوں کی کاشت اور آخری جرعوں کا استعمال ترک ہو جائے گا اور لگان میں وہی دوگونہ تخفیف ہوگی۔ یہ نتیجہ بھی شکل ذیل سے صاف ظاہر ہوگا:

اس شکل میں ایک ہی معین جرعے کی بیشترین اور کمترین پیداوار اعلیٰ اور ادنیٰ زمینوں سے

آٹھویں شکل

ر
د
ج
س
ب
ص
ا
ط
ع
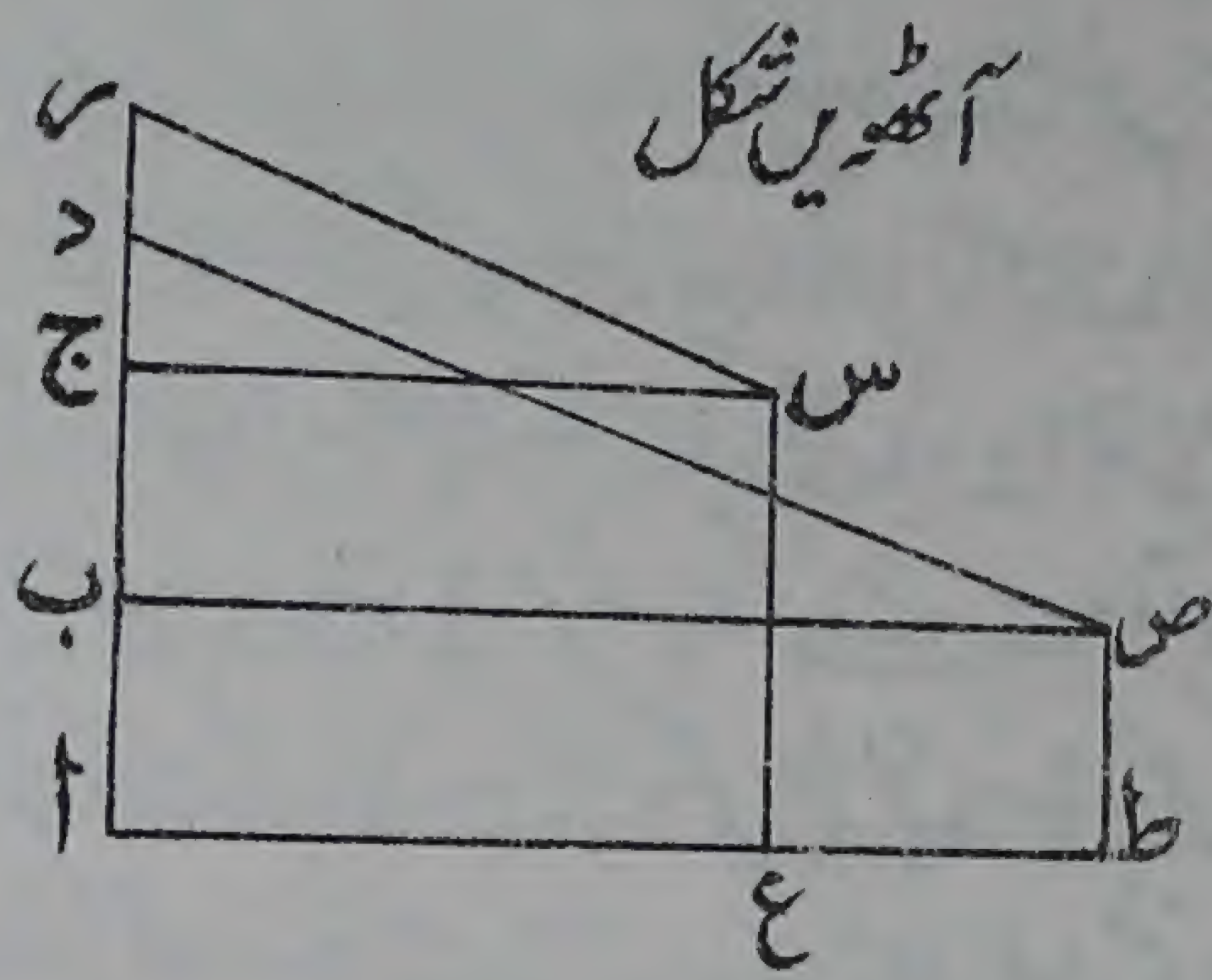
علی الترتیب ا د اور ص ط ہے، ا سے ط تک کل زمینیں کاشت ہوتی ہیں، مقدار ا ب ص ط مصارف کاشت ادا کرتی ہے اور ب د ص داخل لگان ہے۔ اب ترقیات کی بدولت ہر جرعے کی پیداوار بقدر د ر برابر بڑھ جائے اور پیداوار کی مقدار ا ر س ع، مقدار ا د ص ط کے برابر ہو تو صرف ا سے ع تک زمینیں کاشت ہونگی اور ع سے ط تک کی کاشت بتدریج ترک ہو جائیگی۔ مقدار ا ج س ع مصارف پورے کریگی اور مقدار ج ر س لگان بنجائیگی جو کہ سابق مقدار لگان ب د ص سے مقابلۃً بہت کم ہے۔ گویا ترقیات کی بدولت نرخ میں کمی ہوگی، ادنیٰ کھیتوں کی کاشت اور آخری جرعوں کا استعمال ترک ہوگا، اور لگان میں دوگونہ تخفیف ہو جائیگی۔ اس شکل میں بھی ہم نے مثل شکل نمبر ۷ کل زمینوں کو ایک قطعۂ اراضی تصور کر کے ترقیات کا اثر لگانکی مجموعی مقدار اور قیمت پر ظاہر کیا ہے۔ ہر زمین کی جداگانہ تبدیلیوں کے متعلق بوجہ کثرتِ اختلافات کوئی عام اصول قرار نہیں دیا جا سکتا:

واضح ہو کہ ترقیات کا لگان پر جو اثر پڑتا ہے، اس کا ہر حال میں صحیح صحیح پتا لگانا محال ہے؛ ہم نے صرف چند نہایت عام اصول قرار دینے کی کوشش کی ہے؛ لیکن تغیر حالات سے ان اصول کے عملدرآمد میں بیحد ردّ و بدل ممکن ہے۔ یہ جتانا بھی لازمی ہے کہ مذکورۂ بالا نتائج چند ایسے مفروضات پر مبنی ہیں جو ہمیشہ واقعات کے مطابق نہیں ہو سکتے۔ وقت اور پیچیدگی سے بچنے کے لیے ہم نے کل نتائج میں طلب کو معین اور غیر متبدل فرض کیا ہے؛ حالانکہ طلب میں برابر کمی بیشی ہوتی رہتی ہے اور اس تبدیلی سے نتائج کی صحت پر بہت کچھ موافق یا مخالف اثر پڑ سکتا ہے۔ اسی طرح حسب ضرورت بعض نتائج میں پیداوار کے اضافے اور مصارف کی تخفیف کو بھی یکساں بمقدار معین فرض کیا ہے؛ حالانکہ اکثر یہ تبدیلیاں ہر زمین میں بمقدار مختلف ہوتی ہیں۔ یہ اعتراض بجا نہ ہوگا کہ خلاف واقع حالات فرض کر کے نتائج مرتب کرنے سے واقعات سمجھنے میں کیا مدد مل سکتی ہے۔ تحقیق کا یہ بھی ایک مسلمہ علمی طریق ہے جس کو طریق تسہیل کہتے ہیں، پیچیدہ مسائل کے سلجھانے میں اس سے بیحد مدد ملتی ہے؛ چند عام مفروضات متعلقہ کو خواہ ایک حد تک وہ بعید از واقع ہی کیوں نہ ہوں، سیدھے سادے اصول قرار دے کر بتدریج واقعات کے اثر کا لحاظ کر کے ان عام نتائج میں ردّ و بدل کرنے سے بالآخر نتائج واقعات کے مطابق بنائے جاتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ کسی دوسرے طریق سے بعض پیچیدہ مسائل کا حل کرنا اگر محال نہیں تو بدرجہا دشوار ضرور ہوگا۔ مسئلہ لگان کے مختلف پہلوؤں پر اس وقت تک جو کچھ کہا گیا، اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس بحث کا تعلق سال بسال جیسے مختصر دوران وقت کے بجائے سالہا سال کے وسیع زمانے سے ہوتا ہے، تمام اسباب و نتائج متعدد سال کے عرصے پر مبنی ہیں۔ سالانہ عارضی تبدیلیاں اس بحث میں ناقابل لحاظ سمجھی جاتی ہیں۔

ملک اراضی اور کاشت

۹۔ اکثر مہذب ممالک میں زمینداروں کا ایک ممتاز گروہ ایسا پایا جاتا ہے کہ بیشتر زرعی زمینیں ان کی ملک ہوتی ہیں۔ لیکن خود کاشت کرنے کے بجائے وہ اکثر پیداوار کے مقررہ حصے یا رقم معین کی فصلانہ ادائی کے معاوضے

کے واسطے میں جس کو قانوناً لگان کہتے ہیں، دوسرے لوگوں کو وقت معین
اپنی زمین پر کاشت کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں: چنانچہ ہندوستان
میں بھی یہی طریق بکثرت رائج ہے۔ ملک اور کاشت کی موجودہ علیحدگی
سے زراعت کی ترقی میں بڑی رکاوٹیں پیش آرہی ہیں جن کو رفع کرنے میں
قانون بہت سرگرمی سے مصروف نظر آتا ہے۔ چونکہ کاشتکار کا تعلق
زمین سے محض چند روزہ ہوتا ہے، اور اضافہ لگان کا بھی اندیشہ لگا رہتا
ہے، وہ کھیت کی درستی اور کاشت کی ترقی میں ایسی جان توڑ کوشش نہیں
کرتا جیسی کہ خود مالک ہونے کی حالت میں کرتا اور سچ پوچھو تو اس کا ایسا
کرنا محض اقتضائے فطرت ہے۔ تعلق کے عارضی ہونے کا خیال اور ماحصل
کے ایک جزو سے بھی محروم رہنے کا اندیشہ خود قدرۃً کوشش کے منافی ہے۔
قانون ان موانع کا زور توڑنے کی بہت کوشش کر رہا ہے، زمیندار کو خود
اس کے ذاتی نفع کے دباؤ سے زیادہ زیادہ عرصے کے واسطے کاشتکار کو
حق کاشت دینے کی بدرجۂ مجبوری ترغیب دیتا ہے، اضافۂ لگان پر
طرح طرح سے حدود اور بندشیں قائم کرتا ہے، اور بیدخلی کے وقت
کاشتکار کو زمیندار سے ان تمام ترقیات کا معاوضہ دلاتا ہے جو کاشتکار نے
اپنے صرف سے کھیت میں پیدا کی ہوں۔ بعض صورتوں میں کاشتکاروں کو
تقریباً نیم ملک کی حد تک حقوق دے دیے جاتے ہیں، ان پر لگان بڑھانا
نہایت دشوار اور ان کو بیدخل کرنا شاذونادر ممکن ہوتا ہے، اور بعض بیدخلی
سے قطعاً مستثنیٰ کر دیے جاتے ہیں۔ ان حقوق کے پیدا ہونے کی شرائط جو
قانون نے مقرر کی ہیں وہ بھی زیادہ سخت نہیں، ایسے خاص حقوق والے
کاشتکار دخیل کار، اور باقی عام غیر دخیل کار کہلاتے ہیں۔ غرضکہ قانون نے
کاشتکار کو اضافۂ لگان، بیدخلی اور معاوضۂ ترقیات کے لحاظ سے زمیندار
کے جبر و تشدد کے مقابلے میں بہت معقول امان دی ہے۔ اور غرض واحد
یہی ہے کہ کاشتکار ترقی زراعت میں دل سے کوشش کرے اور اپنی کوشش کا
پھل پائے ؛

حصۂ سوم
باب دہم

زمیندار و کاشتکار اور خود کاشت زمیندار کے دو طریق مروّج ہیں۔ اوّل بہت عام ہے، لیکن دوم بدرجہا بہتر ہے۔ ملک اور کاشت کی جدائی جس قدر ترقی زراعت کے منافی ہے ان کی یکجائی اسی قدر معاون ہے۔ چنانچہ قانون کا خاص منشا طریق اول کو حتی الوسع طریق دوم کے مشابہ بنانا قرار پا چکا ہے۔ معاشئین کا ایک گروہ سرکار و کاشتکار کا طریق تجویز کرتا ہے: گویا قوم اور گورنمنٹ کو زمیندار کا جانشین بنانا چاہتا ہے۔ اس جدید طریق پر بہت کچھ اختلاف رائے پھیلا ہوا ہے؛ حامی اس کو طریق دوم پر قابل ترجیح بتاتے ہیں، معترض خلاف انصاف اور ناقابل عمل ثابت کرتے ہیں۔ ہم بھی اس کی خوبیوں اور نقائص سے اسی باب کے آخر میں مختصراً بحث کریں گے ؏

زمینداری لگان

۱۰- زمیندار کاشتکار سے جو لگان لیتا ہے، اس کا ایک جزو تو اس اصل کا سود ہوتا ہے جو زمیندار نے اس زمین کے خریدنے اور اس کی ترقیات میں لگایا ہے؛ جو کچھ باقی رہے وہ کاشت کار کو حق کاشت دینے کا معاوضہ سمجھنا چاہیے۔ اس کی مقدار کا (جو رواج یا قانون یا معاہدے کے مطابق قرار پاتی ہے) معاشی لگان کے مساوی ہونا ضرور نہیں: اگر کم ہے تو کاشتکار کا فائدہ ہے، اگر برابر ہے تو نہ فائدہ نہ نقصان، اور اگر زیادہ ہے تو کاشتکار مقدار زائد یا تو اپنی ذاتی محنت اور اصل کی اجرت وسود میں سے، یا بشرطیکہ طلب رسد پر غالب ہو، اس کو داخل مصارف کرکے، اور نرخ بڑھا کر جا پیدا حاصل زائد سے، ادا کرے گا۔ گویا زمینداری لگان کا معاشی لگان سے زائد حصہ یا تو غریب کاشتکار کی ذاتی اجرت اور سود کاٹ کر اس کو ہمیشہ کے واسطے خستہ حال یا چند روز میں تباہ کردیگا، یا بحالت غلبہ طلب داخل مصارف ہوکر نرخ چڑھا دیگا اور خریداروں یعنی عوام کی جیب سے ادا ہوگا۔ لیکن زائد حصہ اکثر کاشتکار اور خریدار دونوں مل کر ادا کرتے ہیں جس کا نتیجہ نہ صرف زرعی پیداوار کی گرانی بلکہ کاشتکار کی تباہ حالی بھی ہوتا ہے۔ ہندوستان میں ایسے حالات ابھی نایاب نہیں ہیں لیکن

کم ضرور ہو رہے ہیں ؛

زمین کی رسد اور طلب کا زمینداری لگان پر خاص اثر پایا جاتا ہے۔ نوآباد ملکوں میں جہاں زمین بکثرت دستیاب ہو سکتی ہے زمینداری لگان اصل کے سود سے بہت کم بڑھ سکتا ہے۔ اس کے برعکس قدیم ممالک میں جہاں آبادی گھنی ہے، زمین کی قلت ہے اور عام ذریعۂ معاش زراعت ہے، زمینداری لگان معاشی لگان سے بھی بڑھ کر یا تو کاشتکار کو زیر بار کرتا ہے یا پیداوار کے خریدار کو۔ بالفاظ دیگر کاشتکار کی آمدنی گھٹاتا ہے یا نرخ پیداوار چڑھا دیتا ہے: چنانچہ ہندوستان اور آئرلینڈ کے بعض حصّوں میں یہ نوبت آچکی ہے۔ قانون حتی الامکان زمینداری لگان کو حدّ اعتدال سے آگے بڑھنے سے روکتا ہے ؛

یہ مسئلہ بھی قابل توجہ ہے کہ زمینداری لگان کیونکر قرار پائے ؟ آیا وہ پیداوار کا کوئی مقررہ حصّہ ہونا چاہیے مثلاً تہائی، چوتھائی، یا بحساب پیداوار بشکل زر مقرر ہو، ۸ آنے یا روپے من؛ یا کوئی مقدار معیّن ہو، مثلاً دس یا پندرہ من؛ یا کوئی رقم مثلاً چالیس یا پچاس روپے۔ لگان قسم اول سب سے بہتر ہے، کیونکہ زمیندار مقدار اور نیز قیمت کی کمی بیشی میں حصّہ رسد شریک رہتا ہے۔ صورت دوم بھی اول کے مشابہ ہے، فرق صرف اسقدر ہے کہ لگان اور پیداوار کی باہمی نسبت نرخ کے اضافے اور تخفیف کے ساتھ گھٹتی بڑھتی ہے۔ بشکل سوم گو مقدار لگان معیّن ہے لیکن کم از کم نرخ کی کمی بیشی میں زمیندار کی شرکت قائم رہتی ہے۔ لیکن بحالت چہارم زمیندار کو نہ مقدار پیداوار سے تعلق نہ نرخ سے کچھ سروکار، ہر حالت میں وہ اپنی مقررہ رقم کا طالب ہوتا ہے۔ لیکن جبکہ قلت بارش یا سیلاب کی وجہ سے، پیداوار میں نمایاں کمی واقع ہو تو قانون بخیال انصاف زمیندار کو وصولی لگان کچھ عرصے تک ملتوی کرنے یا لگان کا مناسب حصّہ معاف کرنے پر مجبور کرتا ہے ؛

سرکاری مالگزاری

۱۱۔ گورنمنٹ پیداوار زمین کا جو حصہ خود لیتی ہے، مالگزاری کہلاتا ہے۔ ایک حد تک یہ خیال صحیح ہے کہ جب سرکاری حصہ زمینداری لگان کا

ایک جزو ہو، جیسا کہ ہندوستان کے بعض صوبوں میں بقدر نصف پایا جاتا ہے تو مالگزاری سے صرف زمیندار کی آمدنی گھٹ جاتی ہے۔ کاشتکار پر کوئی اثر نہیں پڑتا، خواہ کل لگان زمیندار کی جیب میں رہے یا گورنمنٹ اس میں حصہ بانٹے، کاشتکار کو اس سے کچھ سروکار نہیں۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ گورنمنٹ کی حصہ طلبی سے زمیندار کو لگان بڑھانے کی ترغیب پیدا ہو سکتی ہے اور اپنی سابق مقدار لگان برقرار رکھنے کے لیے وہ تا حد امکان مالگزاری کا بار کاشتکار پر ڈالنے کی کوشش کرے تو عجب نہیں۔ مگر دوراندیشی سے بذریعۂ قوانین اضافہ لگان پر ایسی شرائط عائد کر دی گئی ہیں کہ زمیندار کو مالگزاری کا کوئی جزو کاشتکار پر منتقل کرنے کا بہت کم موقع مل سکتا ہے اور جہاں زمیندار موجود نہ ہوں اور سرکار مالگزاری براہ راست کاشتکار سے وصول کرے، جیسا کہ دکن میں ہوتا ہے تو سرکار کی حیثیت زمیندار کی ہو جاتی ہے اور مالگزاری کا مضر اور غیر مضر اثر حسب حالات زمینداری لگان کا سا پڑتا ہے۔ پس اگر حقیقتاً مالگزاری معاشی لگان کے اندر اندر رہے تب تو کچھ مضائقہ نہیں، صرف زمیندار یا کاشتکار کے ماحصل زائد میں سے حصہ نکل جائیگا۔ لیکن اگر اس حد سے آگے بڑھ کر زمیندار کے سود یا کاشتکار کی اجرت و سود میں سے بھی حصہ بانٹے تو اس کے دو نتیجے ممکن ہیں: زرعی ترقیات میں رکاوٹ، زراعت میں تنزل؛ پس پیداوار میں کمی ہونا تو بہرصورت یقینی ہے۔ اب اگر تحقیق رسد سے پیداوار کی قیمت میں معقول اضافہ ہو سکا تو مالگزاری کا بار بقدر اضافۂ قیمت خریداروں یعنی عوام پر جا پڑیگا، کچھ زمیندار اور کاشتکار کے سود اور اجرت سے وصول ہوگا، اور باقی بے لگان والے کھیتوں کے غریب کاشتکاروں کی زراعت روک کر اور ان کو تباہ کر کے خود بھی غارت ہو جائیگا۔ لیکن اگر خدانخواستہ قیمت میں اضافہ نہ ہو سکا، تو زراعت بند ہونے سے کاشتکار برباد ہو جائیں گے اور سرکار کے ہاتھ بھی کچھ نہ آئیگا: جب زراعت ہی نہ ہوگی تو مالگزاری کہاں سے آئیگی۔ پس صاف ظاہر ہے کہ تعیّن مقدار مالگزاری میں بیحد اعتدال اور احتیاط کی ضرورت ہے۔ بزعم خود سرکاری آمدنی بڑھانے کے خیال سے بے بس زمیندار

اور بے زبان کاشتکار پر مالگزاری از حد بڑھا دینا مرغی مار کر ایک دم سونے کے انڈے نکالنے کی احمقانہ حرکت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ شمالی ہندوستان میں مالگزاری ترقی زراعت میں کمتر ہارج نظر آتی ہے؛ لیکن مسٹر جسٹس رانا ڈے آنریبل مسٹر گوکھلے اور مسٹر رمیش چندر دت جیسے معاملہ فہم اور باخبر لوگ جنھوں نے ہندوستان کے معاشی حالات کا مطالعہ اپنی زندگی کا ایک مقصد قرار دے دیا تھا اور جن کو اہل الرائے سمجھے جانے کا پورا حق حاصل ہے، شاکی ہیں کہ خصوصاً دکن میں مالگزاری حد مناسب سے تجاوز کر کے کم و بیش وہی افسوسناک نتائج پیدا کر رہی ہے جن کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے، اور شمالی ہندوستان میں آئندہ اضافہ احتیاط طلب ہے۔ نہ معلوم گورنمنٹ ہندوستانیوں کے ایسے بے لوث اور قابلانہ مشوروں سے مستفید ہونا کہاں تک پسند کرتی ہے؛ لیکن معاشی قوانین بدلنا بھی گورنمنٹ کے قبضۂ قدرت سے باہر ہے ؛

اگر معاشی لگان تمام زمینوں پر بشرح معین مثلاً کل پیداوار کی ایک چوتھائی مالگزاری قائم کی جائے تو اس کا کاشت اور نرخ پر کیا اثر ہوگا ؟ پیدائش لگان کی بحث میں ہم نے چند ایسے ادنیٰ کھیتوں کی کاشت یا انتہائی جرعوں کا استعمال فرض کیا ہے جن کے مصارف پیدائش پیداوار کی قیمت کے برابر ہیں اور جن پر کچھ لگان نہیں ملتا؛ ان کو اصطلاحاً زمین بے لگان یا جرعۂ بے لگان کہتے ہیں۔ اب اگر بے لگان زمین یا بے لگان جرعوں کی پیداوار مجموعی پیداوار کا جزو قلیل ہو اور سخت ناگزیر نہ ہو تو ایسی زمینوں کی کاشت اور جرعوں کا استعمال ترک ہو کر مقدار پیداوار میں خفیف سی کمی ہو کر نرخ میں تھوڑا سا اضافہ ہونا ممکن ہے؛ لیکن مالگزاری کا بیشتر حصہ معاشی لگان سے وصول ہوگا، اور بحیثیت مجموعی کاشت اور نرخ پر کوئی قابل لحاظ اثر نہیں پڑے گا۔ صرف زمیندار یا کاشتکار کی آمدنی (جو اب تک کل معاشی لگان پا رہے تھے) گھٹ جائیگی ؛

اس کے برعکس اگر بے لگان زمین اور جرعوں کی پیداوار مجموعی مقدار

کا جزو اعظم ہوا اور قطعاً ناگزیر ہو تو کاشت بحالت موجودہ جاری رہیگی۔ مالگزاری مصارف میں شامل ہو کر اسی قدر نرخ بڑھا دیگی، اور زمین کے لگان کی قیمت وہی رہیگی، البتہ مقدار میں تخفیف ہو جائیگی۔ چنانچہ شکل نمبر ۹ سے یہ نتیجہ بخوبی واضح ہوگا ؛

نویں شکل

(۹) مالگزاری
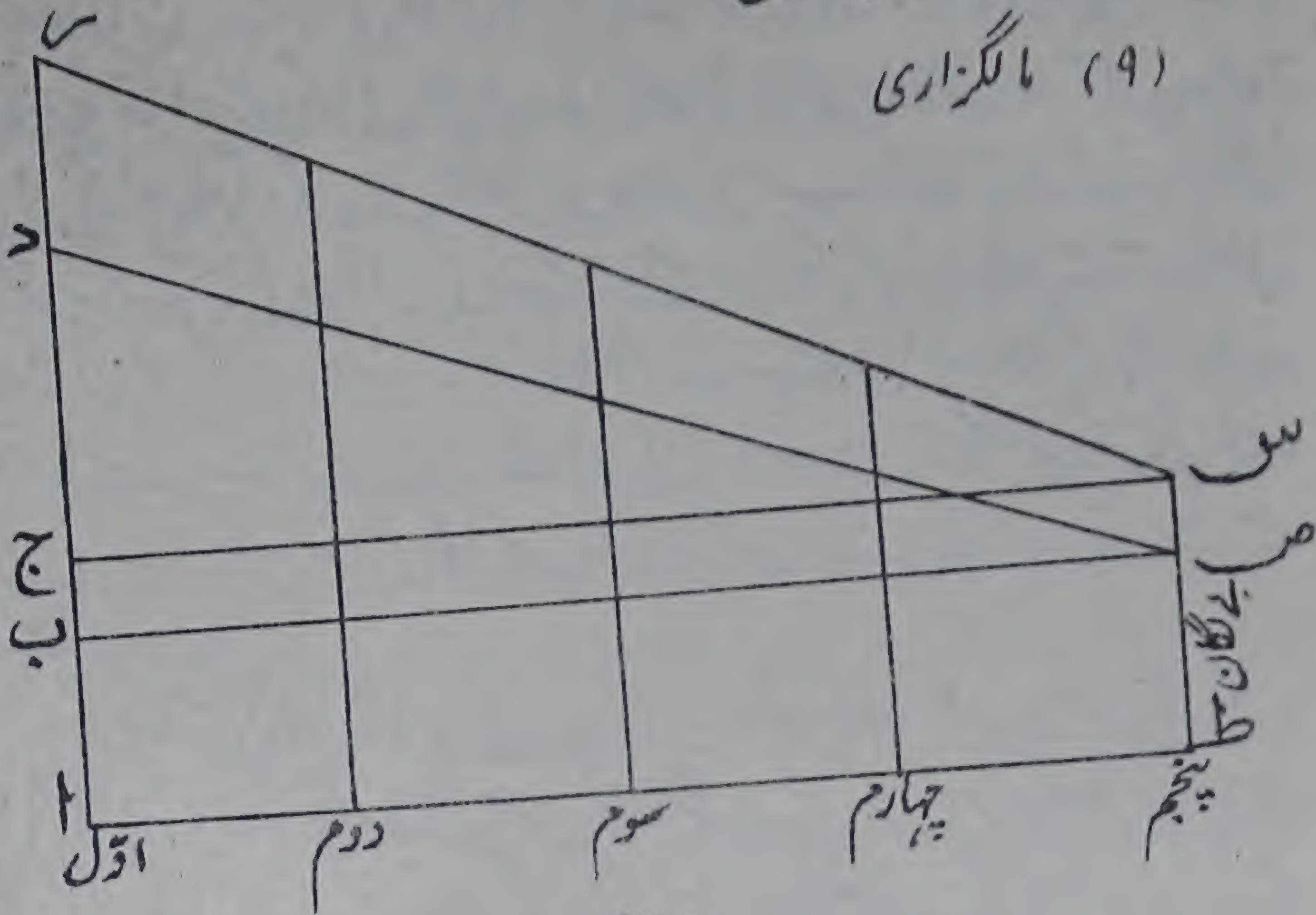
زمینیں

قبل مالگزاری نرخ اج ہے اور مقدار لگان ج ر س، بعد قیام مالگزاری بشرح ایک چوتھائی پیداوار نرخ بھی اس شرح سے بڑھ کر اب ہو جاتا ہے۔ لگان کی مقدار گھٹ کر ب د ص رہ جائیگی، لیکن بوجہ اضافۂ نرخ قیمت سابق برقرار رہیگی۔ اس شکل میں مختلف زرخیزی کی زمینوں کا اوسط پیداوار فی جرعہ دکھایا گیا ہے اور بغرض سہولت فرض کیا گیا ہے کہ تمام زمینوں میں صرف ایک ہی جرعہ استعمال ہوتا ہے ؛

یا فرض کرو کہ اعلیٰ، متوسط اور ادنیٰ، تین زمینیں ہیں جن سے علی الترتیب ۱۵، ۱۲، اور ۸ من غلہ پیدا ہوتا ہے، اور نسبت مصارف ۴، ۵ اور ۶ روپیہ من ہے۔ اس حالت میں اعلیٰ اور متوسط زمین کو ۵ من اور ۲ من لگان قیمتی،

۳۰ و ۱۲ روپے حاصل ہوگا۔ اب فرض کرو کہ تینوں زمینوں پر بشرح ایک چوتھائی پیداوار مالگزاری قائم کردی جائے اور ادنیٰ زمین کی پیداوار بھی سخت ناگزیر ہو؛ چونکہ ادنیٰ زمین ہمارے مفروضے کے مطابق بے لگان ہے اس کے باقی ۶ من کی قیمت لازماً سابق ۸ من کے برابر ہو جائیگی اور نرخ بجائے ۶ روپے من کے ۸ روپے من قرار پائے گا۔ چونکہ کل کی ¼ مالگزاری باقی ¾ کے ایک تہائی یعنی ⅓ کے برابر ہے، قیمت بھی اسی نسبت سے ۶ روپے کے ⅓ کے برابر، بمقدار ۲ روپے بڑھ کر، ۸ روپے ہو جاتی ہے: گویا مالگزاری اور اضافۂ نرخ کی نسبت یکساں ہوتی ہے۔ قیام مالگزاری کے بعد اعلیٰ اور متوسط زمین کا لگان علی الترتیب {مصارف (۱۵×۴) - (۱۱¼×۸) قیمت} وہی ۳۰ روپے اور {مصارف (۱۲×۵) - (۹×۸) قیمت} ۱۲ روپے رہیگی۔ لیکن بوجہ اضافۂ نرخ مقدار بجائے ۵ من اور ۲ من کے صرف ۳¾ اور ۱½ رہ جائیگی۔ ان دو مثالوں پر غور کرنے سے مذکورہ بالا نتائج صاف ظاہر ہو سکتے ہیں؛

واضح ہو کہ اگر مالگزاری مقدار پیداوار کے کسی حصے کے بجائے بحساب زر مقرر ہو، مثلاً ایک روپیہ فی من پیداوار، تو بھی معاشی لگان پر وہی اثر پڑے گا جو اوپر بیان ہوا۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ بحالت اوّل مالگزاری اور پیداوار کی باہم نسبت معین ہے، مثلاً ایک ثلث یا چہارم پیداوار۔ اور بحالت آخر پیداوار کی گرانی اور ارزانی کے بموجب مالگزاری کی نسبت بھی علی الترتیب گھٹتی بڑھتی رہیگی، مثلاً شرح مالگزاری ایک روپیہ من ہو۔ اب اگر نرخ پیداوار پانچ روپے من ہے تو مالگزاری پیداوار کا پانچواں حصہ ہوگی؛ اور اگر نرخ گھٹ کر چار روپے من رہ جائے تو مالگزاری بڑھ کر پیداوار کا ایک چوتھائی حصہ ہو جائیگی؛

تقرر مالگزاری کی چار صورتیں اوپر بیان ہوئیں: یا تو وہ ایک معیّن مقدار ہو، مثلاً دس پانچ من؛ یا کوئی مقررہ رقم ہو مثلاً دس بیس روپے؛ یا پیداوار کا ایک مقررہ حصہ ہو، مثلاً ایک ثلث یا چہارم؛ یا بحساب پیداوار بشکل زر مقرر

ہو، مثلاً ایک روپیہ یا آٹھ آنے من۔ یہی چار صورتیں زمینداری لگان کی بھی بیان ہو چکی ہیں؛ دونوں حالتوں میں نتائج بھی یکساں نمودار ہوتے ہیں۔ زمینداری لگان اور سرکاری مالگزاری میں اگر کچھ فرق ہے تو یہ کہ زمیندار کاشتکار کی رضامندی بغیر لگان مقرر نہیں کر سکتا۔ لیکن سرکار کو اختیار ہے، جو کچھ مالگزاری مناسب سمجھے مقرر کر دے، آگے چل کر نتیجہ برا نکلے یا بھلا ؎

زمین کو قومی ملک بنانے کی تجویز

۱۲۔ لگان میں جو روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے وہ زمین کے قدرتی خواص اور ایسی عام معاشی ترقیات کا نتیجہ ہے جس میں زمیندار کی ذاتی کوشش کو کچھ دخل نہیں۔ زمین کی ترقی میں زمیندار اگر کچھ محنت اور اصل صرف کرتا ہے تو اس کا معاوضہ بشکل اجرت و سود لگان سے جداگانہ شمار ہوتا ہے۔ زمیندار کے حق میں لگان کو محض خوش قسمتی اور حسن اتفاق کا نتیجہ کہنا خلاف واقعہ نہ ہوگا؛ یہی حال زمینوں کی قیمت کا ہے کہ مالک کے ہاتھ پیر ہلائے بغیر دن دنی اور رات چوگنی ترقی ہو رہی ہے۔ اضافۂ قیمت بھی اسباب لگان کا پیدا کیا ہوا نتیجہ ہے۔ حاصل کلام یہ کہ لگان اور نیز قیمت زمین قدرت اور بے شمار غیر متعلق لوگوں کی کوشش سے بسرعت بڑھ رہی ہے اور ہر اضافے پر صرف قبضہ کر لینا زمیندار کا کام ہے۔ شہر شکاگو میں ایک افتادہ زمین جو ۱۸۳۰ء میں محض مفت ایک آنہ فی مربع گز سے بھی کم قیمت پر خریدی گئی جو ساٹھ برس کے عرصے میں حسن اتفاق کی بدولت شہر کی توسیع سے اس کا موقع ایک ایسے آباد اور کاروباری چوک کے کنارے آپڑا کہ ۱۸۹۴ء میں وہی زمین تین ہزار روپے گز سے بھی زیادہ قیمت پر فروخت ہوئی؛ غضب ہے کہ ۱۸۹۵ء میں لندن کے مشہور عالم بازار لمبارڈ اسٹریٹ کے پہلو میں ایک قطعہ اراضی سترہ ہزار روپے فی گز سے کچھ ہی کم قیمت پر فروخت ہوا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب عام ملکی اور معاشی ترقیات جو بیشمار لوگوں کی محنت اور اصل کی کوشش کا نتیجہ ہیں، لگان اور قیمت یوں بیحد و حساب بڑھائیں تو ان اضافوں کی مالک بھی منجانب ملک گورنمنٹ کیوں نہ بنے۔ مالک زمین اپنی محنت اور اصل کا معاوضہ شوق سے لے، لیکن ماحصل زائد کے لامحدود اضافوں سے اسکو کیا تعلق۔

عوام کی کوشش اور صرف سے وہ پیدا ہوتا ہے اور عوام کی نمائندہ گورنمنٹ اس کی جائز حقدار ہے۔

اضافۂ ماحصل زائد پر گورنمنٹ کے قبضہ کرنے کی چند ترکیبیں پیش کی جاتی ہیں:- ایک تو یہ کہ گورنمنٹ کل زمین مالکوں سے خود خرید لے۔ لیکن اول تو اس کے واسطے کافی رقم مہیا ہونی دشوار، دوسرے بحیثیت مالک سرکار لاتعداد قطعات کا انتظام بہت طوالت طلب اور بیش خرچ ہوگا۔ زیادہ آسان ترکیب یہ ہے کہ سرکار مالگزاری اور ہاؤس ٹیکس اس قدر بڑھا دے کہ مالکِ زمین کو اس کے اصل اور محنت کا جو خرید زمین اور اس کی ترقیات میں صرف ہوئی ہو پورا پورا معاوضہ مل کر باقی کل اضافہ داخل خزانہ ہو۔ اس صورت میں گورنمنٹ بہت کچھ دردسری سے بچیگی اور مقصد اصلی بھی حاصل ہو جائیگا۔ چنانچہ اکثر مہذب ممالک میں یہی طریق رواج پا رہا ہے۔

لیکن واضح ہو کہ طریق آخر الذکر میں بھی چند خطرناک نقص مضمر ہیں۔ اول تو زمیندار کے اصل و محنت کا معاوضہ باقی اضافے سے جدا کرنا دشوار، اور اندیشہ ہے کہ سرکاری ملازموں کا اندازہ اکثر خلافِ واقعہ اور زمیندار کے حق میں مضر ہوگا۔ یہ طرز عمل نہ صرف انصاف کے خلاف ہے بلکہ زرعی ترقیات اور اضافۂ کاشت یا بالفاظ دیگر ملکی مرفہ الحالی کے سخت منافی ہوگا۔ دوسرے جبکہ گورنمنٹ اضافۂ لگان و قیمت زمین کی مالک بنتی ہے تو عام ملکی حالات کی تبدیلی سے زمیندار کے معاوضے میں جو کمی پیدا ہو اس کی تلافی کرنی بھی گورنمنٹ پر فرض ہونی چاہئیے ورنہ نفع سمیٹنا اور نقصان کا بار غریب زمیندار پر ڈالنا تو وہی مثل ہوگی کہ "میٹھا میٹھا ہپ۔ اور کڑوا کڑوا تھو" اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ گورنمنٹ اپنی گرہ سے ایسے نقصانات کی تلافی کرنے پر کہاں تک آمادہ ہوگی۔ تیسرا اعتراض بھی معقول ہے کہ کل لگان یا اضافۂ قیمت پر گورنمنٹ کا قبضہ ہو جانے سے زمین کی قیمت بیحد گھٹ جائیگی اور جن لوگوں نے موجودہ بڑھی ہوئی شرح سے زمین خریدی ہے یا تو ان کو جدید تخفیف قیمت کا معاوضہ ملنا چاہئیے یا تخمینہ لگان سے اس کل رقم کا سود خارج کرنا چاہئیے جو اس نے

قیمتاً ادا کیا ہو۔ ورنہ کسی عام شرح سے ان پر مالگزاری یا ٹیکس قائم کرنا سراسر بیجا اور ظلم ہوگا۔

ظاہر ہے کہ طریق دوم کے رواج میں بھی کس قدر احتیاط لازمی ہے اور اس کا لحاظ رکھنے کی سرکاری ملازموں سے توقع کرنا خلاف تجربہ اور مشاہدہ ہے۔ بداحتیاطی جس کا سرکار کے موافق اور زمیندار کے مخالف ہونا تقریباً یقینی ہوتا ہے نہ صرف لوگوں کے حق میں ظلم بلکہ عام بہبودی اور مرفہ الحالی کے واسطے سخت مضر ہوگی۔

گویا سب سے بہتر یہ ہے کہ جدید نظام میں کوئی بڑا رد و بدل نہ کیا جائے۔ اضافۂ لگان اور ہاؤس ٹیکس میں نہ صرف بلحاظ انصاف بلکہ بخیال بہبودیٔ عامہ اعتدال ملحوظ رہے۔ ملکی ترقی روک کر سرکاری آمدنی بڑھانا گویا "مرغی مار کر سونے کے انڈے لینے کی ہوس کرنا" ہے۔ البتہ اب سے موجودہ طریق ملک کو روکا جائے، جو زمینیں اب تک کسی کی ملک نہ ہوں سرکار ان پر قبضہ کر لے اور ان کے لگان اور قیمت کی بلا شرکت غیرے مالک بنے: چنانچہ اسی اصول پر جنگلات سرکاری ملک قرار دیئے جا رہے ہیں۔ عام حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے ملک زمین کے معاملے میں صرف "گزشتہ را صلوات و آئندہ را احتیاط" کا اصول قابل عمل اور بیضرر نظر آتا ہے۔ زمین کی شخصی ملک کا موجودہ طریق ناقص ہی لیکن اس قدر پھیلا ہوا ہے اور مستحکم جڑ پکڑ چکا ہے کہ اس کے استیصال کی کوشش سے اور بھی زیادہ مضرت پہنچنے کا خوف ہے۔ البتہ ایک حد تک بتدریج اصلاح ممکن ہے۔

باب یازدہم

اُجرت

(۱) اُجرت کا مفہوم (۲) توانین اُجرت (۳) مسئلۂ اجرت فنڈ (۴) مسئلۂ معیار زندگی (۵) مسئلۂ پیدآوری محنت (۶) مسئلۂ پیدآوری مختتم (۷) اقسام اجرت (۸) فرق اجرت کے اسباب (۹) ارزانی وگرانی محنت (۱۰) اضافۂ اجرت اور اسکے نتائج۔

اجرت کا مفہوم

۱۔ یوں تو ہر قسم کی محنت کا معاوضہ اُجرت ہے: مثلاً درزی دس روپے کا کپڑا خرید کر کوٹ تیار کرے جو بارہ روپے کو فروخت ہو تو یہ دو زائد روپے اس کی محنت کی اجرت شمار ہونے چاہئیں، لیکن معاشیات جس اجرت سے بیشتر بحث کرتا ہے وہ محنت کی ایک خاص حالت سے متعلق ہے۔ ہم اصلداروں اور آجروں کی نوعیت مختصراً دولت کے حصے داروں کے تحت میں بیان کر چکے ہیں، جب سے ان دو طبقوں نے زور پکڑا، مزدوروں کا بھی ایک گروہ کثیر پیدا ہو گیا اور محنت کی بھی مثل دیگر اشیا باقاعدہ خرید و فروخت ہونے لگی۔ محنت فروش مزدور، خریدار آجر اور قیمت اجرت کہلاتی ہے۔ اس سے قبل نہ تو تجارتِ محنت کا بازار اسقدر گرم تھا اور نہ اجرت مثل قیمت معاشی قوانین کی اسقدر پابند ہو سکتی تھی۔ اکثر صناع اور پیشہ ور اپنے ہی اصل سے بطور خود چیزیں تیار کرتے تھے، پیداوار کی قیمت میں سود اور اجرت دونوں شامل تھے، لیکن بوجہ ملک واحد ہونے کے ان کی تفریق غیر ضروری تھی۔ محنت کی خرید و فروخت خانگی خدمات مثلاً باورچیگری، سائیسی، خدمتگاری، یا چند معزز پیشوں مثلاً معلمی، طبابت تک محدود تھی۔ شرح اجرت بیشتر رسم و رواج کی پابند تھی اور تعین شرح پر معاشی قوانین کا اثر آجکل کے مقابلے میں عشر عشیر بھی نہ تھا۔ گوناگوں ترقیات کی بدولت تجارتِ محنت نے وہ فروغ پایا ہے کہ

حصہ سوم
باب یازدہم

تمام ملک اس کی منڈی بنے ہوئے ہیں۔ ہر ملک کا گروہ کثیر اس کاروبار میں لگا ہوا نظر آتا ہے اور خواص محنت کی وجہ سے جن کی تشریح اوپر کی جا چکی ہے، مزدور اور اجرت ہر ترقی یافتہ ملک میں نہایت دشوار اور نتیجہ خیز معاشی مسائل خیال کئے جاتے ہیں۔ اجرت کو اکثر مزدور کا حصہ پیداوار یا حصہ قیمت پیداوار کہتے ہیں؛ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اجرت پیداوار کی تیاری اور فروخت کے قبل محنت شروع ہوتے ہی آجر بشکل زر ادا کرنے لگتا ہے؛ مزدور کو نہ تو پیداوار مابعد سے حصہ ملتا ہے، نہ فروخت پیداوار تک انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کام شروع ہوتے ہی آجر ما حصل مستقبل کی امید پر اپنی گرہ سے اجرت روزانہ یا ہفتہ وار یا ماہانہ پیشگی ادا کرنا شروع کر دیتا ہے۔ لیکن اجرت کی مذکورۂ بالا تعریف ایک معنی میں صحیح بھی ہے، کیونکہ اجرت کا موجودہ پیداوار اور ما حصل مستقبل کی مقدار سے، اور جب سے زر ادائی کا رواج ہوا ہے قیمت سے، بھی قریبی تعلق ہے۔ ان ہی تعلقات کی تحقیق و تشریح معاشیات کا منشا ہے۔

قوانین اُجرت

۲۔ بظاہر تو شرح اُجرت باہمی رضامندی اور معاہدے سے قرار پاتی ہے لیکن خود رضامندی اور معاہدے پر گوناگوں معاشی حالات کا بیحد اثر پڑتا ہے حتیٰ کہ تعین اجرت کے اسباب معاشی قوانین کے تابع ثابت کئے جاتے ہیں۔ رہا اجرت پر رسم و رواج کا اثر، تو وہ بھی سیاسی اور معاشی ترقیات کی وجہ سے بسرعت زائل ہو رہا ہے۔ اول اول شرح اجرت کو قانون طلب و رسد سے سمجھایا گیا: اگر دو آجر ایک مزدور کو بلاویں تو اجرت بڑھیگی، اور اگر دو مزدور ایک آجر کی طرف دوڑیں تو اجرت گھٹیگی۔ یہ مسئلہ بالکل درست بھی لیکن یقیناً سطحی ہے اور علمی صحت و وضاحت سے معرّا؛ یہ صرف ایک واقعے کا بیان ہے، کمی و بیشی اجرت کے اسباب اور حدود کا اس سے کچھ پتا نہیں چلتا۔ تاہم اس قانون کا اجرت کے اساسی قوانین سے قریبی تعلق ہے، جن کی توضیح آئندہ فرق اجرت کے تحت میں کرینگے۔ اوّل قوانین اجرت مع تنقید درج ذیل کرتے ہیں:۔

مسئلہ اجرت فنڈ

۳۔ اوائل بیسویں صدی میں انگلستان کے مزدوروں کی مالی حالت بمقابلہ دیگر ممالک یورپ کے بدرجہا بہتر تھی، اور ساتھ ہی اس کے وہاں اصل کی مقدار بھی

سب ملکوں سے بہت زیادہ موجود تھی۔ لہذا اس زمانے کے معاشئین نے مقدار اصل اور شرح اجرت کے درمیان براہ راست ایک قریبی تعلق قرار دیا، جس کو ہر شخص تسلیم کرتا ہے؛ چنانچہ پیدائش دولت کے بیان میں یہ رشتہ واضح کیا جا چکا ہے۔ اصل، محنت بغیر مردہ ہے، اور محنت، اصل بغیر اپاہج۔ مزدور کو اصل نہ صرف بشکل آلات مشین اور پیداوار خام درکار ہے بلکہ بطور مایحتاج زندگی مثلاً خوراک و لباس بھی ناگزیر ہے، تاکہ دوران عمل پیدائش میں وہ زندہ اور تندرست رہے۔ لیکن بہت کم اصل مزدوروں کی ذاتی ملک ہوتا ہے، بحالت موجودہ آجر اصلداروں سے اصل بمعاوضۂ سود مستعار لیکر کارخانے جاری کرتے ہیں جن میں مزدور اصل قائم سے کام کرتے اور اصل دائر بطور اجرت پاتے ہیں۔ بہرحال اصل محنت کا ناگزیر معاون ہے، اور اس کا اضافہ مزدوروں کے حق میں بیحد مفید ہے۔ چنانچہ کمی بیشی اصل کا نتیجہ مشرق و مغرب کے مزدوروں کی مالی حالت سے بخوبی روشن ہے۔ لیکن گزشتہ صدی کے معاشئین نے محنت و اصل کے مذکورہ رشتے پر اکتفا نہ کر کے اس میں مبالغے سے کام لیا اور صحت کی کوشش میں حقیقت سے تجاوز کر گئے۔ انھوں نے اصل دائر کی مقدار جو ادائی اجرت میں صرف کیا جاتا ہے، معین تصور کر کے شرح اجرت کو تعداد مزدوراں اور مقدار اصل دائر کی باہمی نسبت پر منحصر قرار دیا: مثلاً اگر کسی ملک میں اصل دائر کی مقدار ایک کروڑ روپے ہو اور مزدوروں کی تعداد ایک لاکھ، تو ہر مزدور کی اوسط آمدنی سو روپے سال ہوگی :۔

جدید تحقیقات سے چند معقول اعتراضات کی بنا پر یہ مسئلہ غیر معتبر قرار پا چکا ہے۔ اول تو اصل دائر کی کوئی ایسی مقدار معین فرض کرنا جس کی ادائی بشکل اجرت لازمی ہو محض بے بنیاد ہے! آجر ہمیشہ اپنی ذاتی غرض سے جو متعدد اسباب کے تابع ہوگی، اجرت میں کمی بیشی کرتا ہے، کسی مقدار معین کی لازمی تقسیم کی مجبوری سے اجرت میں تبدیلی نہیں کرتا۔ دوسرے خود اس مسئلے کی سلاست ایک سطحی دھوکا ہے! غور کرنے سے اس کا لب لباب یہ نکلتا ہے کہ اجرت کی مجموعی مقدار مزدوروں کی تعداد سے تقسیم کر کے اوسط شرح اجرت دریافت کی جاتی ہے۔ ایک معنی یہ بھی پیدا ہوتے ہیں کہ کثرت اصل اضافۂ اجرت کا باعث ہوتا ہے؛ لیکن یہ دونوں باتیں اسقدر صریح

ہیں کہ ان کا بیان تحصیل حاصل ہے۔ لہٰذا اس مسئلے سے اجرت کی کوئی علمی توضیح نہیں ہوتی، بایں ہمہ اس سے محنت و اصل کے باہمی تعلق پر توجہ ضرور منعطف ہوتی ہے؛

موجودہ ایجادات نے اصل میں بشکل مشین جو کچھ اضافہ کیا ہے اور جسکی بدولت عمل پیدائش میں اصل و محنت کے حصے گھٹتے بڑھتے ہیں، اس سے پیدائش دولت کے تحت میں مفصل بحث کی جاچکی ہے۔ اس موقع پر مذکورۂ بالا بحث کی طرف رجوع کرنا خالی از منفعت نہ ہوگا۔

بہرحال اضافۂ اصل کا خواہ وہ کسی شکل میں ہو، نتیجہ قریب یا بعید ازدیاد طلب محنت اور بیشی شرح اجرت ہوتا ہے۔ لہٰذا مسئلہ اجرت فنڈ سے محنت کے پہلوئے طلب پر خاص طور سے روشنی پڑتی ہے۔ محنت کا پہلوئے رسد جو اس مسئلے میں سراسر نظر انداز کیا گیا ہے ایک دوسرے مسئلے سے واضح ہوگا، جس کو ہم درج ذیل کرتے ہیں؛ اور ان دونوں کی روشنی میں محنت کے ہر دو پہلوئے طلب و رسد کا مطالعہ کرنے سے اجرت کے متعلق ایک مسئلہ مترتب ہوسکتا ہے جو حقیقت کے قریب ہو؛

مسئلہ معیار زندگی

۴۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے بڑے بڑے کارخانے مل اور فیکٹری جاری ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ مزدور بھی اپنی محنت کو آجر کے ہاتھ مثل دیگر اشیا بکثرت فروخت کرنے لگے؛ اور قیمت محنت، اجرت کہلاتی ہے۔ عام قاعدہ ہے کہ کسی چیز کی قیمت اسکے مصارف پیدائش سے کم نہیں ہوسکتی، کسی قدر زیادہ یا کم از کم برابر ضرور ہوگی۔ ایسا کون احمق ہوگا جو نقصان اٹھانے کے لئے کوئی چیز بنانیکی زحمت گوارا کریگا؛ اگر کسی وجہ سے قیمت مصارف پیدائش سے گھٹ جائے تو جلد سے جلد ایسی چیز کی پیدائش ترک کردی جائیگی۔ پس قیمت کا مصارف پیدائش کے کم از کم مساوی ہونا ہر چیز کی پیدائش کیواسطے شرط لازمی ہے۔ اس اہم مسئلے سے مبادلۂ دولت کے بیان میں مفصل بحث کرینگے، یہاں اسکا سیدھا سادہ مفہوم سمجھ لینا کافی ہے:۔ فرض کرو انجن سے برقی طاقت بنائی جاتی ہے، اب جو کوئلا انجن چلانے میں جلتا ہے، اس کی قیمت اور نیز مطالبات فرسودگی، ایسی شرح سے کہ انجن پرانا اور بیکار ہونے تک اسکی کل قیمت وصول ہوجائے جس سے نیا انجن خریدا جاسکے، یہ دونوں مدیں برقی طاقت

کارخانے کی تعمیر میں، انجن، کا لگان، علاوہ ازیں زمین کے مصارف پیدائش میں شامل ہیں۔ جو لاگت آئی ہے اسکا سود، اور ملازمین کی تنخواہ، بھی جزو مصارف ہیں لیکن اس موقع پر پہلی دو مدوں کا لحاظ کرنا کافی ہے، باقی نظر انداز کیجاتی ہیں۔ مزدور اور محنت کا تعلق بھی بعینہ انجن اور برقی طاقت کا سا ہے گویا مزدور کی مایحتاج زندگی اور پرورش اولاد کے مصارف، جو اسکی جانشین ہوگی، مصارف پیدائش محنت میں شامل ہیں۔ اور اگر اجرت کسی وجہ سے انکی مجموعی مقدار سے گھٹ جائے تو افلاس غریب مزدور کی زندگی کو ناقابل برداشت بناکر اس کو جلد تباہ کردیگا۔ اور اس تباہی کا اثر آئندہ نسلوں پر پھیلکر کثرت مرض، ضعف، پست خیالی، اور بچپن کی سی ناقابل اصلاح ابتری کا باعث ہوگا۔ اور عام مرفہ الحالی کے سرچشمے کو مسدود کردیگا۔ کسی چیز کا بنانا یا نہ بنانا اختیاری ہے، بصورت اندیشۂ نقصان پیدائش ترک کیجاسکتی ہے لیکن غریب مزدور کو محنت سے کوئی مفر نہیں! اول تو اس کے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ بیکار بیٹھکر کھاسکے، دوسرے ترک محنت خود اسکے حق میں سراسر نقصان دہ ہے۔ چنانچہ مزدور کی ان کمزوریوں سے خواص محنت کے تحت میں ہم مفصل بحث کرچکے ہیں۔ پس تخفیف اجرت کے لحاظ سے غریب مزدور کی حالت نہایت قابل رحم ہے اور اکثر اس پر "نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن" کی مثل صادق آتی ہے۔ لیکن جیسا کہ اشارہ کیا جاچکا ہے از حد تخفیف اجرت نہ صرف مزدور کی تباہی کا باعث ہے بلکہ ملکی بہبودی اور مرفہ الحالی کو بھی ایسی مضرت پہنچاتی ہے جسکی تلافی ناممکن ہے۔ یہ تو ظاہر ہوچکا کہ اجرت کا مزدور اور اسکے خاندان کی مایحتاج زندگی کیواسطے کافی ہونا کسقدر ضروری اور مفید ہے! اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا مایحتاج زندگی کا کوئی معیار معین ہے یا اس میں کمی بیشی ممکن ہے؟ اور اگر ہے تو ایسی تبدیلی تخفیف و اضافۂ اجرت پر مقدم ہے یا اس سے موخر؟

اٹھارھویں صدی کے آخری نصف کے اثنا میں جب فطرآئین نے اس مسئلے کی بنا ڈالی تو اس وقت فرانس کے مزدوروں کی مالی حالت نہایت خستہ تھی اور جو کچھ اجرت ملتی تھی وہ اشد ضروریات زندگی کیواسطے بمشکل کفایت کرتی تھی۔ ہمعصر حالات سے متاثر ہوکر انھوں نے قرار دیا کہ مایحتاج زندگی ناگزیر ضروریات تک محدود ہے اور اجرت اس سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اول تو پہلے ہی سے بیکار اور متلاشی روزگار مزدوروں کی

ایک بڑی جماعت موجود رہے، دوسرے آبادی اصل اور کاروبار سے کہیں زیادہ جلد بڑھ رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اجرت۔ ناگزیر ضروریات کی حد سے تیزی کیساتھ البتہ گھٹنے کا اندیشہ اکثر دامنگیر رہتا ہے: چنانچہ پسماندہ ممالک میں ابتک مزدوروں کا یہی حال ہے "گنی بوٹی نپا شوربا" "روز کنواں کھودنا روز پانی پینا" اگر چار دن کام نہ ملے تو اندوختے کا صفایا ہی ہوجاتا ہے۔ ایسی حالت میں مایحتاج زندگی صرف اشد ضروریات تک محدود ہے اور اجرت مایحتاج تک ؛

لیکن ترقی یافتہ ممالک کے مزدوروں کی مالی حالت دیکھ کر یقین ہوتا ہے کہ مایحتاج زندگی کا کوئی ایسا معیار معین نہیں کہ اس میں ردو بدل نہ ہوسکے، بلکہ ناگزیر ضروریات سے لیکر بہمی ضروریات حتّیٰ کہ کم خرچ تعیشات بھی اس میں شامل پائے جاتے ہیں، گویا مایحتاج کا معیار کسی ملک کی معاشی ترقی یا پسماندگی کے مطابق بلند اور پست ہوتا ہے۔ چنانچہ امریکن مزدور اچھا خاصا خوش خوراک خوش پوشاک ہے اور اسکے مکان میں علاوہ ضروری سامان کے، آرائش و تفنن طبع کی بھی معمولی چیزیں از قسم تصاویر و باجہ موجود ملیں تو عجب نہیں شنبہ کی رات کو وہ کھیل تماشے دیکھنے کا بھی لطف اٹھاتا رہتا ہے؛ البتہ اس میں ایک عیب ضرور پیدا ہو گیا ہے کہ وہ فضول خرچ ہے اور اڑے وقت کے خیال سے کافی پس انداز نہیں کرتا لیکن مزدوروں کی انجمن اتحاد نے بیمہ فنڈ قائم کرکے جسکا ہم آئندہ مفصل حال لکھیں گے، یہ خرابی بھی ایک بڑی حد تک رفع کر دی، یورپ کے مزدوروں کی بھی کم و بیش یہی حالت ہے۔ لیکن ایشیا میں معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے: یعنی مزدور کی زندگی سب سے سادہ اور کم خرچ ہے، اور اسکی شرح اجرت بھی بہت کم ہے۔ ہندوستانی مزدور کی حالت اس سے بہتر سہی لیکن یورپین مزدور کے مقابلے میں پھر بھی ادنیٰ ہے، نہ اسکو زندگی کا اسقدر لطف میسّر ہے نہ اسکے پاس زیادہ اندوختہ۔

یہ تو تحقیق ہوچکا کہ مزدوروں کا معیار مایحتاج زندگی ہر ملک میں جدا ہوتا ہے، ترقی یافتہ ممالک میں بلند اور پسماندہ میں پست۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اضافہ اجرت، بلندی معیار کا باعث ہوتا ہے یا نتیجہ ہے یعنی بحیثیت عمل کسکو کس پر تقدم حاصل ہے ؛

گو تعجب ہوتا ہے لیکن معاشیین کے ایک گروہ کا قول ہے کہ معیار مایحتاج سے اجرت قرار پاتی ہے: گویا کہ معیار بلند کرنے سے اجرت میں اضافہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر ایسا ممکن ہوتا تو غریب مزدوروں کے دن پھر جاتے، جب چاہتا نئی نئی ضروریات اختیار کرکے

باب یازدہم

اجرت میں اضافہ کرالیتا، اور حسب دلخواہ زندگی کا لطف اٹھاتا، روکھا سوکھا کھاتا موٹے جھوٹے کپڑے، اور چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں پر قناعت کرنے کی اس کو کونسی خوشی یا مجبوری ہوتی۔ ہم نہیں کہتے کہ اس طریق سے وہ اجرت میں لاانتہا اضافہ کرا سکتا، لیکن کم از کم موجودہ تنگدستی کو وہ ضرور رفع کر دیتا اور اپنے تئیں ایسا بے بس اور ناچار نہ پاتا کہ دوسروں کی ہمدردی اور حمایت کا محتاج رہتا؛

واضح ہو کہ اگر محنت کی رسد محدود ہو اور طلب غالب، بالفاظ دیگر اگر مزدوروں کی تعداد معین ہو اور ان کی بہت جگہ مانگ ہو، گویا کوئی مزدور بیکار نہ ہو، تو ایسی حالت میں مزدور جتھا بنا کے اجرت میں مناسب اضافہ کرا سکتے ہیں: چنانچہ محنت بامہارت کی اجرت میں اس تدبیر سے مزدوروں کے موافق تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن محنت بے مہارت کی حالت اسکے بالکل برعکس ہے؛ بیکار مزدوروں کی جماعت موجودہ شرح اجرت قبول کر کے کوشش اضافہ کی مزاحم ہوتی ہے، اور مزدوروں کا بہت بڑا گروہ اسی دشواری سے اضافۂ اجرت میں بے بس ہے۔ لیکن دباؤ ڈالے بغیر اضافہ انکی اجرت میں بھی بتدریج برابر ہو رہا ہے اور ساتھ ساتھ معیار زندگی بلند ہوتا جاتا ہے؛ مگر اس تبدیلی کے اسباب کچھ اور ہیں جن کی ہم ذیل میں تشریح کرتے ہیں؛

مسئلۂ پیدآوری محنت

۵۔ جیسا کہ عاملین پیدائش کی بحث میں واضح کیا جا چکا ہے، محنت کیا ہے؟ دولت پیدا کرنیکا ایک آلہ۔ اس کا افادہ کیا ہے؟ پیدآوری۔ معلوم ہے کہ زمین کی قیمت زرخیزی اور انجن کی قیمت طاقت محرکہ کے مطابق ہوتی ہے، اور یہ دونوں معیار قیمت افادۂ پیدآوری کی محض مختلف شکلیں ہیں۔ پس اگر محنت کی قیمت بھی یعنی اجرت، مقدار پیدآوری پر منحصر ہو تو کیا عجب ہے: چنانچہ خود واقعات اس اصول کے شاہد ہیں۔ جس مزدور کی محنت میں پیدآوری خواہ بشکل عمدگی یا مقدار کار خواہ بشکل ہر دو، زیادہ پائی جاتی ہے اس کو اجرت بھی زیادہ دی جاتی ہے۔ اجرت اور پیدآوری کا تعلق اسقدر بدیہی ہے کہ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا: لیکن اصول پیدآوری سے صرف اجرت کی کمی بیشی کا ایک اساسی سبب واضح ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم تعین شرح اجرت کے قوانین دریافت کرنے کی کوشش کریں گے؛

پیدآوری مختتم

۶۔ یوں تو پیدائش دولت کیواسطے ہر سہ عاملین، زمین، محنت، اور اصل کی

شراکت لازمی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ زراعت میں زمین کا حصہ غالب رہتا ہے، اور صنعت و حرفت میں اصل کی کارگزاری خاص طور سے قابل لحاظ ہوتی ہے۔ محنت دونوں صورتوں میں یکساں ضروری ہے۔ اوپر جا بجا خصوصاً لگان کی بحث میں زراعت پر قانون تقلیل حاصل کا قوی اثر ظاہر کر چکے ہیں: یعنی یہ کہ کاشت میں چند ابتدائی جرعوں کے استعمال کے بعد کوئی ایک جرعہ ایسا پایا جاتا ہے کہ اس کا اور اسکے مابعد جرعوں کا ماحصل مقابلۃً ماسبق جرعوں کے ماحصل سے کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ان جرعوں میں محنت اور اصل دونوں شامل ہوتے ہیں، لیکن اگر قطعۂ زمین کی طرح مقدار اصل بھی جو استعمال ہو مقرر کر لی جائے اور خالص محنت کے جرعوں میں اضافہ کیا جائے تو بھی اس قانون کا عملدرآمد نمودار ہوگا: مثلاً دس بیگے زمین میں سنو روپے کی لاگت سے کاشت کی جائے، خود کاشتکار اور اس کے دو لڑکے ہل چلا کر کھیت پر کام کریں اور ۵۰ من غلہ پیدا ہو، اب اگر ایک مزدور لگایا جائے تو پیداوار ۶۰ من ہو جائے، دو مزدور بڑھانے سے ۶۶ من، اور تین بڑھانے سے ۷۰ من ہوگی۔ ایسی حالت میں مزدور اوّل کی محنت کی پیداوار ۱۰ من، دوم کی ۶ من، اور سوم کی ۴ من شمار ہوگی۔ اب اگر مزدور سوم بقدر ۴ من اجرت طلب کرے، تو کاشتکار کو کچھ بچت نہ ہوگی اور غالباً وہ اسکو رکھنے پر رضامند نہ ہوگا۔ اس لئے جبکہ مزدور سوم کو بوجہ تہی دستی محنت کے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں اور بوجہ کثرت مزدوراں بپابندی قانون تقلیل حاصل اس سے زیادہ اپنی محنت سے پیدا ہی نہیں کر سکتا تو بمجبوری اس کو کچھ کم چار من اجرت پر قناعت کرنی ہوگی۔ لیکن لطف یہ ہے کہ کاشتکار اوّل اور دوم مزدور کو بھی اس سے زیادہ اجرت دینا گوارا نہ کریگا اور ان کو بھی اتنی ہی قبول کرنی پڑیگی کیونکہ بحالت مفروضہ انکو دوسری جگہ ۴ من سے زیادہ اجرت نہیں مل سکتی، اگر ایسا ممکن ہوتا تو مزدور سوم ہی ۴ من پر کیوں رضامند ہوتا۔ اگر مزدور اوّل یہ کھیت چھوڑ کر دوسری جگہ کام تلاش کرے تو اسکی حیثیت مزدور سوم کی سی ہوگی اور نئی جگہ غالباً وہی ادنیٰ اجرت قبول کرنی پڑیگی۔ کاشتکار زیر بحث کا اوّل مزدور کے چلے جانے سے کوئی نقصان نہ ہوگا کیونکہ اب باقی دونوں مزدوروں کی محنت کی پیداوار ۱۰ من اور ۶ من ہو جانے سے ۴ من شرح اجرت کے حساب سے وہی ۸ من بچت ہوگی جو پہلے ہوتی۔ اگر موجودہ مزدور دوم نے اپنی پیداوار محنت

کی بیشی کی بنا پر اجرت میں بھی اضافہ چاہا تو متلاشی روزگار مزدوروں میں سے کوئی نہ کوئی اگر مزدور دوم کی جگہ لے لیگا اور اضافۂ اجرت بوجوہ مذکور الصدر پھر وہی بندش قائم ہو جائے گی جو مزدور اول کے جانے سے قبل پیش آئی تھی۔ بلکہ اگر کوئی گردش کا مارا چوتھا مزدور کھیت مذکور الصدر پر آگیا اور قانون تقلیل حاصل کی بدولت شرح اجرت ۴ من سے بھی گھٹا دے تو عجب نہیں ؛

مذکورۂ بالا تیسرے یا چوتھے مزدور اور اسکی محنت کی پیداوار کو مزدور مختتم اور پیداوار مختتم کہنا ناموزوں نہ ہوگا۔ اوپر کی بحث سے واضح ہوا کہ اجرت قانون تقلیل حاصل کے اثر سے پیداوار مختتم کے مساوی ہوتی ہے اور مزدوروں کی کثرت سے اسکی مقدار میں کمی ہوتی ہے ؛

زراعت کی مثال میں ہم نے اوپر جو کچھ بیان کیا بعینہ وہی حال صنعت و حرفت کا ہے، عمل پیدائش میں وہاں زمین کا حصہ بڑھا ہوا ہے، یہاں اصل کا، اس فرق سے قانون تقلیل حاصل کے عملدرآمد میں کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ مثال بالا میں اگر کھیت کے بجائے کارخانہ اور زراعت کے بجائے صنعت اور ۴ من کے بجائے چار شئے لکھدی جائیں تو اسکی صحت میں کوئی فرق نہیں آئیگا۔ یہاں یہ مغالطہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سے قبل صنعت و حرفت، قانون تکثیر حاصل کے ماتحت بتائی جا چکی ہے، یہاں وہ قانون تقلیل حاصل کے تابع کہی جاتی ہے: گویا اجتماع ضدین لازم آتا ہے۔ لیکن یہ ایک سطحی دھوکا ہے قانون تقلیل حاصل کی متابعت سے مراد یہ ہے کہ قطعۂ اراضی کی طرح اصل کی کوئی مقدار لامحدود محنت کی متحمل نہیں ہو سکتی: یعنی یہ ممکن نہیں کہ اگر دس ہزار اصل سے ۵۰ مزدور کام کرکے ایک مقدار پیدا کریں تو اسی اصل سے سو مزدور کام کرکے دوگنی مقدار پیدا کر سکیں گے۔ غالباً ڈیوڑھی پیدا کرنی بھی دشوار ہوگی اور یہ عمل قانون تقلیل حاصل کا نتیجہ نہیں تو اور کیا ہے! اب غور کیجیے کہ صنعت و حرفت قانون تکثیر حاصل کے زیر عمل کیوں کہلاتی ہے؟ اس سے مراد یہ ہے کہ بمقابلہ زراعت کے صنعت میں استعمال مشین اور پیدائش بر پیمانہ کی بیحد گنجائش ہے: جس کا نتیجہ نسبتہً تخفیف مصارف پیدائش ہے، اور یہی قانون تکثیر حاصل کا منشا ہے۔ اور صنعت پر کیا منحصر ہے، بعض بعض حالتوں میں زراعت پر بھی اس قانون کا ایک حد تک اثر نمایاں ہوتا رہتا ہے۔ پس واضح ہوا کہ قانون تکثیر حاصل کا زمین، محنت، اور اصل کی مقدار سے تعلق ہے جو ملکر کام کریں اور

قانون تقلیل حاصل، عمل پیدائش میں زمین محنت اور حاصل کی باہمی نسبت سے متعلق ہے۔ بالفاظ دیگر اگر عاملین کی بڑی سے بڑی مقداریں یکجا کام کر سکیں تو قانون تکثیر حاصل کا عمل ظہور پذیر ہوگا اور اگر عاملین میں سے کسی کی مقدار نسبت مناسب سے تجاوز کرے تو اس کی پیداوار قانون تقلیل حاصل کی تابع ہوگی۔

حاصل کلام یہ کہ زراعت وصنعت دونوں یکساں قانون تقلیل حاصل کے تابع ہیں۔ محنت کے جزعوں کی پیداوار ایک خاص حد کے بعد نسبتہً گھٹنے لگتی ہے۔ اجرت ہمیشہ محنت کی پیداوار مختتم کے مساوی ہوتی ہے اور کثرت مزدوراں سے اسکی مقدار گھٹنی یقینی ہے۔

اول تو اجرت پیداوار مختتم کے برابر قرار پائی پھر کثرت مزدوراں سے اس کی مقدار گھٹی، اس پر طرہ یہ کہ مزدور و نیز مجبوری، تہی دستی، جہالت، پست ہمتی، رسم ورواج کی پابندی، اور آجروں کے غلبے، اور تسلط کی بدولت، یہ اقل قلیل معاوضہ بھی پورا پورا بمشکل ہاتھ آتا ہے، جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا محنت کا ماحصل زائد بشکل منافع آجر کی جیب میں جاتا ہے۔ آجر اگر محنت کی پیداوار میں سے ایک مناسب حصہ بطور کمیشن لے بھی تو کچھ مضائقہ نہیں، لیکن جب وہ مزدوروں کے سب سے قلیل حصے میں سے بھی کچھ غصب کرے تو یہ ظلم ہے: یا تو مزدور پائمال ہوجاوینگے، یا تنگ آکر وہ اسٹرائک یعنی ہڑتال شروع کر دینگے۔ دونوں صورتوں میں عام ملکی مرفہ الحالی کو مضرت پہنچنا یقینی ہے۔

واضح ہو کہ مزدور مختتم آجر کا بہت بڑا محسن ہے! اضافۂ ماحصل زائد کے لحاظ سے اسکی حالت بعینہ مثل نہر کی جھال کی چوٹی کے ہے جو نیچی ہو ہو کر پانی کی زیادہ زیادہ مقدار اپنے اوپر سے گزرنے کا موقع دیتی ہے اور یہی اوپر سے گزرنے والا پانی گویا ماحصل زائد ہے۔ جو پانی جہاں سے رکا رہے اس کو مزدور و نیز اجرت سمجھنا چاہئیے۔ یہ مزدور جتنا آگے بڑھیگا، ماسبق مزدوروں کو بشکل تخفیف اجرت نقصان پہنچائیگا اور آجر کو بشکل اضافۂ ماحصل زائد نفع۔ لیکن اگر پیچھے ہٹے تو نتیجہ بالکل برعکس ہوگا۔ کسی کاروبار میں دسویں مزدور مختتم کے مقابل پانچواں مختتم مزدوروں کے حق میں مفید اور آجر کے حق میں مضر ہے۔ مزدور مختتم کا قرب، وبعد بھی گویا محنت اور اجرت کے متعلق قانون طلب ورسد کی ایک گونہ تشریح ہے۔

یہ خیال کرنا صحیح نہ ہوگا کہ مزدور مختتم سے لازماً وہی مزدور مراد ہے جو بلحاظ ترتیب یا وقت سب سے آخر میں شریک کار بنے۔ بلکہ مزدوروں کے اسی گروہ میں جو ایک ہی وقت کام شروع کرے مزدور مختتم کی موجودگی ممکن ہے۔ درحقیقت مزدور مختتم سے مُراد کام کرنے والی ایسی جماعت کا کوئی فرد ہے کہ جس میں اگر کوئی جدید مزدور شامل کریں تو مزید ماحصل اسکی اجرت سے کم رہے۔ اول تو جب مزدوروں کی ایک جماعت ملکر کوئی کام کرے تو ہر ایک کے کام کی جداگانہ مقدار دریافت کرنا اکثر محال ہوتا ہے؛ دوسرے یہ بھی فرض کیا جاتا ہے کہ مزدور مختتم کارکردگی میں باقی دوسروں کے برابر ہے۔ پس اس کی محنت کا جداگانہ ماحصل جس کا دریافت کرنا دشوار ہے دوسروں سے کم ہونا ضروری نہیں ؛

اس کے شریک جماعت ہونے سے ماحصل میں جو اضافہ ہوتا ہے اور جو سب ماسبق اضافوں سے کم مقدار ہوتا ہے، درحقیقت کل جماعت کی مجموعی محنت سے پیدا ہوتا ہے، نہ اسکی جداگانہ محنت سے۔ اور اسکے سب سے کم مقدار ہونے کا باعث مزدور مختتم کی کارکردگی کا نقص نہیں بلکہ قانون تقلیل حاصل ہے۔ یہ تو عام تجربہ ہے کہ کسی کام میں تعداد مناسب سے زیادہ مزدوروں کی شرکت نہ صرف مالی نقصان بلکہ خرابی کار کا باعث ہوتی ہے اور مزدور مختتم کی کل بحث اسی واقعے کی تشریح ہے اور کچھ نہیں ؛

پس ثابت ہوا کہ اجرت کا محنت کی پیداآوری سے اتنا ہی تعلق ہے کہ وہ پیداوار مختتم کے برابر ہوتی ہے۔ اب ہم کو یہ دکھانا باقی ہے کہ خود یہ معیار کس قدر غیر معین ہے، اور کتنے بیشمار اسباب اسکی کمی بیشی کا باعث ہو سکتے ہیں۔ ایک سادہ مثال لو جو زراعت و صنعت دونوں سے مشابہ ہے: کسی شخص کے ہاں دودھ مکھن کا کارخانہ جاری ہے، گائے بھینسوں کی نگرانی کے واسطے دس گھوسی نوکر ہیں، اگر گیارھواں گھوسی ملازم رکھا جائے تو گلے میں دس گایوں کا اضافہ ہو سکیگا۔ گویا موجودہ مشینوں سے انکے دودھ کا مکھن نکل سکیگا اور ان کے رہنے کیواسطے موجودہ جگہ میں سے گنجائش نکل سکیگی؛ اسی طرح ہر کارخانے میں توسیع کی ضرورت نہ ہوگی۔ اب اگر اس گیارھویں گھوسی کی اجرت جدید دس گایوں کی آمدنی سے کم ہو تو کارخانہ دار اسکو ضرور ملازم رکھ لیگا، اور اس کا

کام محنت مختتم ہوگا۔ واضح ہو کہ محنت مختتم کے ماحصل کی کمی بیشی گھوسیوں کی تعداد پر منحصر ہے، خود تعداد قوانین رسد و طلب کے تابع ہے، ایک طرف تو موجودہ نسل کا وہ طبقہ ہے جس سے گھوسی مہیا ہو سکیں، دوسری جانب دودھ مکھن کا صرف اور ایسے کارخانوں کی تعداد: گویا دودھ، مکھن کی حالت طلب و رسد، اور یہ حالت خود بیشمار اثرات کے تابع ہے۔ علاوہ ازیں چارے کی قلت و کثرت کا بھی محنت مختتم سے قریبی تعلق ہے، اور چارے کی پیداوار زرعی حالت سے متعلق ہے، جو خود بیشمار اسباب کے زیر اثر ہے، مزید برآں گائے بھینسوں کی رسد جس کا دارومدار چارے کی مقدار اور چراگاہوں اور گھوسیوں کی تعداد پر ہے اور انکی طلب جو چمڑے، گوشت، دودھ، مکھن، اور زرعی کام کی طلبوں پر منحصر ہے، محنت مختتم پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ قصہ مختصر محنت مختتم کا تعین بیشمار پیچ در پیچ اسباب پر منحصر ہوتا ہے۔ ہم کو یہ جاننا کافی ہے کہ کسی کام میں یکساں کارکردگی والے مزدوروں کی شرح اجرت، محنت مختتم کے ماحصل کے برابر ہوتی ہے گویا شرح اجرت کا معیار پیداوار مختتم ہے ؛

اجرت کے متعلق اسوقت تک جو چار مسئلے بیان کئے گئے ان میں سے ہر ایک جداگانہ کل حقیقت کا صرف ایک جزو واضح کرتا ہے۔ ہر ایک بذات خود نامکمل ہے لیکن مکمل تشریح اجرت کیواسطے ان سب کا اجتماع لازمی ہے۔ اگر ربڑ کے چند تسموں سے کوئی چیز لٹکائی جائے تو وزن سنبھالنے میں ہر ایک تسمہ باقی تسموں کو مدد دیتا ہے، اور سب کی مجموعی قوت سے انکی یکساں لمبائی قرار پاتی ہے، اب اگر کسی تسمے کی لمبائی گھٹائی بڑھائی جائے یا اسکی قوت میں کمی بیشی پیدا کی جائے تو یقیناً باقی تسموں کی لمبائی میں بھی فرق پیدا ہوگا اور لٹکنے والی چیز کی سطح بھی ضرور اونچی نیچی ہو جائیگی: بعینہ یہی حال مذکورۂ بالا مسائل کے تعلق کا ہے۔ مسئلہ اجرت فنڈ محنت کی طلب پر، مسئلہ معیار زندگی محنت کی رسد پر اور مسائل پیدآوری محنت و پیداوار مختتم تعین شرح اجرت پر روشنی ڈال کر مسئلہ اجرت کی کامل توضیح کرتے ہیں۔ اور آپس میں بھی ایک دوسرے سے اثر پذیر ہوتے ہیں: گویا یہ کل مسائل اجرت پیدا کرنے والے مشین کے پرزے ہیں، اور ظاہر ہے کہ مشین چلنے کیواسطے ہر ایک پرزہ اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ کوئی دوسرا۔ ان تمام مسائل کو کسی ایک جامع مسئلے کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کامیاب ہونی محال

باب دہم نظر آتی ہے، ہر ایک کو جداگانہ ذہن نشین کرکے ان کا باہمی تعلق سمجھ لینے سے بھی وہی مطلب حاصل ہوتا ہے اور یہ طریق سہل بھی ہے۔

اقسام اجرت ۷۔ چند اصول پر اجرت کی کئی قسمیں قرار دی گئی ہیں: اوّل اجرتِ متعارفہ اور اجرت صحیحہ کو لیجئے! بالعموم مزدور کو اجرت بشکل زر نقد ادا کی جاتی ہے: مثلاً کچھ آنے روز یا چند روپے ماہوار؛ لیکن فی نفسہٖ یہ زر نقد کیا ہے؟ سونے چاندی اور تانبے کے مثل، دھاتوں کے ٹکڑے، جن کو مزدور نہ کھا پی سکے نہ پہن اوڑھ سکے؛ دولتمند لوگ جو قیمتی زیوروں اور سامان کے شائق ہوں، ان دھاتوں کے ٹکڑوں سے کچھ کام لے سکتے ہیں، لیکن غریب مزدوروں کے نزدیک جن کی ضروریات زندگی سادہ اور مختصر ہیں، یہ ٹکڑے بذات خود مٹی کی طرح ہیچ ہیں۔ وہ تو اس لیے محنت کرتے ہیں کہ کھانے کو روٹی، پہننے کو کپڑا اور رہنے کو مکان ملے۔ ان کے علاوہ اگر کچھ اور سامان راحت میسّر آسکے تو فبہا ورنہ مضائقہ نہیں؛ براہ راست نہ زر نقد سے مزدور کی احتیاج پوری ہوتی ہے نہ مزدور کو اس سے سروکار، جیسا کہ ہم آگے چلکر تقسیم دولت کے تحت میں واضح کرینگے۔ زر نقد نہایت سہولت افزا آلۂ مبادلہ ہے، بذات خود مزدور کی ضروریات سے خارج سہی، لیکن بحیثیت آلۂ مبادلہ وہ مزدور کو حصول ضروریات میں بیش بہا مدد دیتا ہے؛ اور اسی وجہ سے مزدور بھی بلا حجت اسکو بطور اجرت قبول کر لیتا ہے۔ جب خورونوش اور لباس و مکان کا سامان مزدور کا مقصود ٹھیرا اور اسی کو حاصل کرنے کی غرض سے وہ محنت کرتا ہے تو اس کی اجرت کا صحیح معیار اس سامان کی وہ مقدار ہے جو وہ اجرت کے زر نقد سے خرید سکے؛ زر نقد کی مقدار فی نفسہٖ اسکے نزدیک ناقابل لحاظ ہے۔ اجرت بمعیار ضروریات اجرت صحیحہ، اور بمعیار زر نقد اجرت متعارفہ کہلاتی ہے۔ مزدور کی کل ضروریات کو شئے واحد، مثلاً گیہوں تصور کرکے، فرض کرو کہ کسی زمانے میں اجرت متعارفہ دس روپے ماہوار ہے، اور اجرت صحیحہ ۵ من گیہوں: اب اگر اجرت متعارفہ ۱۰ سے بڑھ کر ۱۶ روپے ہو جائے، اور بوجہ گرانی نرخ اجرت صحیحہ ۵ من سے گھٹ کر ۴ من رہ جائے، تو اجرت متعارفہ میں نصف سے زیادہ اضافے کے باوجود اجرت صحیحہ میں بمقدار ⅕ تخفیف ہو جائیگی۔ اس کے برعکس اگر اجرت متعارفہ صرف آٹھ روپے ہو لیکن بوجہ ارزانی نرخ اجرت صحیحہ ۶ من گیہوں ہو جائے تو باوجود کمی اجرت متعارفہ، اجرت صحیحہ

میں بیشی ہوجائیگی۔ گویا بلحاظ اضافہ و تخفیف ان دونوں قسم کی اجرتوں میں کوئی تعلق معین نہیں، ان کی تبدیلی میں موافقت اور مخالفت دونوں ممکن ہیں۔ اور جیساکہ ہم کہہ چکے ہیں مزدور کو تو مقدار گیہوں سے غرض ہے نہ کہ تعداد روپیہ سے، لہذا اجرت صحیحہ کا اس کی حالت پر مفید و مضر اثر پڑتا ہے نہ کہ اجرت متعارفہ کا۔ چونکہ اجرت کا تعین اور ادائی بشکل زر نقد بیحد آسان ہے، اجرت متعارفہ کا رواج ہوگیا؛ ورنہ مزدور کو صرف اجرت صحیحہ سے سروکار ہے۔ اور جبکہ زر نقد کا استعمال اسقدر رائج نہ تھا اور نیز اب بھی پسماندہ دیہات میں اجرت میں غلہ دیا جاتا ہے، ان دونوں قسم کی اجرتوں کے فرق سے بخوبی واضح ہوگا کہ مزدور کی مرفہ الحالی اجرت صحیحہ کے اضافے سے وابستہ ہے۔

یہ اضافہ دو طرح سے ظہور پذیر ہو سکتا ہے: اگر نرخ ضروریات معین ہو تو اجرت متعارفہ کے بڑھنے سے؛ اور اگر اجرت متعارفہ متعین ہو تو نرخ ضروریات گھٹنے سے؛ اور اگر اضافۂ اجرت متعارفہ کیساتھ نرخ ضروریات میں تخفیف بھی ہو تو پھر کیا کہنا! گویا اجرت صحیحہ میں دو طرح کا اضافہ ہوجائیگا۔ لیکن حالت بالکل اسکے برعکس ہے؛ ایک طرف تو اجرت متعارفہ بڑھ رہی ہے، دوسری طرف ضروریات گراں ہوتی جاتی ہیں، گویا دو متضاد قوتیں اجرت صحیحہ پر عمل کر رہی ہیں۔ اب اگر اضافۂ اجرت متعارفہ کا اثر گرانی ضروریات پر غالب آگیا تو اجرت صحیحہ میں اسی النسبت سے اضافہ ہوجائیگا، اور اگر اثر الٹا پڑا تو نتیجہ بھی برعکس ہوگا: گویا باوجود اضافۂ اجرت بوجہ گرانی ضروریات اجرت صحیحہ میں تخفیف ہوجائیگی۔ یہی آخری حالت ہے جو ہندوستانکے مزدور اور ملازمت پیشہ لوگوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اگر آمدنی کو روپے سے شمار کرتے ہیں تو بہ نسبت سابق معقول اضافہ معلوم ہوتا ہے، لیکن جب ضروریات کے معیار سے تخمینہ کرتے ہیں تو معاملہ اکثر برعکس نظر آتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ضروریات کا اضافہ بھی خاندانی مصارف کی زیادتی کا باعث ہو سکتا ہے؛ لیکن ہندوستان کے مزدوروں اور ملازمت پیشہ لوگوں میں یہ ادبار گرانی ضروریات کی بدولت پھیلا ہوا ہے۔

واضح ہو کہ ازالۂ مرض سے انسداد مرض بہتر ہے! اجرت صحیحہ بڑھانے یا بالفاظ دیگر مزدور کی مالی حالت قوی کرنے کا طریق بہ نسبت اجرت متعارفہ بڑھانیکے نرخ ضروریات گھٹانا بدرجہا زیادہ کارگر ہوگا۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ افزونی آبادی اور قانون

تقلیل حاصل کے قوی اثرات گرانی کے معاون اور ارزانی کی راہ میں سخت مزاحم ہوتے رہے ہیں۔ لیکن پھر بھی ترقی کارگزاری اور عجیب و غریب ایجادات کی مدد سے ان اثرات کا زور بہت کچھ توڑا جا رہا ہے اور مصنوعات میں اکثر قانون تکثیر حاصل کا اثر غالب نظر آتا ہے۔ محنت کی پیدآوری میں جتنا اضافہ ہوگا؛ یعنی کسی ایک مقدار معین سے جتنی زیادہ پیداوار حاصل ہوگی یا پیداوار کی معین مقدار حاصل کرنے کے واسطے جس قدر کم محنت درکار ہوگی، ضروریات جو اس محنت سے پیدا ہونگی ارزاں ہو جائیں گی۔ چنانچہ کارکردگی کی ترقی اور کلوں کی ایجاد کا منشا یہی محنت کی پیدآوری کا اضافہ ہوتا ہے؛ اور اسی وجہ سے ان کے عمل کا اثر ارزانی ضروریات پر بہت موافق پڑتا ہے۔ یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ ارزانی ضروریات اگر مزدوروں کے حق میں مفید ہے تو ضروریات کے پیدا کرنے والوں کے حق میں بشکل تخفیف آمدنی مضر ہوگی۔ اوّل تو خود ہر ایک پیدا کرنے والے کو بہت سی ضرورتیں ہیں اور اگر اس کی پیدا کی ہوئی ضرورت کی ارزانی سے اس کو کوئی نقصان پہنچیگا تو باقی دوسری ضروریات کی ارزانی جو اسکو درکار ہے اس نقصان کی بشکل تخفیف مصارف پوری تلافی کردیگی۔ علاوہ ازیں ارزانی کی بدولت خود اسکی پیدا کی ہوئی ضرورت کی طلب بڑھیگی اور پیدائش بر پیمانۂ کبیر کے فوائد یا قانون تکثیر حاصل کے اثرات کی بدولت مصارف پیدائش میں ارزانی کے مطابق کم و بیش تخفیف ہوسکیگی۔ اور مزید براں شرح منافع فی شئے بوجہ ارزانی گھٹ بھی جائے تو منافع کی مقدار کلی بوجہ اضافۂ خرید اشیا بڑھ جانا عجب نہیں؛ اور ظاہر ہے کہ ہر شئے کو منافع کی مقدار کلی سے مطلب ہے نہ کہ شرح منافع فی شئے سے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ارزانی ضروریات سب کے حق میں مفید ہے اور غالباً کسی کے حق میں بھی مضر نہیں۔ اور قوم کو خوشحال اور دولتمند بنانے کا کارگر طریق محنت و اصل کی پیدآوری بڑھا کر ضروریات کو ارزاں کرنا ہے اور بس۔

اجرت کی دو قسمیں متعارفہ اور صحیحہ' بلحاظ معیار ادائی بیان کی جا چکی ہیں۔ بلحاظ معیار تعین شرح بھی اجرت کی تین قسمیں پائی جاتی ہیں: جبکہ اجرت کا حساب مطابق اس مقدار وقت کے ہو جو محنت میں صرف کیا جائے تو یہ اجرت مختص بالزمان کہلاتی ہے، مثلاً بیس روپے ماہوار یا چار آنے روز۔ اور جبکہ اجرت مطابق مقدار کار

قرار پائے تو اسکو اجرت مختص بالعمل کہتے ہیں، مثلاً کپڑا بنوائی ۲ آنے گز، یا اناج پسوائی ایکروپیہ من، یا کتاب لکھوائی ایک روپیہ جزو - اجرت خواہ مختص بالزماں ہو خواہ مختص بالعمل، اسکی مقدار کارکردگی کے مطابق اکثر مزدوروں کے حق میں جداہوگی۔ معمولی خدمتگار کو آٹھ روپے تو ہوشیار کو دس روپے ماہوار دیے جاسکتے ہیں: معمولی بڑھئی آٹھ آنے اور کاریگر بارہ آنے روز پاتا ہے۔ یہی حال اجرت مختص بالعمل کا ہے، جو جتنا کام کریگا اتنی اجرت پائیگا: ایک ہی طرح سے بعض زود نویس اور محنتی کاتب عصہ روز کماتے ہیں، اور بعض بمشکل آٹھ آنے۔ جو مقدار اجرت بلحاظ کارگزاری دریافت کرتے ہیں، اسکو اجرت مختص بہ کارگزاری کہتے ہیں ۞

واضح ہو کہ بندش رسم و رواج سے مزدوروں کی رہائی کا، بالفاظ دیگر انکے آزادانہ مقابلے کا نتیجہ اجرت مختص بالزمان و نیز مختص بالعمل میں فرق اور اجرت مختص بہ کارگزاری میں تناسب پیدا ہوتا ہے؛ مقابلے کے دباؤ سے ہر مزدور کی اجرت اسکی کارگزاری کے مطابق بن جائیگی - اسی وجہ سے اجرت مختص بالزمان اور مختص بالعمل میں فرق نمایاں ہوگا؛ غیر مساوی کارگزاری والے مزدور نہ اجرت مختص بالزمان برابر پاسکیں گے نہ اجرت مختص بالعمل، ہر ایک کی اجرت کارگزاری کے مطابق ہوگی - اور مساوات کارگزاری کے ساتھ ہی مساوات اجرت خواہ مختص بالزمان ہو خواہ مختص بالعمل ممکن ہے - لہذا جب کہا جاتا ہے کہ مزدوروں کے آزادانہ مقابلے کا نتیجہ مساوات اجرت ہے تو وہاں پر اجرت مختص بہ کارگزاری مراد ہوتی ہے ۞

واضح ہو کہ محنت جس قدر زیادہ نقل پذیر ہوگی اور کام جسقدر غیر تخصیص طلب ہوگا اسی قدر آزادانہ مقابلے کا مذکورۂ بالا نتیجہ بیشتر واضح ہوگا ۞

اجرت مختص بہ کارگزاری کے متعلق ایک مغالطہ جس کا پیدا ہونا ممکن ہے، جتانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ مسئلۂ پیدا آوری مختتم کے تحت میں بیان کیا گیا ہے کہ مزدوروں کی کسی جماعت کی شرح اجرت مزدور مختتم کی پیدا آوری محنت کے جو سب سے کم ہوتی ہے، برابر ہوگی، لیکن جیسا کہ پہلے بھی واضح کیا جاچکا ہے، ایسی جماعت کے کل مزدوروں کی کارگزاری یکساں ہونی چاہیئے نہ کم نہ بیش - اور محنت مختتم کی پیدا آوری کمی کا باعث عمل قانون تقلیل حاصل ہے، نہ کہ مزدور مختتم کی کارگزاری کا نقص - اور یہاں آزادانہ مقابلے کا اثر جو ہر مزدور کی اجرت اسکی کارگزاری کے مطابق بنادینا ظاہر کیا گیا ہے، تو ایسے

باب یازدہم

مزدوروں کی کارگزاری میں بجائے یکسانیت کے فرق فرض کیا جاتا ہے۔ گویا ان دونوں نحتوں کا علی الترتیب نتیجہ یہ ہے کہ یکساں کارگزاری والے مزدور برابر برابر اجرت پاتے ہیں اور مختلف کارگزاری والے مزدوروں کی شرح اجرت میں کارگزاری کی کمی بیشی کے مطابق تخفیف واضافہ ہوتا رہتا ہے، جو جتنا کام کرتا ہے اتنی اجرت پاتا ہے ؛

چونکہ ان دونوں مسئلوں میں بظاہر تضاد نظر آنے کا اندیشہ ہو سکتا تھا، احتیاطاً مزید تشریح کردی گئی ؛

فرق اجرت کے اسباب

۸۔ شرح اجرت میں بیشمار فرق پائے جاتے ہیں: غریب قلی دن بھر بوجھ ڈھو کر بمشکل کنبے کی گزر کے لائق شام تک کماتا ہے، اور ایک مشہور گویا گھنٹہ بھر گا کر صدہا روپے پا جاتا ہے، سرکاری ملازمین یا کارخانہ جات کے مزدوروں کی فہرست تنخواہ یا اجرت اٹھا کر دیکھو تو چند روپے سے لیکر ہزاروں روپے تک بیشمار مدارج نظر آئیں گے، ظاہر ہے کہ یہ بیشمار دیرپا اور بڑے بڑے فرق محض اتفاقات کا نتیجہ نہیں ہو سکتے۔ اجرت صحیحہ کے تخمینے میں جن جن باتوں کا لحاظ لازمی ہے، اول ان کی تفصیل کرنے کے بعد ہم فرق اجرت کے اسباب تحقیق کرنا چاہتے ہیں ؛

تخمینہ اجرت صحیحہ میں امور ذیل لازمی طور سے توجہ طلب ہیں :۔

۱۔ زر نقد کی قوت مبادلہ میں کمی بیشی۔ بالفاظ دیگر ضروریات کی گرانی وارزانی، باوجودیکہ ریلوں نے اکثر چیزوں کی قیمت ہر جگہ کم و بیش مساوی کردی ہے، تاہم واقعات شاہد ہیں کہ خورد و نوش کی معمولی چیزیں جنکی مزدور کو ضرورت ہے، شہروں میں بہ نسبت دیہات و قصبات کے زیادہ گراں ملتی ہیں۔ ایندھن، گھاس، چارہ جنکی مفصلات میں کوئی کمی نہیں، شہروں میں غلے کی مانند تل کر فروخت ہوتے ہیں، اور مکانات کے کرائے میں تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ جو ضروریات شہروں میں ایک روپے سے پوری ہوتی ہیں، ان کے واسطے مفصلات میں آٹھ آنے، بلکہ اس سے بھی کم کافی ہیں۔ اور اسی وجہ سے دیہات کے مزدور گو اجرت میں زر نقد کم پائیں لیکن بلحاظ حصول ضروریات وہ شہر والوں سے بہتر نہیں تو بدتر بھی نہ ہونگے۔ چنانچہ شہر والوں کی آمدنی کی زیادتی اکثر سطحی دھوکا ہوتی ہے۔ انکو قصبات کے کم آمدنی والوں سے زیادہ آرام میسر نہیں ہوتا شہروں میں جو چیزیں

بمقابلہ قصبات کے ارزاں ملتی ہیں وہ اکثر تنعمات سے متعلق ہیں، دولتمند ان سے لطف اٹھا سکتے ہیں غریب مزدور کی حیثیت سے وہ بالا تر ہیں۔ جہاں تک مایحتاج زندگی کا تعلق ہے مفصلات کی بود و باش بمقابلہ شہروں کے بہت کم خرچ ہوتی ہے ٭

ب۔ طریق ادائی اجرت۔ بالعموم تو مزدوروں کو صرف اجرت متعارفہ دیجاتی ہے لیکن بعض پیشہ وروں کو اجرت کا ایک جزو بشکل ضروریات بھی ملتا ہے: یعنی ان کی کچھ اجرت متعارفہ ہوتی ہے اور کچھ صحیحہ۔ مثلاً سائیس کو علاوہ ماہواری تنخواہ کے رہنے کے واسطے مکان، جلانے کیواسطے بچی کھچی گھاس، اور امرا کے ہاں پہننے کے واسطے وردی بھی ملتی ہے؛ باورچی کو بھی علاوہ تنخواہ کے خوراک و مکان ملتا ہے؛ ریلوے ملازمین کو کرایہ معاف ہے؛ کہیں کہیں بڑے بڑے کارخانوں کے مزدوروں کو مکانات بلا کرایہ دئے جاتے ہیں؛ ان کی ضروریات تھوک فروشی کے کمتر نرخ سے مہیّا کی جاتی ہیں؛ اور نیز پیداوار خام کے بعض ناقص حصے جو کارخانہ دار کے نزدیک ازکار رفتہ ہوتے ہیں مزدوروں کو مل جاتے ہیں جن سے وہ تھوڑا بہت کام ضرور نکال لیتے ہیں۔ غریب مزدور موسم سرما میں خصوصاً رات کے وقت روئی اوٹنے کے کارخانوں میں نہایت شوق سے کام کرتے ہیں، کیونکہ علاوہ اجرت ملنے کے ان کو سردی کی تکلیف سے بھی نجات مل جاتی ہے۔ یہ تمام ضروریات جو مزدوروں کو حاصل ہوتی ہیں اجرت صحیحہ کا جزو ہیں۔ اور اجرت کلّی کے تخمینے میں ان کا لحاظ ضروری ہے ٭

یہاں یہ نکتہ بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مزدور کے لیے جو ضروریات مہیّا کیجاتی ہیں انکی قدر و قیمت کا تخمینہ مزدور کے نقطۂ خیال سے کرنا چاہیے نہ کہ آجر کے۔ فرض کرو کہ کوئی امیر اپنی تزک و شان کے خیال سے اپنے ملازمین کو زرق برق قیمتی لباس پہنائے یا اپنے پاس اس کو کسی ایسی جگہ رکھے جہاں کرایۂ مکان و صرف خوراک بہت زیادہ ہو تو ایسے لباس کی قیمت یا خرچ خوراک و کرایہ مکان کا حصہ رسد جزو اسکی اجرت میں شمار کرنا صحیح نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ مزدور اگر آجر کا مطیع نہ ہوتا تو نہ ایسا لباس پہنتا، نہ ایسی جگہ آکر رہتا۔ مذکورہ بالا مصارف کی مقتضی آجر کی ضروریات ہیں نہ کہ مزدور کی۔ لہٰذا آجر کی ضروریات مہیّا کرنے میں

خواہ کچھ ہی صرف ہو مزدور کی اجرت میں ان کے مصارف کا صرف اس قدر حصہ شمار کرنا چاہئیے جو خود مزدور کی ضروریات کے واسطے بحالت خودمختاری مزدور کو درکار ہوتا۔ اسی طرح اگر مزدور کو ایسی چیز ملے، جو آجر کے نزدیک محض نکمی اور ناکارہ ہو، اور مزدور کا اس سے کوئی کام نکل سکے تو یہ چیز نہ ملنے کی حالت میں ایسی ضرورت پر مزدور کو جو کچھ صرف کرنا پڑتا وہ اس چیز کے تعلق سے مزدور کی اجرت میں شمار کرنا چاہئیے۔ حاصل کلام یہ کہ کوئی چیز جو مزدور کو دی جاتی ہے آجر کے نزدیک بیش قیمت ہو یا ناکارہ، اس کی قیمت وہ رقم قرار دینی چاہئیے جو مزدور کو چیز نہ ملنے کی حالت میں ضرورت متعلقہ حاصل کرنے کے لئے صرف کرنی پڑتی ہ

ج ۔ خود مزدور کو یا اس کے خاندان کو مزید اجرت حاصل کرنے کا موقع۔ بعض پیشے ہیں کہ ان میں علاوہ تنخواہ کے مزید آمدنی حاصل کرنے کے موقع بھی پیدا ہو سکتے ہیں: اسکول کے مدرس نج کے طور پر طلبہ کو پڑھا کر تنخواہ ملازمت کے برابر بلکہ اس سے زیادہ روپیہ کما لیتے ہیں، بعض طبیب اور ڈاکٹر کسی عزیز یا دوست کا دواخانہ جاری کرا کے اپنے مریضوں کو وہاں سے دوا خریدواتے ہیں اور منافع میں خود بھی شریک رہتے ہیں، اسی طرح ہوشیار درزی کپڑا بھی خود ہی فروخت کرتے ہیں، اور دوسری جگہ سے خریدے ہوئے کپڑے کے مقابلے میں اپنے ہاں کے کپڑے کو جلدتر اور زیادہ عمدگی سے تیار کر کے گاہکوں کو اپنی دکان سے کپڑا خریدنے پر ایک حد تک مجبور کرتے ہیں؛ علاوہ اجرت سلائی کپڑے کی تجارت سے بھی منافع اٹھاتے ہیں۔ بڑے بڑے کارخانوں اور دفتروں کی ملازمت میں اپنے عزیز و اقربا کے واسطے صورتیں پیدا کرنی آسان ہوتی ہیں اور بعض محکموں مثلاً ریلوے میں تو کسی ملازم کی رشتہ داری از روئے قاعدہ امیدوار کے حقوق میں داخل ہے۔ حصول ملازمت میں بعض پسماندہ فرقوں کے افراد کو اپنی تعلقات کی کمزوری کی وجہ سے بمقابلہ دیگر قابو یافتہ فرقوں کے ناکامی یا کم از کم دقت پیش آتی ہے۔ اگر کسی خاندان کے اکثر افراد ملازم ہوں اور فرداً فرداً تنخواہ کم ہو تو خاندان کی مجموعی آمدنی کسی ایسے خاندان سے زیادہ ہونی ممکن بلکہ اغلب ہے، جہاں صرف ایک شخص بڑی تنخواہ پاتا ہے اور

باقی سب بیکار ہیں۔ اور چونکہ مالی حالت کل خاندان کی مجموعی آمدنی اور مصارف کی نسبت سے متعلق ہے لہذا اقربا و اعزا کے واسطے ملازمتیں پیدا کرنے کی قدرت اجرت صحیحہ کا اس وجہ سے ایک جزو ہے کہ اس سے خاندانی آمدنی بڑھانے کی ضرورت حاصل ہوتی ہے۔ ہر سمجھدار مزدور ایسے کارخانے میں جہاں صرف اس کی محنت درکار ہو، آٹھ آنے روز پر کام کرنے کے مقابلے میں دوسرے کارخانے میں چھ آنے روز پر کام کرنا پسند کریگا، جہاں اس کے بچے بھی سہل کام کر کے ۳ روز کما سکیں۔ چنانچہ باوجود کمی شرح اجرت مزدور اس جگہ رہنا پسند کرتے ہیں جہاں خاندان کے اکثر افراد کام پا سکیں۔ گویا مزدور کے نزدیک خاندان کی مجموعی آمدنی قابل لحاظ ہے نہ کہ شرح اجرت، اور یہی بات قرین عقل بھی ہے۔ خاندانی آمدنی کی اہمیت صنائع تضمینی و تضیمی کے تحت میں بھی واضح کی جا چکی ہے ؛

کسی شئے میں خود ملازم کو جو مزید آمدنی حاصل ہو سکتی ہے : مثلاً اسکول کے مدرس کو نجی کی تعلیم سے فیس ملتی ہے، تو اس کو اصطلاحاً اجرت تضیمی کہتے ہیں۔ خاندان کی مجموعی کمائی کو بھی اجرت خاندانی سے تعبیر کرتے ہیں ؛

ان دونوں قسم کی اجرتوں کا اجرت صحیحہ سے جو قریبی تعلق ہے ہم ابھی ظاہر کر چکے ہیں ؛

۷۔ سلسلہ ملازمت کا قیام۔ بعض پیشے تو بارہ مہینے یکساں چلتے ہیں : جیسے دھوبی، حجام، سقے اور باورچی کا کام۔ لیکن بعض خاص خاص موسم یا حالات میں فروغ پاتے ہیں، اور باقی وقت بیکاری میں بسر کرتے ہیں۔ مثلاً درزی اور معمار، بارش کے موسم میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہتے ہیں؛ لیکن موسم سرما آتے ہی ان کا روزگار چمک اٹھتا ہے۔ تجارتی مرکزوں میں غلہ ڈھونے والے مزدور جن کو پلہ دار کہتے ہیں، فصل ربیع و خریف کے موقع پر اتنا زیادہ کما لیتے ہیں کہ برسات میں گھر بیٹھ کر کھاتے ہیں۔ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کے بیاہ شادی کے موسم کچھ مقرر سے ہیں ان دنوں میں تو باورچی اور باجہ بجانے والوں کو سائیاں سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے لیکن باقی دنوں

میں وہ اتفاقی تقریبوں کا نہایت بےچینی سے انتظار کرتے رہتے ہیں۔ جب آب و ہوا بگڑتی ہے تو طبیب اور ڈاکٹروں کو دم لینے تک کی مہلت نہیں ملتی اور ہر وقت مٹھی گرم رہتی ہے۔ لیکن اچھے موسم میں وہ بھی باطمینان مطب میں بیٹھے دوستوں کی گپ یا تاش و شطرنج کا لطف اٹھاتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی مریض آگیا تو نسخہ لکھدیا ورنہ اکثر مبارک دن وہ دوستوں کے لطف صحبت ہی سے دلشاد رہتے ہیں ؛

ظاہر ہے کہ روزگار چلنے کے زمانے میں ایسے غیر مستقل ملازمت والے اتنا زیادہ کمانے کی کوشش کریں گے کہ بیکاری کا زمانہ بسر کرنے کے لیے کافی پس انداز کرسکیں۔ لہٰذا اگرچہ ایسے پیشہ وروں کی شرح اجرت زیادہ معلوم ہو لیکن درحقیقت باکاری و بیکاری کا زمانہ شمار کرنے سے ان کی اجرت کا اوسط بہت گھٹ کر معمولی شرح پر آجاتا ہے ؛

یہاں یہ نکتہ قابل توجہ ہے کہ اگر بیکاری کا زمانہ سخت محنت اور جفاکشی کے بعد پیش آئے تو اس سے صحت و تندرستی کو بیحد نفع پہنچتا ہے اور مالی آمدنی رک جانے سے جو کچھ نقصان ہوتا ہے اس کی بہت کچھ تلافی راحت اور تقویت صحت سے ہو جاتی ہے: مثلاً کامیاب بیرسٹر کو کسقدر دماغ سوزی کرنی پڑتی ہے عدالت کی تعطیل کلاں اس کی تندرستی کے حق میں اسقدر مفید ہے کہ کاروبار رک جانے سے اس کو حقیقۃً کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ اس بیکاری کے زمانے میں ماسبق کاروبار کی دماغی اور جسمانی تکان رفع ہو کر بعد تعطیل بیرسٹر تازہ دم کام شروع کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ جو صحت و راحت ایسی بیکاری میں حاصل ہوتی ہے وہ بھی اجرت صحیح کا جزو سمجھنی چاہئیے۔ اس کے برعکس اگر کاروبار کی کساد بازاری سے بیکاری مسلط ہو جائے تو ایسی حالت میں بجائے آرام و تقویت کے پریشانی کی تکلیف سے صحت کو مضرت پہنچتی ہے گویا ایسی بیکاری سے اجرت صحیح کے اوسط میں تخفیف ہو جاتی ہے ؛

بیکاری کے مذکورۂ بالا فرق کی بدولت بلاتنخواہ رخصتی ملازم اور بیکار آدمی کی حالت میں کتنا فرق نظر آتا ہے۔ ایک کے نزدیک بیکاری ضروری ہے اور دوسرے کے حق میں وبال جان ؛

۲ - پیشے کا صحت و طاقت پر اثر - اکثر کام تو ایسے ہیں کہ مزدور انکو عرصۂ دراز تک سرانجام دیسکتا ہے، لیکن بعض کاموں کا مزدور کی صحت پر اسقدر مضر اثر پڑتا ہے کہ اسکو جلد ناکارہ بنا دیتا ہے۔ تحقیق سے ثابت ہوا کہ تعداد اموات کا پیشے کی نوعیت سے بہت کچھ تعلق ہے: پادریوں میں سب سے کم پائی جاتی ہے، انکی تعداد اموات سو فرض کر کے نسبتہً تعداد اموات، کاشتکاروں میں صرف ۱۱۴؛ قانون پیشہ لوگوں میں ۱۵۲؛ شراب بنانے والوں میں ۲۴۵؛ شراب فروشوں میں ۲۷۴؛ کمہاروں میں ۳۱۴؛ اور کان کھودنے والوں میں ۳۳۱؛ انگلستان میں تخمینہ کی گئی۔ چنانچہ بیمہ کمپنیاں بھی اس واقعے کا لحاظ کر کے ایسے لوگوں کی زندگی کا بیمہ کرنے سے انکار کر دیتی ہیں جو از حد خطرناک اور مضر صحت پیشوں میں مصروف ہوتے ہیں۔ باوجود تمام احتیاطوں کے کان کنی خطرناک اور مضرت رساں ہے اور خصوصاً پارے کی کان میں کام کرنے والے مزدوروں کی صحت دو ایک ہی سال میں اسقدر تباہ ہو جاتی ہے کہ انکو زندگی کے باقی دن کاٹنے دوبھر ہو جاتے ہیں۔ سنا ہے کہ دکن میں جہاں پارہ نکلتا ہے مزدوروں سے کم و بیش دھوکے لالچ اور جبر سے کام لینا پڑتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے خطرناک، اور مخرب صحت کام لینے کے لیے مزدوروں کو اعلیٰ شرح اجرت کا لالچ دینا لازمی ہے۔ اضافۂ آمدنی کے لالچ بغیر کون خطرہ اور علالت اپنے ذمے لینا گوارا کر سکتا ہے اور جہاں مضرت کا اندیشہ اتنا قوی ہو کہ لالچ کی کشش بھی مزدور مہیا نہ کر سکے تو مجبوراً دھوکے یا جبر سے بھی کام لینا عجیب نہ ہوگا۔ اگرچہ قانون کی تیز شعاعیں ہر جگہ امن و عافیت کی روشنی پھیلا رہی ہیں، پھر بھی خدا جانے ظلم و تشدد کی تاریکی ابھی کہاں کہاں چھائی ہوئی ہے۔ ایسے معدودے چند از حد مضر صحت پیشوں کے علاوہ معمولی پیشوں میں بھی کام کا صحت پر کم و بیش مضر اثر پڑتا ہے اور شرح اجرت میں بھی اکثر اسی کے مطابق کمی بیشی ہوتی ہے ؛

جو مزدور ایک پرامن کام میں ۸ آنے روز کماتا ہے، خطرناک کام میں دس بارہ آنے روز کما سکے تو عجیب نہیں ہے۔ اور جو "زیستن برائے کار" کے قائل ہیں وہ جان پر کھیل کر آمدنی بڑھاتے ہیں ؛

۳ - مصارف پیشہ - عام مقولہ ہے کہ وکالت کا پیشہ، نمائش طلب ہے وکیل

کو کامیابی کے واسطے ظاہری ٹھاٹھ رکھنا لازمی ہے، مکان شاندار اور آراستہ ہو گھوڑا گاڑی بھی قیمتی اور نفیس ہو، عمدہ لباس سے ذاتی وجاہت بھی بڑھی چڑھی رہے، عام تعلقات وسیع ہوں، حکام اور رؤسا سے ربط ضبط بڑھا ہوا ہو، تب کہیں وکالت زور پکڑ سکتی ہے۔ ورنہ محض سادگی کی وجہ سے لوگ اس قدر بدعقیدہ ہو جاتے ہیں کہ بعض قابل سے قابل وکیلوں کے جوہر کھلنے نہیں پاتے، اور یوں کوئی لعل گودڑ میں چمک اٹھے تو وہ مستثنیٰ سمجھنا چاہئے۔ یوں تو ہر پیشے میں ذاتی وجاہت اور طریق بود و باش کا اثر پڑتا ہے، لیکن وکالت میں وہ بہت نمایاں نظر آتا ہے، طبابت کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ اسی طرح عدالتی عہدوں کے مقابلے میں انتظامی عہدہ بیش خرچ ہے، ڈپٹی کلکٹروں کو مقامی رؤسا اور معززین سے میل جول رکھنے کے لیے طریق بود و باش بھی اعلیٰ اختیار کرنا پڑتا ہے اور کھانے کھلانے میں بھی ان کا صرف ہوتا رہتا ہے۔ اسکے برعکس اگر منصف چاہے تو بیحد سادہ زندگی بسر کرے اور اسکے کام میں کوئی خلل واقع نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض مصارف محض پیشے کی مجبوری سے انسان کو برداشت کرنے پڑتے ہیں، ورنہ اسکی کوئی ضرورت ان سے حاصل نہیں ہوتی، اگر وہ اس پیشے میں شریک نہ ہوتے تو ایسے مصارف کبھی گوارا نہ کرتے۔ محض موکلوں یا مریضوں کی یا طالب علموں کی ضرورت سے وکیل، طبیب یا معلم معقول کرایے پر عمدہ موقع کے وسیع مکانات لیتے ہیں، ورنہ اگر وہ کسی دفتر میں ملازم ہوتے تو شاید اس سے ایک چوتھائی کرایے کے مکان کو اسی کے برابر اپنے واسطے آرام دہ پاتے۔ یا فرض کرو کہ کوئی شخص اپنے ملازم کو مجبور کرے کہ وہ معمول سے زیادہ صاف ستھرے کپڑے پہنے تو ایسے کل مصارف جو مزدور کو محض پیشے کی خاطر برداشت کرنے پڑیں، اور جو شریک پیشہ نہ ہونے کی صورت میں وہ گوارا نہ کرتا، اسکی اجرت سے منہا کرنے ضروری ہیں، جو کچھ باقی بچے وہی اسکی اجرت ہے۔ اسکی اجرت قبل و بعد منہائی مصارف پیشہ علی الترتیب اجرت خام اور اجرت خالص کہلائے گی۔

ص - مناسبت شوق و مذاق۔ اکثر اشخاص کو کسی نہ کسی چیز کا خاص شوق اور مذاق ہوتا ہے: کوئی لذیذ کھانے کا شوقین ہے تو کوئی نفیس لباس کا، کسی کو

گانے بجانے کی دھن ہے تو کوئی سیر و شکار پر مٹا ہوا ہے، کوئی روپے کا خواہاں ہے کوئی عزت کا طالب، اور کسی کو حکومت و اقتدار سے زیادہ کوئی چیز بھی مرغوب نہیں۔ اور بعض طبیعتوں کے خواص اس قدر قوی ہوتے ہیں کہ وہ افعال و اعمال پر حاوی ہو جاتے ہیں، گنوارو کہاوت ہے "دو چار سے دو ہی کر دے، پر نام داروغہ دھر دے" حکومت پسند طبیعتیں مالی آمدنی کی پروا کم کرتی ہیں، ڈپٹی کلکٹر جیسے انتظامی عہدوں سے ایسے مصارف وابستہ ہیں کہ آمدنی خالص بعض دیگر مساوی تنخواہ والے عہدوں سے کم ہے، اور ہر ایک شخص رشوت بھی نہیں لیتا، اس عہدے کیواسطے جو اسقدر سخت کوشش اور مقابلہ ہوتا ہے، اس کا حقیقی باعث وہ تعزز و اقتدار ہے جو اس سے وابستہ خیال کیا جاتا ہے۔ فوج کی تنخواہ نسبتہً دوسرے محکموں سے کم ہے، لیکن سپاہی منش لوگ اسی جانبازی کی ملازمت پر جان دیتے ہیں۔ سیاحت پسند لوگ ریلوے کی ملازمت سب سے بہتر سمجھتے ہیں۔ شکاریوں کو جنگلات کی نوکری بیحد پسند ہے۔ سیر و تفریح کے شائق ایسے مقامات میں رہ کر کام کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں کی آب و ہوا عمدہ ہو اور دلکش قدرتی مناظر کی کثرت ہو۔

واضح ہو کہ عام طور پر تو لوگ جہاں موقع پاتے ہیں ملازمت کر لیتے ہیں، لیکن بعض طبیعتوں پر شوق اور مذاق کا اسقدر غلبہ ہوتا ہے کہ انتخاب ملازمت میں ان کا خاص لحاظ کرنا پڑتا ہے، اور انکی خاطر مالی منفعت کی تخفیف تک گوارا کی جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کی اجرت صحیحہ میں علاوہ اجرت متعارفہ کے، وہ لطف و مسرت بھی شمار کرنا چاہیئے جو شوق پورا ہونے سے حاصل ہو اور جس کا تخمینہ زر نقد کی وہ مقدار ہے جو شخص مذکور اسکی خاطر چھوڑنے پر رضامند ہو سکے۔ گویا شوق پورا کرنے کی حالت میں خود محنت مزدور کے حق میں دولت بن کر اجرت صحیحہ کا جزو ہو جاتی ہے۔ اس واقعے کو بعنوان تشریح خدمت، مقدمے میں واضح کر چکے ہیں۔

یہاں یہ جتانا بھی ضروری ہے کہ جو کام مذاق کے خلاف ہو اور طبیعت کو گراں گزرے اسکی اجرت صحیحہ سے وہ بے لطفی اور تکلیف منہا کرنی چاہیئے جو ایسے کام کرنے سے محسوس ہو، اور جو محنت کی تکان سے بالکل جداگانہ اور مختلف

ہے؛ اور جس کا تخمینہ بھی وہ زرنقد ہے جو اس سے بچنے کے لئے مزدور چھوڑنے پر آمادہ ہوسکے۔
گویا کوئی کام جس حد تک مزدور کے مذاق کے خلاف ہوگا اس کے حق میں دولت منفی بنکر اجرت صحیحہ میں تخفیف کردیگا۔ گویا بحالت مساوات اجرت متعارفہ بے مذاق کام کرنے والے کی اجرت صحیحہ سے حسب مذاق کام کرنے والے کی اجرت زیادہ، اور خلاف مذاق کام کرنے والے کی کمتر ہوگی۔ پس مزدور اوّل کی اجرت صحیحہ مزدور سوم سے بدرجۂ اولیٰ زیادہ ہوئی:۔

مثلاً اگر کوئی شخص مجبوری سے یا اتفاق سے یا شوق سے کاشمیر یا شملہ رہ کر کام کرے تو ان تینوں حالتوں میں بمقابلۂ یکدیگر علی الترتیب اجرت صحیحہ زیادہ ہوگی، جب تکمیل شوق بھی اجرت صحیحہ کا جزو ٹھیرا تو اگر علمی مذاق کے لوگ مالی منفعت کی جستجو ترک کرکے، مناسب ضروریات پر اکتفا کریں اور مشغلۂ تعلیم و تصنیف میں شاداں و فرحاں رہیں تو کیا عجب ہے۔ چنانچہ حقیقی شاعر، ادیب، فلاسفر جیسے قوی علمی مذاق والوں نے ہمیشہ مادی دولت کو ناقابل التفات سمجھا ہے :۔

یہاں یہ بیان لطف سے خالی نہ ہوگا کہ افراد کی طرح قوم اور فرقوں کے شوق و مذاق بھی کم و بیش جداگانہ اور مخصوص ہوتے ہیں: مثلاً پٹھان، سکھ، راجپوت اور مرہٹے اب تک فوجی خدمت کے شائق ہیں۔ انتخاب ملازمت میں مسلمان بالعموم حکومت اور اختیار کا زیادہ لحاظ کرتے ہیں۔ اور اہل ہنود مقدار تنخواہ پر نظر رکھتے ہیں۔ پارسیوں کو دفتر کا کام بہت پسند ہے۔ بنگالی دماغی محنت کے بڑے مرد ہیں۔ راجپوتانے کے مارواڑی لین دین کے کام میں بے اعتدالی اور بدنامی کی حد تک مصروف اور ماہر ہیں۔ اور کاٹھیاواڑ، کچھ کے بوہرے میمن تجارت میں ایسے مگن رہتے ہیں، جیسے پانی میں مچھلی :۔

اجرت صحیحہ کے تخمینے میں جن باتوں کا لحاظ لازمی ہے، ان کی تفصیل بیان کر چکنے کے بعد اب ہم اس کے فرق کے اسباب دریافت کرنا چاہتے ہیں۔ اجرت کے اضافہ و تخفیف کے اسباب اور حدود و قوانین اجرت کی بحث میں واضح کئے جاچکے ہیں۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ مذکورۂ بالا قوانین کا مجموعی عمل بشکل قانون طلب و رسد

نمودار ہوتا ہے: بالفاظ دیگر مزدوروں کی موجودہ اور مطلوبہ تعداد کی باہمی نسبت سے ان قوانین کے مطابق اجرت میں کمی بیشی پیدا ہوتی ہے۔ قانون طلب و رسد کا اجرت کے اساسی قوانین سے تعلق بیان کرنے کے بعد، اب ہم اس کا اجرت پر اثر دریافت کرنا چاہتے ہیں؛
عام تجربہ ہے کہ اگر ایک چیز کے دو خریدار ہوں تو قیمت بڑھیگی اور اگر ایک کے خریدار کو ایسی دو چیزیں پیش کی جائیں تو قیمت گھٹ جائیگی، گویا قیمت میں اضافہ اور تخفیف علی الترتیب رسد اور طلب کی کمزوری یا بالفاظ دیگر طلب و رسد کے غلبے سے پیدا ہوتی ہے۔ یہی حال اجرت کا ہے، اگر ایک مزدور کو دو آجر بلائیں تو اجرت بڑھیگی، اور اگر ایک آجر کی طرف دو مزدور دوڑیں تو اجرت میں تخفیف ہونا یقینی ہے: گویا قیمت کی طرح اجرت بھی بلحاظ کمی و بیشی قانون طلب و رسد کے زیر عمل ہے۔
چیزیں بنانے کے واسطے محنت ناگزیر ہے، لہذا کسی چیز کی طلب میں کمی بیشی ہونے سے اس محنت کی طلب میں بھی کمی بیشی لازمی آتی ہے، جو چیز مذکور کے بنانے میں صرف ہو۔ مثلاً گھڑی، سگریٹ یا موٹر کا رواج جسقدر گھٹے بڑھے گا اسی قدر کم زیادہ انکے بنانیوالے درکار ہونگے: گویا چیزوں کی طلب سے محنت متعلقہ کی طلب محنت کی حقیقت سے وابستہ ہے۔ اوپر بیان کر چکے ہیں اب ہم رسد محنت کے اسباب دریافت کرنا چاہتے ہیں اور یہ دونوں پہلو پیش نظر ہونے کے بعد قانون طلب و رسد کا اجرت پر عملدرآمد بخوبی ذہن نشین ہو سکیگا۔ واضح ہو کہ جس طرح نہر کی جھالیں پانی کے بڑے بڑے تختے جا بجا روکے رکھتی ہیں اور صرف سطح کا پانی ان پر گزر گزر کے آگے بڑھتا رہتا ہے، بعینہٖ محنت کی آزادانہ رسد میں بھی چند زبردست بندشیں سدّ راہ ہو کر ترقی پذیر محنت کی مقدار گھٹاتی چلی جاتی ہیں؛ اگر یہ بندشیں نہ ہوتیں تو سطح آب ہر جگہ برابر ہوتی، پانی جدھر ڈھلاؤ پاتا بہنے لگتا، مزدوروں کے طبقوں میں اعلیٰ ادنیٰ کا کوئی امتیاز نہ ہوتا، رسد محنت فوراً طلب کی پیروی کرتی لیکن جبکہ متعدد بندشیں آزادانہ حرکت میں مزاحم ہوں تو پانی میں پست و بلند تختے اور مزدوروں میں اعلیٰ ادنیٰ طبقے پیدا ہو جانے لازمی ہیں، اور پانی کا بہاؤ اور محنت کی رسد بیشتر بندشوں کی حالت پر منحصر ہو جاتی ہے۔ چند قابل لحاظ رکاوٹیں جو رسد محنت میں مزاحم ہوتی ہیں حسب ذیل ہیں؛

۱۔ قدرتی مناسبت و استعداد: کہتے ہیں کہ شاعر ماں کے پیٹ سے پیدا

ہوتا ہے تعلیم سے نہیں بنتا: گویا استعداد شاعری خداداد ہوتی ہے، اکتسابی نہیں ہو سکتی۔ یہی حال کم و بیش مصوری اور موسیقی کا ہے؛ ان فنون لطیفہ میں ہر کوئی محنت اور کوشش کے زور سے کمال حاصل نہیں کر سکتا۔ خیال ہے کہ عمدہ تراش اور اعلیٰ جراحی کیواسطے بعض ہاتھ قدرتاً موزوں ہوتے ہیں، جو بچے پیدا ہوتے ہیں اُن میں صرف بعض نہایت توانا تندرست ہوتے ہیں اور بعض از حد ذکی اور تیز فہم اور باقی دونوں لحاظ سے اوسط اور ادنیٰ درجے میں شمار ہوتے ہیں: گویا مناسبت اور استعداد کی تقسیم غیر مساوی ہے۔ خود قدرت نے محنت کی رسد پر حدود قائم کر کے مزدوروں کے جدا جدا طبقے پیدا کر دئے؛ جس کام کے واسطے خداداد استعداد کی ضرورت ہے اس کے کرنے والونکی رسد قدرت کے ہاتھ میں ہے۔ الہ آباد کی مشہور نمائش میں مس گوہر سرکاری اہتمام سے بمشکل ایک گھنٹہ روز گاتی ہوگی! کئی ہزار روپے کے ٹکٹ روز فروخت ہوتے تھے، جس میں سے صرف ایک ہزار مس گوہر بطور فیس لے لیتی تھی۔ اگر مس گوہر کے مثل گانے والونکی کثرت ہوتی تو ایسی آمدنی ناممکن تھی۔ ملکۂ روس نے جب ایک مشہور گویے سے شکایت کی کہ وہ روس کے سپہ سالار اعظم کی ماہانہ تنخواہ سے بھی زیادہ روزانہ فیس وصول کرتا ہے تو اس نے کیا معقول جواب دیا کہ "پھر آپ اپنے سپہ سالار اعظم ہی سے گانا کیوں نہیں گوا لیتی ہیں میری کیا ضرورت ہے"۔ اگر محض کوشش سے مصوری میں کمال پیدا کرنا ممکن ہوتا تو مانی و بہزاد کا نام دنیا میں یوں غیر فانی نہ ہو سکتا۔ ایک ایک تصویر کی ہزار ہا روپے قیمت کیوں دی جاتی ہے؟ دستی تصاویر فوٹو کی طرح کیوں ارزاں نہیں بکتیں؟ اکثر کلونکی ایجاد نے جسمانی طاقت کی ضرورت گھٹا دی، تاہم بعض کاموں میں اب تک جسمانی طاقت خاص طور سے درکار ہے اور ایسے طاقتور مزدوروں کی قلت کی وجہ سے شرح اجرت بھی معمول سے زیادہ ہے۔ لوہا صاف کرنے اور ڈھالنے کے کارخانوں میں بعض ان پڑھ مزدور نہایت طاقت طلب کام کر کے تین سو روپے ماہوار تک کما لیتے ہیں؛ علمی کاموں میں خداداد دماغی قوت کا فرق ہر طرف نمایاں ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ اکثر

قلت رسد محنت جو اضافہ شرح اجرت کا باعث ہوتی ہے وہ قدرت کی پیدا کی ہوئی ہے ؛

ب۔ صرف و وقت اکتساب قابلیت۔ قدرت نے انسان میں جو استعداد ودیعت کی ہے اس کی حالت اُس سونے کی سی ہے جو مٹی میں ملا کان میں پڑا ہو۔ کان سے کھود کر نکالنا، مٹی سے صاف کرنا، سونے سے کام لینے کی مقدم شرطیں ہیں۔ بعینہ خدا نے انسان کو جو استعداد عطا کی ہے اسکا پتا لگانا اور تعلیم و تربیت کے ذریعے سے اس کو اصلاح اور ترقی دیکر کمال پیدا کرنا قابلیت کے واسطے لازمی ہیں۔ خواص محنت کی بحث میں ہم بالتفصیل واضح کر چکے ہیں کہ کیونکر تعلیمی مصارف اور تربیت کی دقتیں اکثر ہونہار غریب بچوں کو ان ترقیوں سے محروم کر دیتی ہیں جن کی وافر استعداد ان کی ذات میں موجود ہوتی ہے۔ بہت نہیں لیکن پھر بھی چند نیوٹن، شیکسپیر، نپولین، بسمارک اور گلیڈسٹون یورپ میں ضرور پیدا ہوئے ہوں گے ! لیکن ان میں سے ایک ایک کے سوائے باقی سب ناساعد حالات کے شکار ہو گئے۔ اس موقع پر خواص محنت کا بیان پڑھنے کی سفارش کئے بغیر نہیں رہ سکتے : گویا رسد محنت پہ ایک حد خود قدرت نے غیر مساوی تقسیم استعداد سے قائم کر دی، دوسری حد استعداد کو قابلیت بنانے کے مصارف اور دقتوں سے پیدا ہو گئی ؛

ج ۔ مذکورۂ بالا غیر اختیاری بندشوں کے علاوہ کچھ رکاوٹیں مذہب، رسم و رواج اور قانون نے بھی رسد محنت میں پیدا کر رکھی ہیں مثلاً مسلمان شراب کے کام سے جدا رہتے ہیں۔ ہندو گوشت اور چمڑے کے کاروبار میں بہت کم ہاتھ لگاتے ہیں۔ اکثر مسلمان تو بلا تکلف ہندوؤں کی بنائی ہوئی چیزیں کھاتے ہیں مگر اکثر ہندو سوائے اپنے ہم مذہب اور خصوصاً برہمن کے اور کسی کی بنائی حتیٰ کہ چھوئی ہوئی کھانے پینے کی چیز کو پاس تک نہیں آنے دیتے؛ اسی وجہ سے مسلمان حلوائیوں کی دکانیں بہت کم سرسبز ہو سکتی ہیں۔ لوہار، بڑھئی، معمار، درزی وغیرہ کے پیشے رسماً ادنیٰ خیال کئے جاتے ہیں، اگرچہ اب ان پیشوں کی اجرت

معقول ہوگئی ہے اور برابر بڑھ رہی ہے؛ لیکن اب تک رسم و رواج کے اثر سے
نادار شریف قلیل ملازمت حتیٰ کہ فاقہ کشی کو بہ پیشے اختیار کرنے پر ترجیح دیتے ہیں۔
غریب شریف دس روپے کی معلمی کو بیس روپے کی درزی گری سے ہزار درجے غنیمت
سمجھیگا۔ اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ بیکار شریفوں پر افلاس کی مصیبت چھائی ہوئی
ہے، اور پیشہ ور لوگ جن کو رذیل خیال کیا جاتا ہے روز بروز خوشحال اور مالدار
بنتے جاتے ہیں۔ شریفوں کو خاندانی محلات کی مرمت کی بھی توفیق نہیں اور پیشہ ور
نئے نئے مکانات تیار کرا رہے ہیں۔ شریف آبائی جائداد گرو رکھتے پھرتے ہیں،
پیشہ وروں میں جائداد کا شوق پھیل رہا ہے۔ اگر کچھ دنوں رسم و رواج پیشے اختیار
کرنے میں یوں ہی مزاحم رہے تو ان دونوں طبقوں کی مالی حالت میں بالکل کایا پلٹ
ہوجائیگی۔ بمقابلہ ہمسایہ قوموں کے مسلمانوں میں پیشے خاص طور سے شرافت
کے منافی خیال کئے جاتے ہیں؛ اسکی وجہ شاید گزشتہ حکومت کا خمار ہو، ورنہ
اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے ذات کے فرق مٹائے اور پیشہ وروں کا
رتبہ بڑھا کر ہر ایک کو بلا تکلف پیشہ اختیار کرنے کی ترغیب دی ۔

قانون نے رسد محنت پر ایک طرف نمایاں حد قائم کی ہے: یعنی فوج میں
سوائے سکھ، پٹھان، راجپوت، اور مرہٹے کی مثل جنگجو قوموں کے اور کوئی ہندوستانی
فرقہ بھرتی نہیں کیا جا سکتا۔ اسکے علاوہ بعض محکموں کی ملازمت کے واسطے عمر
کی بھی شرط لازمی ہے۔ چونکہ جدید کارخانوں میں جہاں ہزارہا مزدور یکجا کام
کرتے ہیں بحالت عدم نگرانی مزدوروں کی صحت و اخلاق کے خراب ہونے
حتیٰ کہ جان ضائع ہونے کا اندیشہ ہو سکتا ہے لہذا ایک **فیکٹری ایکٹ**
پاس کر کے کارخانوں کی رسد محنت پر قانونی حدود عائد کر دی گئیں: ۹ سال سے
کم عمر بچے داخل نہیں ہو سکتے، اور ۱۴ سال تک عمر والے ۶ گھنٹے روز سے زیادہ اور
رات کے وقت کام نہیں کر سکتے، عورتیں بھی صرف روئی اوٹنے کے کارخانوں
میں رات کے وقت کام کر سکتی ہیں؛ کوئی مزدور ۱۰ گھنٹے روزانہ سے زیادہ کام
نہیں کر سکتا۔ ہر ترقی یافتہ ملک میں فیکٹری مزدوروں کی خاص نگرانی کی جاتی ہے،
ورنہ آجروں کی چیرہ دستی اور مزدوروں کی ہوس کا یقینی نتیجہ تباہی ہوتا ہے ۔

حصۂ سوم
باب پانزدہم

علاوہ مذکورۂ بالا مذہبی رسوم اور قانونی حدود کے خود انسانی طبیعت اور عادات بھی رسدِ محنت میں حارج ہوتی ہیں: جراحی کا کام مکروہ مانا جاتا ہے، چنانچہ ہمارے نفاست پسند طبیعت والے اس پیشے سے ہمیشہ دستکش رہے اور یہ فن اکثر حجاموں کے ہاتھ میں چھوڑ دیا گیا۔ واقعہ ہے کہ بعض لوگ تو عمل جراحی دیکھنے تک کی تاب نہیں لا سکتے، حتی کہ بیہوش ہو جاتے ہیں۔ سنا ہے کہ ڈاکٹری مدرسوں میں جو طالب علم داخل ہوتے ہیں ان میں سے تخمیناً دس فی صدی چند ماہ میں اس وجہ سے علٰحدہ ہو جاتے ہیں کہ چیر پھاڑ کے کام سے انکی طبیعت ازحد متنفر ہوتی ہے۔ بعض لوگ اسقدر احتیاط پسند ہوتے ہیں کہ وہ کمتر اجرت پر قناعت کرکے جرأت طلب اور خطرناک کاموں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ بعض کام گندے بھی ہیں اور اسقدر آسان کہ ادنیٰ ترین مزدور جنکی تعداد ہمیشہ کثیر ہوتی ہے، انکو کر سکتے ہیں؛ ایسی محنت کی رسد ہمیشہ وافر ہوتی ہے اور شرح اجرت بھی ادنیٰ۔ چنانچہ حلال خور اور خاکروب اسی طبقے میں شامل ہیں۔

ارزانی وگرانی محنت

۹۔ ارزانی محنت کا مسئلہ جسقدر عملی لحاظ سے اہم اور قابل تحقیق ہے، اتنا ہی اصولی حیثیت سے دقیق اور پیچیدہ ہے۔ عام طور پر تو ارزانی سے مقدار اجرت کی کمی مراد لی جاتی ہے: یعنی ۴ آنے روز والے مزدور کی محنت آٹھ آنے اجرت والے سے ارزاں مانی جاتی ہے۔ لیکن درحقیقت محنت کی ارزانی کو فی نفسہٖ مقدار اجرت سے کوئی بھی تعلق نہیں۔ پھر کہا جاتا ہے کہ ارزانی نسبت پیداوار محنت اور اجرت موافقت سے متعلق ہے: مثلاً اگر ایک مزدور چار آنے روزانہ اجرت پر بارہ آنے کا کام کرے اور دوسرا آٹھ آنے پر ایک روپے چار آنے کا، تو پہلے کی پیداوار محنت اور اجرت کی نسبت بمقابلہ دوسرے کے زیادہ موافق ہے؛ لہٰذا پہلے کی محنت دوسرے سے لازماً ارزاں ہے۔ بظاہر تو یہ اصول بالکل درست نظر آتا ہے، لیکن بعض حالتوں میں یہ غلط بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ واقعہ ہے کہ امریکہ میں بمقابلہ اکثر ترقی یافتہ ممالک کے باوجودیکہ نہ صرف مقدار اجرت سب سے زیادہ بلکہ نسبت پیداوار و اجرت بھی کمتر موافق ہے، تاہم وہاں کی محنت سب سے ارزاں خیال کی جاتی ہے۔ اس معمے کا حل ارزانی کے تغیر پذیر مفہوم میں مضمر ہے۔ یاد ہوگا کہ بلحاظ کاشت وسیع و دقیق زرخیزی زمین کے دو مفہوم بیان کئے گئے تھے: بحالت اول اس سے پیداوار اور مصارف

کاشت کی موافقت مراد ہے، اور بحالت دوم مقدار پیداوار کی بیشی۔ لیعنہ ارزانی اجرت کا مفہوم بھی دو معنی رکھتا ہے: بلحاظ تعداد و مفہوم زرخیزی زمین اور ارزانی محنت میں کامل مشابہت پائی جاتی ہے، چنانچہ زرخیزی کی مذکورہ بالا بحث کا ارزانی کی مندرجہ ذیل توضیح سے مقابلہ کرنا نہ صرف مفید بلکہ باعث دلچسپی ہوگا:-

فرض کرو کہ چار مزدور ۴، ۶، ۸ اور ۱۰ آنے اجرت لیکر ۱۲، ۱۵، ۲۰ اور ۲۴ آنے قیمتی چیزیں روز تیار کریں؛ اب اگر آجر کو ایک مہینے میں ۴۵ ہزار روپے کا سامان تیار کرانا مقصود ہو تو اس کام کے واسطے قسم اوّل کے مزدور ۲۰۰۰، دوم کے ۱۶۰۰، سوم کے ۱۲۰۰ اور چہارم کے ۱۰۰۰ درکار ہونگے۔ ظاہر ہے کہ ترقی یافتہ ممالک کے تجارتی اور صنعتی مرکزوں میں لگان زمین بہت اعلیٰ ہے اور کارخانوں میں نہایت بیش بہا کلوں سے کام لیا جاتا ہے۔ فرض کرو کہ سو سو مزدوروں کی ٹولی کے واسطے ۱۵۰ روپے ماہوار تنخواہ کے نگران، ۱۰۰ روپے ماہوار کرایہ کا قطعہ اراضی اور پچاس ہزار کا اصل قائم بشکل مشین و عمارت درکار ہو، جبکہ شرح سود ۵ فیصدی اور مطالبات فرسودگی (جن کی مفصل تشریح آئندہ کرینگے) ۴ فی صدی سالانہ ہو، تو مختلف قسم کے مزدوروں سے کام لینے میں مجموعی مصارف پیدائش علاوہ قیمت پیداوار خام حسب ذیل ہونگے:-

	تعداد مزدور قسم اول ۲۰۰۰	دوم ۱۶۰۰	سوم ۱۲۰۰	چہارم ۱۰۰۰
اجرت (روپیہ)	۱۵۰۰۰	۱۸۰۰۰	۱۸۰۰۰	۱۸۷۵۰
تنخواہ نگران و لگان زمین (روپیہ)	۵۰۰۰	۴۰۰۰	۳۰۰۰	۲۵۰۰
سود اصل و مطالبات فرسودگی (")	۷۵۰۰	۶۰۰۰	۴۵۰۰	۳۷۵۰
میزان مصارف	۲۷۵۰۰	۲۸۰۰۰	۲۵۵۰۰	۲۵۰۰۰

تخمینۂ اوّل و چہارم پر غور کرنے سے واضح ہوگا کہ پسماندہ ممالک میں جہاں بیش بہا اصل سے کام نہ لیا جائے اور لگان زمین بھی اعلیٰ نہ ہو، بالفاظ دیگر مقدار سود و لگان زیادہ نہ ہو اور مصارف پیدائش کا جزو قلیل ہو، محنت کی ارزانی پیداوار و اجرت کی نسبت کی موافقت پر منحصر ہے، لیکن ترقی یافتہ ممالک میں جہاں سود اور لگان مصارف پیدائش کے قابل لحاظ اجزا ہیں محنت کی ارزانی خاص طور سے پیداوار کی بیشی سے متعلق ہے۔ اگرچہ نسبت پیداوار و اجرت مقابلۃً کمتر موافق ہو، لیکن اگر کمی موافقت حد مناسب سے تجاوز کر جائے گی تو

باوجود بیشی پیداوار ایسی محنت ارزاں نہ ہوسکیگی: چنانچہ اگر قسم چہارم کے مزدور بجائے ۸ آنے ۱۲ آنے اجرت لیکر ۲۴ آنے قیمتی چیز تیار کریں تو ان سے کام لینے پر مصارف پیدائش ۲۸۷۵.۰ روپیہ تک بڑھکر انکی محنت کو قسم اول سے بھی گراں کردینگے۔ دوسرے اور تیسرے تخمینے سے صاف ظاہر ہے کہ ہر حالت میں اجرت مختص بالعمل کی یکساں شرح سے جو مزدور اجرت مختص بالزمان جسقدر زیادہ مقدار میں حاصل کرسکیگا، اسکی محنت بھی اسی قدر ارزاں پڑیگی۔ پہلے تین تخمینوں کے ملاحظہ سے تیسرا قابل توجہ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر محنت کی مقدار پیداوار میں زیادہ فرق ہو جیسا کہ اوّل و سوم میں، تو باوجود کمتر موافقت نسبت پیداوار و اجرت، ارزانی محنت، بیشی پیداوار کی پیرو ہوگی۔ اور اگر مقدار پیداوار میں فرق کم ہو جیسا کہ اول و دوم میں تو باوجود بیشی پیداوار، ارزانی محنت، موافقت نسبت پیداوار و اجرت کے تابع ہوگی: گویا فرقِ مقدار پیداوار کی بیشی کے مطابق ارزانی محنت علی الترتیب موافقت نسبت پیداوار و اجرت اور بیشی مقدار پیداوار پر منحصر ہے۔ حاصل کلام مذکورہ بالا نتیجوں کا یہ ہے کہ پسماندہ ممالک میں شرح اجرت مختص بالعمل جسقدر ادنیٰ ہوگی محنت ارزاں ہوگی یکساں پسماندہ اور ترقی یافتہ ممالک میں مزدور اجرت مختص بالعمل کے مساوی شرح سے جسقدر زیادہ اجرت مختص بالزماں حاصل کرسکیگا اسکی محنت اسی قدر ارزاں ہوگی۔ اور خاص ترقی یافتہ ممالک میں اسی مزدور کی محنت ارزاں ہے، جو سب سے زیادہ اجرت مختص بالزماں حاصل کرے، اگرچہ حد مناسب تک شرح اجرت مختص بالعمل بمقابلہ دیگر ممالک ناموافق بھی رہو: چنانچہ یہی آخری حالت امریکہ میں پائی جاتی ہے۔ وہاں مزدور بمقابلہ دوسرے ملکوں کے زیادہ کماتا ہے اور اجرت مختص بالعمل کی شرح بھی مقابلتہً اعلیٰ ہے، لیکن پھر وہاں کی محنت سب سے ارزاں اس وجہ سے پائی جاتی ہے کہ معاشی ترقیات کی بدولت وہاں مصارف پیدائش میں سود اور لگان کا جزو بہت غالب ہے۔ اور اس غلبے کا نتیجہ ہم مندرجہ بالا تخمینے میں واضح کرچکے ہیں:۔

امریکن معاشیئین کا مقولہ کہ "سب سے اعلیٰ اجرت والی محنت سب سے ارزاں ہے" بظاہر ایک چیستاں معلوم ہوتا ہے، لیکن مذکورہ بالا بحث سے اس قول کی سچائی اور اہمیت ظاہر ہے۔ علاوہ بریں معاشی ترقیات اور کلوں کی ایجادات کا مزدور کی مالی حالت پر کیونکر مفید اثر پڑسکتا ہے، اور کس حالت میں اضافۂ اجرت آجر و مزدور کے

حصہ سوم
باب یازدہم
اضافۂ اجرت اور اس کے نتائج

حق میں برابر مفید ہو سکتا ہے، ان اہم مسئلوں کی بھی یہاں تشفی بخش توضیح ہو گئی :-

۱۰- جو معاملات شمار و اعداد میں ظہور پذیر ہو سکیں: مثلاً آبادی، اموات و پیدائش امراض، تجارت، درآمد و برآمد ان کے اعداد سے صحیح نتائج اخذ کرنا، معاشی اصول کی صحت جانچنا، انکی ترمیم و تائید کرنا، بیحد دشوار کام ہے، جو معاشیات میں ایک جداگانہ فن اعداد شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں اس فن کی تفصیلی بحث کا محل نہیں ہے، اس کیواسطے ایک جداگانہ کتاب درکار ہے، مگر اتنا جاننا کافی ہے کہ اس کام سے چند در چند شرائط متعلق ہیں جن میں سے اکثر کی پابندی اگر محال نہیں تو بیحد دشوار ضرور ہے۔ انہی دقت طلب شرائط کی بدولت یہ مقولہ صحیح ہے کہ اعداد سے ہر قسم کے حتیٰ کہ متضاد نتائج اخذ کئے جاتے ہیں جب تک شرائط لازمی کی تکمیل نہ ہو۔ اعداد کی حالت بالکل موم کی سی ہے، جس سانچے میں چاہو ڈھال دو: چنانچہ اعداد وہی ایک ہیں لیکن دو گروہ اپنے اپنے طور پر ہندوستان میں افلاس و دولتمندی کا اضافہ ثابت کرتے ہیں۔ فرق اجرت ہی کو لیجئے، طبقے طبقے کے مزدوروں کی تعداد اور انکے کاروباری وقت کا سالانہ تخمینہ کرکے انکی اجرت متعارفہ کا جداگانہ اوسط نکالنا، بعدہ زر نقد کی قوت مبادلہ اور ہر طبقے کی ضروریات کا علحدہ اندازہ کرکے اجرت صحیحہ کا پتا لگانا، یہ سب تحقیق زمانۂ ماضی و حال کے اوقات معین کے متعلق کرکے دونوں نتائج کے مقابلے سے اضافہ و تخفیف اجرت کا دریافت کرنا کیا کچھ آسان کام ہے؟ علاوہ احتیاط کے کس قدر وسعت معلومات درکار ہے۔ اور حسب ضرورت صحیح و مکمل اعداد کا ملنا آج کل کے ترقی یافتہ زمانے میں بھی کسقدر دشوار ہے۔ چونکہ پیش پا افتادہ اعداد سے بلا تامل نتائج نکالکر انکی صحت پر اعتماد کرنے سے عجیب و غریب بے بنیاد مغالطے پیدا ہونے ممکن ہیں، بطور تنبیہ عددی نتائج کی احتیاط طلبی اور مغالطہ انگیزی کی طرف اشارہ ضروری سمجھا گیا :-

کسی ملک کے مزدوروں کی مجموعی کمائی تعداد مزدوراں سے تقسیم کرکے جو اوسط اجرت فی مزدور نکالا جاتا ہے، اس سے نہ تو مزدوروں کی مالی حالت پر کچھ روشنی پڑتی ہے نہ اضافہ و تخفیف شرح اجرت ہی کا پتا چلتا ہے۔ فرض کرو کہ ایک ایک ہزار مزدوروں کے دو گروہ ہیں: اول گروہ میں ۵۰۰ کی اجرت ۱۲ روپے ماہانہ، ۴۰۰ کی ۲۵ روپے، اور ۱۰۰ کی ۴۰ روپے ماہانہ ہے۔ دوسرے گروہ میں ۵۰۰ کی آمدنی ۸ روپے، ۴۰۰ کی ۱۵، اور ۱۰۰ کی ۱۰۰ روپے ماہوار ہے۔ ظاہر ہے کہ بحیثیت مجموعی اول گروہ کی مالی حالت دوم سے بہت بہتر

ہے۔ تاہم دونوں گروہوں کا اوسط اجرت وہی ۲۰ روپے فی مزدور ہے۔ اور اگر گروہ دوم میں آخری ۱۰۰ کی اجرت ۱۱۰ روپے ہوجائے تو اوسط اور بھی زیادہ گویا ۲۱ روپے فی مزدور ہوجائیگا؛ حالانکہ مالی حالت اب بھی گروہ اول کی برتر رہیگی۔ اسی طرح فرض کرو کہ ۱۲ روپے والے مزدوروں میں سے ۳۰۰، ۲۵ والوں میں؛ اور ۲۵ والوں میں سے ۳۰۰، ۴۰ والوں میں آملیں؛ بالفاظ دیگر ۲۰۰ کی اجرت ۱۲، اور ۴۰۰ کی ۲۵، اور ۴۰۰ کی ۴۰ ہوجائے تو اوسط اجرت بڑھکر بجائے ۲۰ کے ۲۸½ روپے ہوجائیگا؛ حالانکہ شرح اجرت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا۔ مزید برآں اگر شرح اجرت ۱۰ فی صدی گھٹا دی جائے تو بھی اوسط ۲۵½ فی مزدور قائم رہیگا؛ گویا اجرت میں ۱۰ فی صدی تخفیف کے ساتھ ساتھ اوسط میں ۲۵ فی صدی اضافہ ہوگیا۔ اس کے برعکس اگر ۲۵ روپے والے مزدوروں میں سے ۳۰۰، ۱۲ روپے والوں میں آملیں تو اوسط صرف ۱۶ روپے رہ جائیگا؛ حالانکہ شرح اجرت برقرار ہے بلکہ اگر اجرت میں ۱۰ فی صدی اضافہ کردیا جائے تو بھی اوسط تقریباً ۱۸ روپے پڑیگا گویا باوجود ۱۰ فی صدی اضافۂ اجرت اوسط میں ۱۰ فی صدی تخفیف نظر آئیگی۔ ان سادہ مثالوں سے واضح ہوا کہ جب تک پوری تفصیل پیش نظر نہ ہو محض اوسط سے مزدوروں کی مالی حالت اور تبدیلی شرح اجرت کا صحیح علم ہونا محال ہے۔

اوسط اور تبدیلی شرح اجرت کی بے تعلقی سے ایک قابل لحاظ نکتہ واضح ہوتا ہے کہ اضافۂ شرح اجرت کی دو صورتیں ہیں: ایک انفرادی، جیسا کہ مثال بالا میں ۱۲ روپے والے مزدوروں کا ۲۵ روپے والوں میں یا ۲۵ والوں کا ۴۰ والوں میں آملنا۔ جہاں تک ادنیٰ سے اعلیٰ طبقے میں ترقی کرنے والے مزدوروں کا تعلق ہے، اجرت کے اضافے میں کوئی شک نہیں؛ لیکن یہ اضافہ صرف اُن کی ذات تک محدود ہے، فی نفسہ شرح اجرت میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوتا۔ طبقہ ادنیٰ کے پسماندہ اور طبقہ اعلیٰ کے سابق مزدوروں کو اس سے کوئی نفع نہیں پہنچتا۔ اضافۂ اجرت کی دوسری صورت طبقہ وار ہوتی ہے گویا مزدوروں کے کل گروہ کی اجرت میں کچھ فی صدی اضافہ ہوجاتا ہے، اور کل مزدور یکساں مستفید ہوتے ہیں۔ مثال مذکورۂ بالا میں جبکہ ۱۲ روپے والوں میں سے ۳۰۰ مزدور ۲۵ روپے والوں میں اور ۲۵ والوں میں سے ۳۰۰، ۴۰ روپے والوں میں آئیں تو اضافۂ اجرت انفرادی ہوگا لیکن اگر ۱۲ روپے والے ۵۰۰ مزدوروں کی اجرت ۲۰ روپے اور ۲۵ والے ۴۰۰ کی اجرت ۳۰ روپے

اور ۵۰ والے .. اکی اجرت ۶۵ روپے ہو جائے تو اضافہ اجرت طبقہ وار کہلائیگا - اور دونوں صورتوں میں اوسط اجرت یکساں ۲۰ روپے سے بڑھ کر ۲۸½ روپے ہو جاتا ہے ظاہر ہے کہ انفرادی اضافے کے مقابلے میں طبقہ وار اضافے کا اثر مزدوروں اور نیز ملک کی مالی حالت پر کہیں زیادہ وسیع اور گہرا پڑیگا؛ چنانچہ اضافہ شرح اجرت سے بالعموم طبقہ وار اضافہ مقصود ہوتا ہے اور اسی مفہوم میں ہم نے اوسط اور تبدیلی اجرت کی بے تعلقی اوپر واضح کی ہے؛

اضافۂ اجرت کی بلحاظ وسعت دو صورتیں، اور اس کا عام مفہوم بیان کرنے کے بعد اب ہم اس کا فائدہ اٹھانے والے مزدوروں کی حالت پر اثر دکھانا چاہتے ہیں بعض ضرورتیں قیام زندگی کے واسطے ناگزیر ہیں: مثلاً کھانا، پینا، لباس، مکان؛ بعض عمدہ کارگزاری کے واسطے لازمی ہیں: مثلاً مقوی جسم غذا، آرام دہ لباس اور آسائش افزا مکان، صحت بخش آب و ہوا، آرام لینے کی مہلت، خودداری کا احساس، ترقی کی امنگ، اور یہ سب مقدار اجرت کی کمی بیشی پر منحصر ہے - بدقسمتی سے مرفہ الحالی کی بدولت کہیں کہیں مزدوروں کی ضروریات ان بیجا تنعمات کی حد میں داخل ہو گئی ہیں جو اخلاق، صحت، اور کارگزاری سب کے حق میں کم و بیش مضر ہیں؛ یہ حالت بیشتر یورپ اور امریکہ جیسے ترقی یافتہ ممالک میں نظر آتی ہے - لیکن وہاں بھی تمام مزدوروں کی ضروریات قسم دوم تک محدود ہیں، مقابلتہً صرف چند کو رنگ رلیاں میسر ہو سکتی ہیں - ایشیا کا غریب مزدور کم و بیش ضروریات قسم اول پر قانع پایا جاتا ہے؛ لیکن مزدور کے حق میں اجرت کی تفریط افراط سے بھی زیادہ مضر ہے، اور ضروریات قسم دوم کی بہم رسانی نہ صرف مزدور بلکہ کل ملک کے حق میں بیحد مفید ہے - واضح ہو کہ ایسی ضروریات میں بہت کچھ اضافے اور ترقی کی گنجائش ہے؛ مزدور کی ضروریات قسم دوم تک محدود کرنے سے یہ غلط نتیجہ نہیں نکالنا چاہئے کہ اضافۂ اجرت پر کوئی حد بندی مقصود ہے، بلکہ یہ ظاہر کرنا مدنظر ہے کہ مذہبی، معاشرتی اور تعلیمی اثرات اور بحد مناسب قانونی پابندی سے مزدور کو برے مذاق اور بری عادات سے روکا جائے تاکہ وہ ضروریات قسم سوم کی طرف کم مائل ہو؛ اور اپنی زندگی کی ضروریات قسم اول و دوم پر قائم کرکے خود بھی جائز لطف اٹھائے اور ملک کی مرفہ الحالی میں بھی اضافہ کرے - چونکہ ہر ملک میں جماعت کثیر مزدور پیشہ ہوتی ہے، لہذا مزدوروں کی تربیت و اصلاح گویا کل آبادی سے متعلق ہے؛

اگر مزدور صرف معدودے چند ضروریات قسم اول کا عادی ہے اور انہی پر قانع ہے تو اضافۂ اجرت کا نتیجہ تخفیف محنت ہوگا: مثلاً اگر چار آنے روز اجرت اس کی کل ضروریات کے واسطے کافی ہیں اور ضروریات بڑھانے کا اس کو شوق نہ ہو تو اجرت ۸ آنے روز ہو جانے کی حالت میں وہ غالباً ہفتے میں دو تین روز کام کرنا چھوڑ دے گا؛ بلاضرورت وہ کام کیوں کرنے لگا۔ چنانچہ ہمارے ملک کے اکثر کاریگر، درزی، سنار، بڑھئی، جو تھوڑی ہی محنت سے ضرورت کے لائق کما لیتے ہیں بدشوق اور کام چور ہونے میں مشہور عالم ہیں۔ وہ دکان پر بہت کم نظر آتے ہیں اور ان سے کام بنوانے کے لئے پہرا بٹھانا لازمی ہے۔ گرم ممالک کے باشندے جن کی ضروریات مقابلتہً مختصر ہیں اور بآسانی مہیا ہو سکتی ہیں، کام سے کتراتے ہوئے پائے جاتے ہیں، اور بیشی اجرت سے وہ اکثر کمی محنت کا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر مزدور کو ضروریات قسم دوم کا چسکا لگ جائے اور ایسی ضروریات کا میدان نہایت وسیع ہے تو اضافۂ اجرت کے ساتھ ساتھ اس کو کام سے بھی زیادہ محبت ہوگی؛ اس کی کارگزاری ترقی کریگی۔ گویا ان ضروریات کا شوق، اضافہ اجرت، تکثیر محنت اور ترقی کارگزاری میں باہم سبب اور نتیجے کا دوہرا رشتہ قائم کر کے مزدور کا طرز بود و باش اعلیٰ اور اس کی زندگی کا لطف بڑھا دیگا۔ چنانچہ یورپ اور امریکا کے صناع جسقدر اپنے کام میں ماہر ہونگے اور انکی اجرت اعلیٰ ہوگی اتنی ہی وہ اپنے کام میں توجہ اور محنت کریں گے؛ تاکہ زندگی کے نئے نئے لطف جو ان کے پیش نظر ہیں اٹھا سکیں۔ قسم دوم کی ضروریات شائق مزدور کو محنت کے میدان میں اسی طرح دوڑاتی ہیں جیسے پیاسے کو دور افتادہ سرچشمہ درمیانی فاصلہ طے کرنے پر آمادہ کرتا ہے؛ اور منزل مقصود جسقدر قریب ہوتی جاتی ہے، آتش شوق تیز تر گردد کے مطابق جہد پسندی بھی بڑھتی ہے حتیٰ کہ فائز المرام ہونے پر بجائے کسل و تکان کے بوجہ مسرت کامیابی طاقت اور چستی میں اور ترقی ہو جاتی ہے۔ ان ضروریات میں گویا دوہری خوبی ہے، ان سے نہ صرف محنت کا شوق بڑھتا ہے بلکہ کارگزاری بھی ترقی کرتی ہے، اور چونکہ ان کا سلسلہ نہایت طولانی ہے، مزدور کو اسی طرح شاہراہ ترقی پر بہت دور پہنچا سکتی ہیں۔ چنانچہ مزدور کو ضروریات قسم اول پر اکتفا نہ کرنے دینے، ضروریات قسم سوم سے بچانے، اور قسم دوم کا از حد شوق پیدا کرنے کا امریکا میں خاص

اہتمام پایا جاتا ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ شرح اجرت اعلیٰ، مزدور خوشحال، محنت ارزاں اور ملک دولتمندی میں سب سے پیش پیش ہے ؛

عام مشاہدہ ہے کہ پسماندہ اور افلاس زدہ طبقوں میں بمقابلہ ترقی یافتہ اور خوشحال لوگوں کے اولاد کی ترقی ہے، اور اسباب کچھ ہی ہوں لیکن ایک معاشی وجہ یہ بھی قرین قیاس ہے کہ ان کی ضروریات زندگی اتنی مختصر اور کم خرچ ہوتی ہیں کہ باوجود بے پایاں کثرت اولاد کچھ بار نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس اعلیٰ طبقوں میں ضروریات اس قدر کثیر اور بیش خرچ ہوگئی ہیں کہ ہر عاقبت اندیش آدمی تعداد اولاد کا مسئلہ اپنے حق میں قابل توجہ خیال کرتا ہے۔ چنانچہ علاوہ دیگر وجوہ کے مصارف خاندان کے متحمل نہ ہوسکنے کا خوف بھی ترقی یافتہ ممالک میں بہت سے لوگوں کو شادی سے روکتا ہے۔ خود ہندوستان پر نظر کیجیے کہ جوں جوں مصارف زندگی بڑھ رہے ہیں بیاہ شادیوں میں بھی تاخیر زیادہ ہو رہی ہے، اول بسر اوقات کی صورت پیدا کرنا لازمی سمجھا جاتا ہے۔ اور گو اخلاقی لحاظ سے یہ فعل قابل نفرین سہی لیکن واقعہ ہے کہ مصنوعی طریق سے پیدائش کی حد بندی کر کے خوشحال لوگ ایک دو بچوں سے زیادہ اولاد پسند نہیں کرتے، اور اس لیے کہ بطریق احسن پرورش پا سکیں محدود تعداد خود اولاد کے حق میں بھی مفید خیال کرتے ہیں۔ پیدائش اولاد کے اس نمایاں فرق کا ایک اہم نتیجہ یہ ہے کہ ادنیٰ طبقوں کی اجرت بڑھنے سے ان کی کارکردگی تو بڑھتی نہیں لیکن اولاد میں جلد اس قدر اضافہ ہو جاتا ہے کہ رسد محنت کی زیادتی سے اجرت کے پھر قدیم سطح پر گر پڑنے کا اندیشہ دامنگیر رہتا ہے۔ اس کے برعکس اعلیٰ طبقوں میں بیشی اجرت سے کارکردگی میں معقول ترقی ہوتی ہے اور بمقابلۃً اولاد میں اضافہ بہت کم جس سے اجرت کا اضافہ مستقل اور دیرپا ہونے کی امید کی جا سکتی ہے ؛

ترقی کارگزاری اور اضافۂ تعداد مزدوراں کا جو اجرت پر اثر پڑتا ہے اس کی مزید توضیح خالی از منفعت نہ ہوگی۔ ارزانی محنت کی بحث میں ثابت کیا جا چکا ہے، کہ ادنیٰ کارگزاری والے مزدوروں کی بڑی جماعت سے کام لینے کے مقابلے میں اعلیٰ کارگزاری والے مزدوروں کے مختصر گروہ سے کام لینا آجر کے حق میں زیادہ مفید ہے، اگرچہ بحالت دوم اجرت مختص بالعمل کی شرح اعلیٰ تر بھی ہو۔ گویا اعلیٰ کارگزاری والے

مزدور کو ادنیٰ کے مقابلے میں اجرت مختص بالعمل بنسبتہً زیادہ ملنی بھی ممکن ہے۔ علاوہ بریں فرض کرو کہ دس مزدوروں کی جماعت میں گیارھویں کا اضافہ ہو۔ ظاہر ہے کہ محنت مختتم کی مقدار پیداوار گھٹ کر شرح اجرت میں تخفیف ضرور کریگی: چنانچہ قوانین اجرت کی بحث میں پیداآوری مختتم کے عنوان سے یہ مسئلہ بخوبی واضح کیا جا چکا ہے۔ فرض کرو کہ اجرت میں بقدر ۱/۳۰ کمی ہو، اب اگر ان ہی دس مزدوروں کی کارگزاری بڑھ کر ان کو گیارہ مزدوروں کے کام کرنے کے قابل بنا دے تو مذکورۂ بالا کمی شرح کے باوجود ان کی اجرت میں تخمیناً ۱/۱۶ اضافہ ہوگا کیونکہ اب ان میں سے ہر ایک بمقابلۂ سابق اجرت کے ۱۱/۱۰ × ۲۹/۳۰ یعنی (۳۱۹/۳۰۰) حاصل کر سکے گا۔ پس ثابت ہوا کہ ترقی کارگزاری آجر اور مزدور بالفاظ دیگر کل ملک کے حق میں بیحد مفید ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شرح اجرت کے متعلق جو آجر اور مزدوروں میں کبھی جھگڑا ہوتا ہے تو غیر جانبدار عوام اور نیز گورنمنٹ اکثر مزدوروں کی ہمدرد اور طرفدار پائی جاتی ہے ؞

باب دوازدہم

ترقیات مزدوراں

(۱) انجمن اتحاد مزدوراں (۲) بیمہ فنڈ (۳) حفظان صحت (۴) تخفیف اوقات
(۵) اضافہ اجرت (۶) اسٹرائک یا ہڑتال (۷) شرکت منافع۔

انجمن اتحاد مزدوراں

۱۔ یورپ اور امریکا میں اکثر پیشوں کے مزدوروں نے باقاعدہ اپنی اپنی اتحادی انجمنیں قائم کر رکھی ہیں جن میں ہم پیشہ مزدور جوق جوق مقررہ ماہانہ چندہ دیکر شریک ہوتے ہیں اور اتفاق عمل کے زور سے کل ممبروں کی بہبودی اور ترقی کی ہر مناسب طریق سے کوشش کرتے ہیں۔ ان انجمنوں کی ہردلعزیزی، اہمیت اور تقویت روز بروز بڑھ رہی ہے، ہر سمجھدار مزدور انکی ممبری اپنے حق میں ضروری اور مفید خیال کرنے لگا ہے۔ جرمنی اور انگلستان میں اتحادی مزدوروں کی تعداد ۲۵ اور ۲۴ لاکھ ہے، لیکن بلحاظ نسبت آبادی ایسے مزدور ڈنمارک اور سویڈن میں سب سے زیادہ ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کے مزدوروں کی انجمنیں بلحاظ کارگزاری وحسن انتظام ہمارے ملک کی تعلیم یافتہ اور اعلیٰ طبقوں کی انجمنوں سے بدرجہا افضل نظر آتی ہیں۔ انکی بار آور کوششوں سے ترقی یافتہ قوموں کے افراد کی ارادی قوت اور عملی قابلیت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے۔ مزدوروں کی اتحادی انجمنوں کے مہتمم اور نگران نہایت قابل اور کارگزار لوگ ہوتے ہیں جن میں سے بعض کو ممبری پارلیمنٹ تک کا اعزاز حاصل ہوتا ہے۔ اتفاق کی طاقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے اور جب ایسی طاقت نہایت باخبر، معاملہ فہم، اور خیر اندیش سرگروہوں کے ہاتھ میں آجائے تو اس سے کیا کچھ فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا! زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ مزدور کسی شمار قطار میں نہ تھے، اور ہوتے کیونکر! غریب، بے علم، بیشمار اور منتشر، دولتمند اور قابو یافتہ آجروں کی ایک مختصر جماعت کے ہاتھ میں کم و بیش کٹھ پتلی

بنے ہوئے تھے۔ اول تو خود ان کا افلاس، کثرت اور انتشار انکی سب سے بڑی کمزوری کا باعث تھے، علاوہ بریں ملکی قانون سازی میں انکا برائے نام بھی دخل نہ تھا۔ خود غرض اور کوتہ اندیش آجر حسب دلخواہ اپنے موافق قانون پاس کر کے اپنے اقتدار سے بے بس مزدوروں کے خلاف ناجائز فائدہ اٹھاتے رہتے تھے۔ حتیٰ کہ انگلستان میں ۱۸۲۴ء تک اسٹرائک میں مزدوروں کی کسی جماعت کا اپنے مطالبات پورا کرانے کی غرض سے بالاتفاق کام چھوڑ دینا قانوناً بڑا جرم تھا۔ اور ۱۸۷۱ء تک مزدوروں کو اتحادی انجمنیں باضابطہ قائم کرنے کا حق حاصل نہ تھا۔ لیکن مزدوروں کے دن پھرنے کا زمانہ آن پہنچا تھا اور انکی ترقی اقتضائے وقت تھی۔ معاشی ترقی اور سیاسی آزادی نے مزدوروں کی اہمیت اور ان کے حقوق پر روشنی ڈالی۔ توسیع تعلیم اور اضافۂ اجرت سے خود مزدوروں میں بیداری اور خودداری کا احساس پیدا ہو چلا۔ کچھ روز تو آجروں نے انقلاب کی روک تھام کی، لیکن کب تک! بالآخر مزدوروں نے کروٹ بدلی اور بتدریج قابو یافتہ آجروں کے تسلط سے آزاد ہونے لگے حتیٰ کہ آج ان اتحادی انجمنوں کی بدولت مزدور آجروں کے بالمقابل مثل ہم پلہ اپنے فرائض و حقوق بآزادی طے کرتے نظر آتے ہیں۔ جبتک بہت سے غریب مزدور چند دولتمند آجروں سے جدا جدا اپنا معاملہ طے کرتے رہے وہ اپنے حقوق کی نگہداشت سے تقریباً بالکل معذور رہے، اور اکثر آجر کی پیش کردہ اجرت قبول کئے بغیر انکو کوئی چارہ نہ تھا۔ اس بے بسی کا خاص باعث مندرجۂ ذیل حالات تھے:۔

ا۔ آجر تو معدودے چند تھے اور مزدوروں کی از حد کثرت تھی۔ آجر کم و بیش متحد رہ سکتے تھے لیکن مزدوروں میں برائے نام اتفاق بھی وہم و گمان سے باہر تھا، نتیجہ یہ کہ آجر کو مزدور ملنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی، بلکہ مزدور کو آجر ملنا دشوار تھا۔ ایسی حالت میں مزدور کو آجر سے اجرت کے متعلق ردو قدح کرنے کی کیا جرأت ہو سکتی تھی؟

ب۔ دولتمند آجر تو مزدور نہ ملنے کا انتظار برداشت کر سکتا تھا، لیکن غریب مزدور میں بیکار رہنے کی سکت کہاں! اگر دو روز کام نہ لگے تو فاقے کی نوبت آجائے لہذا آجر اپنے حسب مرضی اجرت دیتے اور مزدور بخوف بیکاری

اس کو غنیمت سمجھتے تھے ؛

ج ۔ جاہل مزدور کاروباری حالات سے بالکل ناواقف اور بیخبر تھے۔ آجر اضافۂ منافع کی تو ان کو کانوں کان بھی خبر نہ ہونے دیتے تھے لیکن تخفیف کا بار انکی اجرت پر ڈالنے کے واسطے ہر وقت تیار رہتے تھے ؛

مزدوروں کی اتحادی انجمنوں کے قیام سے مذکورۃ الصدر حالات میں کایا پلٹ ہو گئی ؛

ا ۔ مزدوروں میں باہمی اتفاق و اتحاد پیدا ہو گیا جس کی بدولت حسب دلخواہ شرائط پر مزدور ملنے کا موقع آجر کے ہاتھ سے نکل گیا ؛

ب ۔ مشترکہ اندوختہ سے فنڈ قائم کیا گیا، تاکہ بحالت بیکاری مزدوروں کی مالی امداد کی جائے ؛ گویا اب مزدور آجر پر دباؤ ڈالنے کے لیے بلا خوف فاقہ محنت ترک کر سکتے ہیں ؛

ج ۔ انجمنوں کے تعلیم یافتہ اور باخبر منتظمین رکھ کر کاروباری حالات پیش نظر رکھتے ہوئے مزدوروں کے حقوق کی پوری نگہداشت کرتے ہیں ؛

جن جن طریق سے اتحادی انجمنیں مزدور کی بہبودی کے واسطے کوشش کر رہی ہیں ان کی ہم ذیل میں تفصیل کرتے ہیں :۔

۲ ۔ اول تو اکثر مزدوروں کی وہی مثل ہوتی ہے کہ روز کنواں کھودنا روز پانی پینا؛ اگر کہیں کام مل گیا تو روزی ورنہ روزہ۔ ان غریبوں کے پاس اندوختہ کہاں جو آڑے وقت کام آئے، اور جو اجرت کچھ زیادہ بھی ہوئی تو یہ بیس انداز کرنا کم جانتے ہیں۔ "ہر چہ داری بخور امروز غم فردا مخور" انکا اصول زندگی نظر آتا ہے۔ چنانچہ امریکا میں بھی جہاں مقدار اجرت سب ملکوں سے زیادہ ہے مزدور اکثر خالی جیب رہتا ہے، دن بھر میں جو کچھ کماتا ہے شام تک اڑا دیتا ہے۔ ایک لحاظ سے تو یہ پیش خرچی مفید ہے کہ مزدور چیونٹی کے مانند کام سے لگا رہتا ہے، لیکن بحالت اندوختہ بیکاری کا شوق پیدا ہونا ممکن ہے بحالت حوادث زندگی اور ناموافقت زمانہ ایسے مزدوروں کی حالت نہایت ابتر اور قابل رحم ہو جانی یقینی ہے۔ لہذا انجمنوں نے یہ طریق نکالا کہ ہر ممبر مزدور سے ماہانہ چندہ لے کر ایک مشترکہ فنڈ جاری کر دیا، جس سے ہر ممبر کو جائز مشکلات میں بشرح معین مالی امداد دی جاتی ہے ؛ گویا مزدور کو اندوختے کے کل فوائد بھی بدرجۂ ادنیٰ حاصل

حصہ سوم باب دوازدہم

ہو گئے اور شوقِ بیکاری کا اندیشہ بھی رفع ہو گیا۔ انجمن گویا مزدور کے اندوختے کی امین ہے اور فنڈ ان کا مشترکہ سرمایہ جس کو جسقدر ضرورت پیش آئے بپابندی قواعد فنڈ سے لے سکتا ہے۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں انگلستان کی سو سربرآوردہ اتحادی انجمنوں نے جنکی سالانہ آمدنی ۳۱۲۵۰۰۰۰ روپے تھی اپنے ممبروں کی حسب ذیل مالی امداد کی: -

ا - خرچ کفن دفن	۱۵۶۲۵۰۰
ب - وظیفہ پیری	۳۱۲۵۰۰۰
ج - وظیفہ علالت	۳۱۲۵۰۰۰
س - تلافی حوادث مثلاً آتش زدگی فتور اعضا	۲۱۸۷۵۰۰
د - وظیفہ بیکاری غیر اختیاری	۵۰۰۰۰۰۰
میزان	۱۵۰۰۰۰۰۰

حفظانِ صحت

۳ - تجارتی اور صنعتی مرکزوں کی آب و ہوا اول تو یونہی بوجہ گنجانی آبادی و بلندی عمارات خراب ہوتی ہے، اس پر طرہ یہ کہ کارخانوں میں مزدوروں کا بیحد اژدحام ہوتا ہے، انجنوں سے بھاپ اور دھواں نکلتا ہے، بعض پیداوار خام مثلاً روئی، سن کے بیشمار باریک باریک ریشے ہوا میں بکثرت مل جاتے ہیں، چمڑے اور کاغذ کے کارخانوں میں بعض کام خاص طور پر غلیظ ہوتے ہیں، لوہے اور شیشے کے کارخانوں میں جلنے کا خوف بہت دامنگیر رہتا ہے، حدبندی نہ ہونے کی حالت میں کلوں میں پھنس کر جان ضائع ہونے کا اندیشہ رہتا ہے، کارخانے کے اندر یا اس کے محاذات میں کوڑے کچرے سے آب و ہوا خراب ہونے کا خطرہ ہو سکتا ہے، کان کنی میں تحفظ جان اور صحت کیواسطے اور بھی زیادہ اہتمام اور خاص احتیاط درکار ہے، ایسی حالت میں مزدوروں کی صحت پر جتنی توجہ صرف کی جائے کم ہے: چنانچہ اول تو خود گورنمنٹ نے فیکٹری ایکٹ کے ذریعے سے کارخانوں پر بہت کچھ اپنی نگرانی قائم کر دی ہے؛ دوسرے اتحادی انجمنیں بھی برابر دیکھ بھال رکھتی ہیں، اور جہاں کہیں اصلاح کی ضرورت نظر آتی ہے خواہ گورنمنٹ کو توجہ دلا کر یا اپنے اصرار و اسٹرائک سے آجر کو اسے پورا کرنے پر مجبور کرتی رہتی ہیں؛

تخفیف اوقات

۴ - کار برائے زیستن است، نہ کہ زیستن برائے کار۔ محنت میں افراط و تفریط

دونوں یکساں مضر اور قابل احتراز ہیں۔ آدمی کو محنت ایسے اعتدال پر قائم رکھنی چاہیئے کہ اس کو کل جائز ضرریات حاصل ہوسکیں، نہ تنگدستی میں گرفتار ہو اور نہ دولت کمانے کی کل بن جائے؛ ان دونوں حالتوں میں زندگی کا مقصد فوت ہوجاتا ہے۔ پیشے کے علاوہ راحت، آسائش، سیر و تفریح، کنبے کی مسرت بخش صحبت اور دوست واحباب کی ملاقات کا لطف، ملکی اور قومی معاملات ضروری کی شرکت، اس قسم کے اور کام بھی حسب حال مزدور کی توجہ کے طالب ہیں۔ علاوہ ازیں خود قدرت نے مقدار محنت پر حد لگادی ہے، کچھ دیر کام کرنے کے بعد آدمی تھکنے لگتا ہے حتیٰ کہ تکان اس کو بالکل معذور کرکے آرام لینے پر مجبور کردیتی ہے۔ اگر مزدور کچھ عرصے تک ہدایت قدرت کی خلاف ورزی کرے تو صحت کو صدمہ پہنچنے کے علاوہ اسکی کارکردگی میں بھی تخفیف ہوجانی یقینی ہے۔ گنوارو مثل ہے "رات بھر پیسا اور چپنی میں اٹھانا" جو لوگ جس قدر حد سے زیادہ محنت کرتے ہیں اسی قدر ان کی محنت کے نتائج بمقدار کمتر پیدا ہوتے ہیں: چنانچہ واقعہ ہے کہ بعض طالب علموں کے فیل ہوجانے کی وجہ زیادہ مطالعہ ہوتا ہے جو دماغ کو کند بلکہ معطل کردیتا ہے۔ اور جب از حد محنت، صحت و کارگزاری کے حق میں مضر ثابت ہوئی تو اس سے اجرت میں تخفیف ہونی بھی ظاہر ہے گویا کثرت سے خود محنت کی غرض وغایت فوت ہوجاتی ہے ؛

پہلا اول تو فرصت فی نفسہٖ بہت ضروری اور مفید ہے، اگر تخفیف اوقات سے اجرت میں ناقابل برداشت کمی نہ ہو تو اس کو ضرور حاصل کرنا چاہیئے۔ علاوہ بریں اسکا کارگزاری پر جو مفید اثر پڑیگا وہ ایک حد تک ضرور اجرت کو گھٹنے سے روکیگا، اور تخفیف اوقات سے اجرت میں اتنی کمی نہ ہوگی جتنا کہ اندیشہ ہے۔ اور اگر سطح کارگزاری بہت اعلیٰ ہو اور نہایت مکمل کلوں کا استعمال وسیع پیمانے پر جاری ہو تو باوجود تخفیف اوقات دوسرے مزدوروں سے زیادہ اجرت حاصل کرنی ممکن ہے: چنانچہ واقعہ ہے کہ امریکا اور انگلستان میں اوقات کار سب سے کم ہیں، لیکن بوجوہ بالا یہاں کے مزدور کو تقریباً سب سے زیادہ اجرت ملتی ہے اور ملک کی پیداوار بھی دوسرے ملکوں سے بڑھی ہوئی ہے ؛

بحث بالا سے واضح ہوا کہ تخفیفِ اوقات کی گنجائش اور اس کا اجرت پر اثر

چند دیگر حالات پر منحصر ہے جن کو مختصراً معاشی ترقی سے تعبیر کر سکتے ہیں وہ "تلوں ہی میں سے تیل نکلتا ہے" آجر اپنی گرہ سے تو مزدور کو اجرت دینے سے رہا، نقصان اٹھا کر وہ چند ماہ بھی کاروبار جاری نہیں رکھ سکتا؛ لہٰذا تخفیف اوقات کے ساتھ سابق اجرت کا بھی مطالبہ کرنا بہر حال بیجا نہ ہوگا۔ اگر ترقی کارگزاری کی بدولت محنت کی سابق پیداوار بحال رہے تو آجر کو سابق اجرت دینے میں غالباً کوئی عذر نہ ہوگا اور نہ ہونا چاہیئے؛ اور اگر پیداوار میں کمی آگئی تو آجر اجرت میں تخفیف کرنے پر مجبور ہوگا لیکن واضح ہو کہ اگر آجر کی مقدار منافع غیر معمولی طور پر زیادہ ہو تو آخری صورت میں بھی سابق اجرت ملنی ممکن ہے: گویا آجر اپنے منافع کا ایک حصہ مزدوروں کو بانٹ دینا بمقابلہ ان کو جدا کرنے کے گوارا کریگا اور گو مقدار اجرت وہی برقرار ہے لیکن تخفیف اوقات کی بدولت شرح اجرت میں اضافہ ہو جائیگا۔ تخفیف اوقات کا ایک مشابہ بیکار مزدوروں کو کام سے لگانا بھی قرار دیا جاتا ہے، گویا یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ پیداوار محنت میں کمی آجائیگی۔ پس اگر سوائے چند قابل استثنا حالتوں کے مقدار اجرت بھی کچھ کم ہو جائے تو کیا عجب ہے! لیکن باوجود تقلیل مقدار شرح اجرت وہی برقرار رہیگی۔ حاصل کلام یہ کہ چند در چند معقول وجوہ سے اکثر تخفیف اوقات ضروری اور مفید معلوم ہوتی ہے۔ شرح اجرت میں تخفیف ہونے کی تو کوئی وجہ نہیں، البتہ اگر مقدار اجرت حسب سابق برقرار رہے تو کیا کہنا ورنہ قابل برداشت کمی کا بھی مضائقہ نہیں۔

اوقات کار کا تعین آجر اور مزدور کی باہمی رضامندی پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ آجر کا تو اسی میں فائدہ ہے کہ مزدور جہاں تک ممکن ہو زیادہ دیر تک کام کرے، کیونکہ جسقدر زیادہ مال تیار ہوگا عمارت اور کل جیسے اصل مستقر پر زیادہ سود حاصل ہوگا۔ رہا مزدور سو اول تو وہ اتنا مآل اندیش نہیں کہ اجرت کے لالچ پر غالب آسکے؛ دوسرے اس کا بس کیا چل سکتا ہے۔ کارخانوں میں کام کرنے کی شرط یہ ہے کہ مزدور ٹھیک وقت پر سیٹی سنتے ہی آئے اور سیٹی سن کر جائے؛ ہر ایک کا کام باقی بیشمار مزدوروں کے کام سے اسقدر وابستہ ہے کہ وہ تنہا حسب مرضی کام شروع اور ترک نہیں کر سکتا۔ ایسی حالت میں اوقات کا از حد طویل ہونا کیا تعجب ہے! چنانچہ اس معاملے کی اہمیت دیکھ کر اول تو خود گورنمنٹ نے بذریعۂ قانون اوقات کی انتہا معین کر دی، علاوہ ازیں اتحادی انجمنیں بھی حسب ضرورت تخفیف کا مطالبہ کرتی رہتی ہیں۔ ہندوستان میں اوقات کار ۱۲ گھنٹے، انگلستان میں

۹ گھنٹے اور امریکا میں صرف ۸ گھنٹے ہیں۔ آٹھ گھنٹے محنت، ۸ گھنٹے خواب اور ۸ گھنٹے فرصت بہترین تقسیم اوقات قرار دی جاتی ہے، اور ہر ملک میں اب یہی نظام الاوقات رائج ہو رہا ہے۔ واضح ہو کہ بیش بہا اصل مستقر کی بیکاری سے آجروں کو نقصان پہنچنے کا بھی کوئی اندیشہ نہیں اب وہ بجائے مزدوروں کے ایک گروہ کے دوسرے یکے بعد دیگرے کام لیکر بمقابلۂ سابق اور بھی زیادہ دیر تک روزانہ کاروبار جاری رکھ سکتے ہیں اور اضافۂ پیداوار کے ذریعے سے اصل مستقر بشرح اعلیٰ سود حاصل کر سکتے ہیں۔

اضافہ اجرت ۵۔ کامیاب اور سرسبز کارخانوں کے مزدور یہ دیکھکر کہ آجر بہت زیادہ منافع پا رہا ہے اور انکی اجرت نسبتہً کم ہے، اسٹرائک کی دھمکی اور دباؤ سے اضافۂ اجرت کا مطالبہ کرتے رہتے ہیں۔ اب اگر آجر کے کارخانے میں کوئی اشد ضروری کام ہو رہا ہو، جس کو وہ ترک یا ملتوی نہ کر سکے، اور بوجہ غلبۂ انجمن اتحاد یا تخصیص طلبی محنت جدید مزدور میسر نہ آسکیں تو وہ بے بس اور ناچار ہو کر اضافۂ اجرت بشرطیکہ اس کے حق میں سراسر تباہ کن اور ناقابل برداشت نہ ہو گوارا کرلے گا، لیکن مزدوروں کی فوری کامیابی کچھ بڑی بات نہیں۔ تحقیق طلب بات تو یہ ہے کہ ایسے اضافے کے بعید اور دیرپا نتائج کیا ہوں گے، وہ حسب حال تین ہو سکتے ہیں:۔ اوّل اگر آجر درحقیقت معمول سے زیادہ منافع پا رہا تھا اگرچہ آجکل آزادانہ مقابلے کے زمانے میں ایسا ہونا نہایت نادر الوجود حالات میں ممکن ہے جنکی اجارے کے عنوان سے ہم آئندہ تشریح کرینگے، تو وہ کاروبار بند کرنے پر منافع کا ایک حصہ بشکل اضافۂ اجرت مزدوروں کو بانٹ دینا گوارا کریگا۔ اضافۂ اجرت کی یہ سب سے زیادہ قابل اطمینان صورت ہے، لیکن اتنی ہی نایاب بھی ہے۔ آجکل تمام آجر ہر طرف نظر دوڑاتے رہتے ہیں، اور اگر کسی کو معمول سے زیادہ منافع ملتا دیکھتے ہیں تو خود بھی اسمیں حصہ بٹانے کی فکر کرتے ہیں، اور بالآخر مقابلے کے اثر سے آخر الذکر آجر کا منافع بھی معمولی سطح پر اُتر آتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آجر معمولی منافع پا رہا ہے تو اضافۂ اجرت کا کیا حشر ہوگا؟ اول آجر اپنی چیز کی قیمت بڑھانے کی کوشش کریگا تاکہ اضافۂ قیمت سے اضافۂ اجرت کی تلافی ہو سکے۔ لیکن ایسا ہونا بھی خاص حالتوں میں ممکن ہے، جن کی بعنوان طلب بالواسطہ ہم آئندہ تفصیل کرینگے۔ فرض کرو کہ قیمت بڑھ جائے تو گویا اضافۂ اجرت چیزوں کے خریداروں کی جیب سے ادا ہوگا، لیکن اگر نہ آجر کا منافع غیر معمولی طور پر

اعلیٰ ہو نہ اضافۂ قیمت ممکن تو آجر موجودہ کام جس طرح سے بھی ہو ختم کرا کے اور غالباً آئندہ
جلد سے جلد کارخانہ بند کر کے کوئی اور کاروبار جاری کر دیگا۔ چونکہ بیش مقدار اصل مستقر کلوں
اور عمارت میں پھنسا ہوا ہے ممکن ہے کہ موجودہ کاروبار بند کرنے میں اس کو کچھ دقت پڑے
لیکن اگر حالات ایسے ہی نامساعد رہے تو جلد سے جلد بند ضرور کر دیگا۔ اور اگر موجودہ کلوں
میں تھوڑی تبدیلی کرنے سے دوسرا کام لیا جانا ممکن ہوا جیسا کہ اکثر ہوتا ہے تو موجودہ
کام ترک کرنے میں اس کو اور بھی کم دیر لگے گی۔ علاوہ ازیں اور لوگ جو یہی کام جاری کرنے کا
قصد کر رہے تھے حالات دیکھ کر اپنی رائے بدل دینگے، اور کوئی دوسرا کام شروع کرینگے۔ اس طرح
پر بتدریج کاروبار زیر بحث گھٹتا چلا جائیگا؛ اور اس چند روزہ اضافۂ اجرت کا نتیجہ
مزدوروں کی تباہی ہوگا۔ اگر کاروبار کی تباہی سے قبل مزدور رنگ بدلتا دیکھ کر اضافے کا
مطالبہ ترک بھی کر دیں تو بھی آجروں کے دل میں جو اندیشہ اور وحشت پیدا ہو چکی ہوگی وہ بدقت
اور بدیر رفع ہوگی؛ اور مزدوروں کو کاروبار کے زوال سے کم و بیش نقصان ضرور اٹھانا پڑے گا۔

بحث بالا سے یہ نتیجہ نکلتا معلوم ہوتا ہے کہ مزدوروں کی طرف سے اضافۂ اجرت کا
مطالبہ اکثر بیجا اور ناکامیاب ہوتا ہے؛ اور اس سے خود انکو بمقابلۂ نفع کے نقصان پہنچنے کا
اندیشہ زیادہ قوی ہے۔ یہاں یہ نکتہ سمجھنا ضروری ہے کہ بحث بالا میں صرف کسی ایک
خاص شعبۂ صنعت و حرفت میں اضافۂ اجرت فرض کیا گیا ہے؛ اور ایسی حالت میں
اضافۂ اجرت کے بیشک وہی نتائج ہونگے جو بیان کئے گئے۔ لیکن جیسا کہ رواج بڑھ رہا ہے
اگر ہر پیشہ و حرفہ والے اضافے کا مطالبہ شروع کر دیں تو قوانین اجرت کے تحت میں
مذکورۃ الصدر پیداوار مختتم کی بحث اور آئندہ منافع خالص کی تشریح سے یہ سمجھنا دشوار نہ ہوگا
کہ ابھی تک منافع خالص ہی میں سے کم و بیش اجرت کا اضافہ ممکن بھی ہے اور قرین انصاف
و مصلحت بھی۔ نیز واضح ہو کہ معمول شرح اور مقدار شرح دو جداگانہ چیزیں ہیں: معمول سے
مراد شرح کی مساوات ہے؛ اور مقدار سے مراد شرح کی زیادتی و کمی۔ پس جبکہ ہر صنعت و
حرفت میں اضافۂ اجرت کا یکساں مطالبہ ہوگا تو بحالت مقابلہ شرح منافع اب بھی معمولی
رہیگی؛ صرف مقدار میں ہموار تخفیف ہو جاویگی اور منافع میں ایک حد تک ابھی ایسی تخفیف
کی گنجائش ضرور موجود ہے۔ مختصر یہ کہ اگر مزدور آجر کے منافع میں سے کچھ حصہ مانگیں تو بحالت
موجودہ بیجا نہیں؛ اور اگر مطالبے میں سب متفق ہو سکیں تو کامیابی زیادہ دشوار نہیں۔

باب دوازدہم شرح

چنانچہ واقعات شاہد ہیں کہ جب سے بشکل اسٹرائک مطالبۂ اضافہ کا رواج پھیلا، شرح اجرت بتدریج بڑھ رہی ہے۔ اسٹرائک کا مسئلہ فی نفسہٖ اسقدر توجہ طلب ہے کہ ہم اس سے ذیل میں جداگانہ بحث کرتے ہیں:۔

اسٹرائک یا ہڑتال

۶۔ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، ہڑتال سے مراد مزدوروں کی کسی جماعت کا آجر پر دباؤ ڈال کر اپنے مطالبات پورے کرانے کی غرض سے بالاتفاق کام ترک کرنا ہے۔ جب سے اتحادی انجمنوں نے مزدوروں کا اتفاق وسیع اور مستحکم کر دیا ہے ہڑتال کا اثر بھی بڑھ گیا ہے۔ جب کسی کارخانے کے مزدور کام چھوڑ بیٹھیں تو ان کے جانشین ملنے بہت دشوار ہوتے ہیں، حتیٰ کہ جو مزدور اتحادی انجمن کے ممبر بھی نہ ہوں وہ بھی اپنے ہم پیشوں کے اخلاقی دباؤ اور ناراضی کے خوف سے ایسے کارخانے میں کام کرنیکی جرأت کم کرتے ہیں؛ اور اگر ایسے موقع پر فائدہ اٹھاتے ہیں تو بعد کو جلد ہی باقی ہم پیشہ انکی حالت طرح طرح سے ناقابل برداشت حد تک ناخوشگوار بنا کر آئندہ کے واسطے عبرت دلا دیتے ہیں۔ مزدور موقع دیکھ کر اکثر ایسے وقت پر ہڑتال کرتے ہیں کہ آجر کا بہت زیادہ نقصان ہو، تاکہ دباؤ خوب پڑے اور آجر کو مزدوروں کے مطالبات پورے کرنے کے سوائے کوئی چارہ نہ ہو۔ لیکن واضح ہو کہ کاروباری دنیا میں اسٹرائک کی حالت بعینہٖ اس پتھر کی سی ہے جو تالاب میں کہیں گر کر پانی کی کل سطح پر قطار در قطار لہریں پھیلا دے۔ یوں تو تمام پیشے کم و بیش ایک دوسرے سے متعلق ہیں لیکن بعض کا بالخصوص دوسروں سے نہایت قریبی تعلق پایا جاتا ہے: مثلاً کوئلا یا مٹی کا تیل نکالنے والے، یا ریلوے اور جہازوں پر کام کرنے والے، اگر ہڑتال کر دیں تو ناممکن ہے کہ کوئی کاروبار اور کوئی پیشہ کم و بیش اس سے متاثر نہ ہو؛ ایسے اسٹرائک سے علاوہ آجر کے عوام کو بھی کسی نہ کسی پہلو سے نقصان اور تکلیف پہنچتی ہے۔ لیکن بعض نے یہ بھی ثابت کرنیکی کوشش کی ہے کہ خود مزدوروں کو ہڑتال سے جسقدر مالی نقصان پہنچتا ہے بحالت اضافۂ اجرت بھی اس کی تلافی ہونی دشوار ہے؛ اور مزید نفع کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ اس واقعے کی یوں تشریح کی جاتی ہے، گو ایسا کمتر ممکن ہے، لیکن فرض کرو کہ مزدور برابر کام سے لگا رہتا ہے، اور اس کے کام کا اوسط ۵۰ ہفتے فی سال ہے: گویا ایک ہفتہ سال کے ۱/۵۰ یا ۲ ہفتے کے برابر ہے، اور علیٰ ہذا ایک ہفتے کی اجرت بھی کل سالانہ مقدار اجرت کی

۲ فی صدی ہے۔ اب اگر چار فی صدی اضافۂ اجرت کی ہڑتال دو ہفتے جاری رہے تو صاف ظاہر ہے کہ ہڑتال کے دوران میں مزدوروں کا بقدر ۴ فی صدی سالانہ اجرت نقصان ہوچکے گا، اور ۴ فی صدی زیادہ جدید شرح اجرت سے بھی کہیں سال بھر میں اس نقصان کی تلافی ہوسکے گی۔ اسی طرح پر اگر ۲ فی صدی اضافۂ اجرت کی ہڑتال ایک ماہ جاری رہے تو ایک سال تک مزدوروں کو اضافے سے کوئی نفع حاصل نہ ہوسکیگا اور اغلب یہ ہے کہ مزدوروں کی کثرت اور مقابلے کی بدولت شرح اجرت جلد گر کر سابق سطح پر آ رہیگی؛ اور اضافہ بطور دفع الوقتی چند روزہ ثابت ہوگا۔ گو ہڑتال حسب دلخواہ کامیاب بھی ہوجائے تب بھی مزدوروں کو بمقابلہ نفع کے نقصان پہنچنے کا اندیشہ قوی ہے؛ اور اگر ہڑتال کی کثیر الوقوع ناکامیابیاں اور کاروبار کے دوسرے شعبوں کا نقصان بھی پیش نظر رکھا جائے تو بحیثیت مجموعی مزدوروں اور عوام کو اسٹرائک سے سوائے مالی نقصان کے کچھ نفع حاصل نہیں ہوتا۔ واضح ہو کہ اس بحث میں بھی یہ فرض کیا گیا ہے کہ مزدوروں کی ایک مختصر سی جماعت کسی خاص شعبے میں ہڑتال کرتی ہے، ایسی حالت میں تو بیشک اضافہ محض چند روزہ ہوگا، لیکن جبکہ ہر شعبے کے مزدور اضافے کا مطالبہ کریں تو شرح اجرت کا سابق سطح تک دوبارہ اترنا دشوار ہوگا اور اضافۂ اجرت ضرور دیرپا بلکہ مستقل ہوگا۔ اور چونکہ عام بیداری اور اتحادی انجمنوں کی بدولت مزدوروں کے تقریباً کل طبقوں میں مطالبۂ اضافہ کا خیال پیدا ہو رہا ہے، نتیجۂ آخر الذکر زیادہ قرین وقوع ہے:۔

گو اکثر حالتوں میں آجروں کے موجودہ منافع میں تخفیف کر کے، اور بعض صورتوں میں قیمت مصنوعات زیادہ کر کے اجرت بڑھانے کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، لیکن اسکی بھی ایک حد ہے؛ یہ کیونکر ممکن ہے کہ مزدور ہڑتال کر کے حسب دلخواہ اضافہ کراتے رہیں؟ اگر مطالبات حد مناسب سے تجاوز کریں تو نتیجہ یقیناً کاروبار کی تباہی اور آجر اور مزدوروں کی بربادی ہوگا؛ اگر مزدوروں سے کبھی ایسی غلطی سرزد ہوگی تو تجربہ جلد اسکی اصلاح اور آئندہ کے واسطے تنبیہ کردے گا۔ رہا نقصان و تکلیف جو عوام کو ہڑتال سے پہنچتی ہے، اس کے بیجا ہونے میں کلام نہیں، لیکن آجر اور مزدوروں میں جو فریق برسر حق ہے وہ بری الذمہ ہے؛ اور اس کا الزام فریق ثانی کے سر رہنا چاہیئے جو گویا

ہڑتال کا اصلی باعث ہے۔ گو بعض کا خیال اس کے برعکس ہے، لیکن انسانی فطرت، قدیم تجربے، اور نیز موجودہ حالات پر نظر کرتے ہوئے یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ ہڑتال کے دباؤ بغیر بھی آجر بخوشی اجرت میں اتنا اضافہ گوارا کرتے جتنا کہ مزدوروں نے لڑ جھگڑ کے کرا لیا ہے، اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ شرح اجرت معاشی قوانین کے تابع ہے، لیکن مزدوروں کی کثرت، تہیدستی، کم علمی، قدیم رسم و رواج آجر کا اقتدار، اس قسم کے مخالف حالات ان کے آزادانہ عملدرآمد کے مانع ہوتے رہتے ہیں۔ قدیم زمانے میں اور پسماندہ ممالک میں اب تک بھی رو و رعایت اور مروت کا رواج پایا جاتا ہے، لیکن ترقی یافتہ ممالک میں جائز سے جائز حقوق کے واسطے پُرزور مطالبہ شرط ہے؛ حتیٰ کہ اکثر مطالبے کی قوت اور کمزوری کے مطابق حق کا جواز و عدم جواز قرار پاتا ہے۔ پھر بھی اکثر ہڑتال عوام کے حق میں بیحد نقصان اور تکلیف کا باعث ہوتا ہے، اور جب تک حصول مطالبات کی دوسری کل تدابیر ناکام ثابت نہ ہو چکیں، مزدوروں کو یہ خوفناک آلہ استعمال نہ کرنا چاہئے۔ مزدوروں کا اعتدال اور آجروں کی فراخ دلی ہڑتال کو بہت کچھ روک سکتی ہے؛ اگر اجرت میں اضافہ کرانا منظور ہو تو بجائے ہڑتال کے یہ معاملہ مزدوروں کے نمائندوں اور آجر کے روبرو پیش ہو کر باہمی پنچایت کے تصفیئے سے طے ہونا ہزار درجے بہتر ہوگا۔ اور اب بھی یہی طریق رواج پا رہا ہے ؛

شرکت منافع

۷۔ بطریق موجودہ آجر اور مزدوروں کے مفاد میں مخالفت نظر آتی ہے، منافع اور اجرت سے کسی ایک کی بیشی، دوسرے کی کمی کا باعث معلوم ہوتی ہے؛ لیکن آپس کے سب شبہات اور جھگڑے مٹ جائیں؛ اگر جس طرح اجرت کی شرح معین ہے آجر بھی اپنے منافع کی مناسب شرح مقرر کر لیں۔ اور اجرت و منافع منہا کرنے کے بعد اگر کچھ باقی بچے تو آجر و مزدور اس کو آپس میں بانٹ لیں، پھر مزدور کو آجر سے کوئی شکایت بھی نہ رہے؛ کاروبار کی کامیابی کے واسطے مزدور دل لگا کر کوشش کریں اور آجر و مزدور کو برابر نفع پہنچے ؛ چنانچہ بعض معاملہ فہم اور روشن خیال کارخانے شرکت منافع کا طریق جاری کر کے نمایاں کامیابی اور سرسبزی حاصل کر رہے ہیں۔ اور امید ہے کہ شرکت منافع کے رواج سے اسٹرائک کا

وبال دفع ہوجائیگا، اور کاروبار زیادہ ترقی کرے گا، اور مزدور بھی زیادہ خوشحال ہوجائیں گے۔ اعتراض کیا جاتا ہے کہ شرکت نقصان بھی شرکت منافع کا لازمی جزو ہونا چاہیئے اور اگر منافع کی شرح معین میں کمی پڑے تو وہ کمی نہ صرف آجر بلکہ مزدور کو بھی حصہ رسد برداشت کرنی چاہیئے؛ ورنہ مزدوروں کی وہی مثل ہوگی کہ "میٹھا میٹھا ہپ اور کڑوا کڑوا تھو"۔ لیکن مزدوروں کو تو اجرت منافع حاصل ہونے سے قبل ہی مل چکتی ہے، پھر شرکت نقصان کیونکر ممکن ہے۔ واضح ہو کہ اول تو منافع میں سال بسال بڑے بڑے تغیرات نہیں ہوتے، دوسرے صاف ظاہر ہے کہ اگر منافع میں مستقل کمی پیدا ہوجائے تو اجرت پر بھی ضرور ناموافق اثر پڑیگا، اور نقصان کا بار مزدور کو بھی خواہ مخواہ برداشت کرنا ہوگا ؛

ترقیات مزدوراں کی ایک خاص صورت آئندہ بعنوان امداد باہمی جداگانہ باب میں مذکور ہے ؛

باب سیزدہم

سود

(۱) اصل کا مفہوم (۲) شغل اصل (۳) مسائل سود (۴) توقع پسندی (۵) پیدآوری (۶) شرح سود (۷) اقسام سود (۸) زر و سود کا تعلق (۹) سود کا حاضر و مستقبل۔

۱۔ پیدائش اصل کے تاریخی حال۔ افزونی اصل کے اسباب اور فرق دولت واصل کا اصل کی بحث میں اصل کا سیدھا سادہ مفہوم اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اسی مفہوم کی مفہوم ہم یہاں مزید تشریح کرنا چاہتے ہیں:۔

اصل کے معنوں کا اختلاف اس کے استعمال کی تاریخ میں مضمر ہے۔ اول اول اصل سے مراد وہ رقم تھی جو سود پر قرض دی جاتی تھی۔ چونکہ مذہب عیسوی کے مطابق سود پر روپیہ چلانا حرام اور قانوناً ممنوع تھا، طرح طرح پر لین دین کی ظاہری شکل بدلنے کی کوشش کی گئی، تاکہ مذہبی گرفت اور قانونی سزا سے امان ملے: مثلاً براہ راست قرض دینے کے بجائے یہ طویل طریقہ ایجاد کیا گیا کہ کوئی چیز قرضخواہ کے ہاتھ ادھار فروخت کی اور بعدہٗ پہلے سے مقرر کی ہوئی کم قیمت پر اس سے واپس خرید لی۔ گویا قرض بشکل قیمت نقد دے کر اصل مع سود بشکل قیمت ادھار وصول کر دیا جاتا تھا۔ علاوہ بریں جو چیزیں عاریۃً دی جاتی تھیں انکی ٹوٹ پھوٹ اور فرسودگی کے بہانے سے کچھ مزید معاوضہ لیا جانا شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ اصل کے معنی میں بھی توسیع شروع ہوئی اور زر نقد کے علاوہ دیگر اشیاء و سامان بھی اصل میں شمار ہونے لگا۔ اسوقت تک اصل کی امتیازی خصوصیت یہی مزید معاوضے کی آمد تھی: گویا اصل سے مراد دولت کا وہ حصہ تھا جو مستعار دیا جائے اور جس سے کچھ آمدنی غیر مکتسب بطور

باب سیزدہم سود حاصل ہونا

واضح ہو کہ اس دور اول میں صرف حاجتمند لوگ اپنی احتیاجات رفع کرنے کی غرض سے زر نقد یا سامان قرض لیتے تھے، کاروباری اغراض سے اصل قرض لینے کا رواج ابھی جاری نہیں ہوا تھا؛ اور نہ کم قیمت اور سیدھے سادے آلات سے بڑھ کر اصل کو صنعت و حرفت میں کچھ دخل تھا۔

صاف ظاہر ہے، جیسا کہ ارسطو کا قول ہے کہ "زر نقد انڈے بچے نہیں دیتا" علی ہذا سرمایۂ اشیاء بھی رکھے رکھے خود بخود نہیں بڑھ سکتا۔ البتہ اصل سے اس طور پر کام لینا ممکن ہے کہ مزید دولت پیدا ہو سکے۔ اور اگر اصل سے مزید دولت پیدا کرنے کا کام نہ لیا جاتا تو کیونکر ممکن تھا کہ ہر ملک میں صدیوں اصل بھی بڑھتا اور سود بھی ادا ہوتا رہتا۔ اگر اصل مثل دولت محض احتیاجات رفع کرنے میں کام آتا تو افزونی کا تو ذکر کیا گنج قارون بھی چند روز میں ختم ہو جاتا اور حاجتمند قرضداروں کو سود ادا کرنا محال تھا؛ چنانچہ اصل پیدائش دولت کا ایک عامل شمار کیا گیا ہے، اور اس کی کارگزاری ہر طرف صنعت و حرفت میں اظہر من الشمس ہے۔ اصل کی پیدآوری کے متعلق ہم اس سے قبل بھی کافی بحث کر چکے ہیں؛ یہاں اس کے اعادے سے یہ بتانا مقصود تھا کہ اصل کے سابق مفہوم میں کیونکر تغیر ہوا اور مل کے زمانے میں اصل سے دولت کا وہ حصہ مراد لیا گیا کہ جو آئندہ مزید دولت پیدا کرنے کی غرض سے پس انداز کیا جائے۔ اور یہ آمدنی غیر مکتسب کے بجائے پیدائش دولت اصل کی خصوصیت امتیازی قرار پائی، اور پیدآوری کا خیال اصل کے معنی میں جذب ہو گیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جبکہ فوری احتیاجات رفع کرنے کے بجائے تجارت اور کارخانے چلانے کی غرض سے لوگ زر نقد یا سامان قرض لینے لگے؛ اور بیش بہا انجنوں اور مشینوں اور پیدائش بر پیمانہ کبیر کی بدولت عمل پیدائش دولت میں اصل نمایاں کام کرنے لگا۔

المختصر اصل کے دو خصائص امتیازی تحقیق ہوئے:۔ اول وہ آمدنی غیر مکتسب کا آلہ قرار پایا، دوم پیدائش دولت کا ایک ناگزیر عامل تسلیم کیا گیا۔ اور یہ دونوں خصائص اپنی اپنی جگہ اہم اور قابل توجہ ہیں: چنانچہ پیدائش کی بحث میں

اصل کی خصوصیت دوم پر بہت زور دیا جاتا ہے، اور تقسیم دولت کے بیان میں باب سیزدہم خصوصیت اول پر بیحد توجہ طلب کی جاتی ہے ؛
مفہوم اصل کی بحث میں اور بھی بہت کچھ بال کی کھال نکالی گئی ہے، جسکی پیچیدہ تفصیل بخوف انتشار و حیرانی نظر انداز کرنا قرین مصلحت معلوم ہوتا ہے ؛

۲ - پیدائش دولت کے میں ان میں اس وقت اصل باقی ہر دو عامل یعنی شغل اصل زمین و محنت پر حکمران نظر آتا ہے، جیسا کہ ہم ایک موقع پر پہلے بھی بیان کر چکے ہیں۔ عہد قدیم میں پیدائش دولت کا دار و مدار بیشتر زمین پر تھا، ازمنۂ متوسط میں محنت کا دخل بڑھا، اور عہد جدید میں اصل کا دور دورہ ہے : چنانچہ معاشی زبان میں موجودہ زمانے کو اصل شاہی یا عہد اصل کہتے ہیں۔ اصل کا عروج بھی تہذیب جدید کا ایک لازمہ ہے، بعض نے تو اصل کو موجودہ تہذیب کا خون زندگی قرار دیا ہے، اور اس میں کچھ مبالغہ بھی نہیں کیونکہ فلم اور علم دونوں اسی کے متوسل نظر آتے ہیں ؛ اور آج کل ممالک کی پسماندگی و ترقی کا باعث اسی اصل کی قلت و افراط میں مضمر ہے مشینوں اور پیدائش بر پیمانہ کبیر کے بیان سے اصل کی قوت پیدا آوری کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے (۴، ۵)، افزونی اصل کے اسباب بھی واضح ہو چکے ہیں (۲، ۳)؛ یہاں ہم کو یہ بتانا مقصود ہے کہ اس زمانے میں اصل سے کام لینا جس کو اصطلاحاً شغل اصل کہتے ہیں، کس قدر مروّج، اہم اور آسان ہو گیا ہے۔ ایک طرف تو عمل اصل کے واسطے نہایت وسیع میدان نکل آیا، دوسری طرف قانونی تسلط اور کاروباری خوش معاملگی کی بدولت اصل کو وہ امن و امان میسر ہے کہ بلا خوف و خطر چار دانگ عالم میں چکر لگا رہا ہے، دنیا کا کونسا آباد حصہ ہے جہاں انگلستان کا تھوڑا بہت اصل کام نہیں کر رہا ہے؛ یہی اصل تو دنیا کے ہر گوشے سے دولت سمیٹ سمیٹ کر یورپ اور امریکا لیے جا رہا ہے۔ وہاں کے اصل دار نہ صرف اپنے ملک کی صنعت و حرفت بلکہ نہایت دور دست ممالک کی ریل، معدنیات، اور جنگلات، جیسے معاشی شعبوں میں بلا پس و پیش اور نہایت دریا دلی سے اصل لگا لگا کر غیر ملکی خداداد نعمتوں سے گھر بیٹھے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ انکی زبردست اور ذی اقتدار حکومتیں انکے بیرونی کاروبار اور اصل کی

پوری حفاظت اور نگہداشت کرتی ہیں؛ اور موجودہ بیدار قومیں دیگر ممالک میں اپنے معاشی فوائد کی ترقی، ملک گیری سے بھی زیادہ اہم اور قابل توجہ سمجھتی ہیں: حتیٰ کہ کچھ عرصے سے ملکی فتوحات کے بجائے معاشی تسلط کی خواہش جنگ کی محرک ہونے لگی ہے اور بعدہٗ یہی تسلط بلادردسر ملکوں پر قبضہ بھی کرا دیتا ہے۔ آجکل تو "آگے کھٹیا پیچھے لٹیا" ملک گیری کا عام اصول بنا رکھا ہے۔ ہندوستان سے لیکر مراکش، مصر اور فارس تک معاشی تسلط کا یہی جال پھیلا ہوا نظر آتا ہے ؛

اب ذرا شغل اصل کی آسانیوں کا حال سنیئے! اول تو صدہا بنک ہیں جو اصل کے بیشمار چھوٹے چھوٹے اجزا سے نہایت کثیر مقدار فراہم کر کے کاروبار میں بڑی بڑی رقمیں لگاتے ہیں۔ یہ بنک گویا ایسے تالاب ہیں جن میں بیشمار چھوٹے چھوٹے گڑھوں کا پانی فراہم ہو کہ کھیت اور باغات کو سیراب و شاداب کرے۔ ہر شخص کو اتنی مہلت کہاں کہ اپنے اندوختے سے خود کام لے سکے اور نہ چھوٹی چھوٹی رقموں سے آج کل کام چل سکتا ہے۔ بس اس سے بہتر کیا ہوگا کہ عدیم الفرصت اور چھوٹے چھوٹے اصل دار اپنا اندوختہ کسی بنک میں داخل کر کے نہ صرف اس کی حفاظت سے سبکدوش ہوں بلکہ کچھ سود بھی بطور معاوضہ پائیں؛ اور بنک ایسے بیشمار اندوختوں کی بڑی بڑی مقدار اپنے اہتمام اور ذمہ داری پر تاجر اور کارخانہ داروں کو سود پر قرض دیں، اور داخل کنندوں کو بشرح کمتر سود دے کر فرق میں سے مصارف کاروبار اور منافع نکالیں۔ اور چونکہ اصولاً اکثر ایسی ضرورتوں کے واسطے روپیہ قرض دیتے ہیں کہ جن میں اصل کی قوت پیدا آوری سے کام لیکر قرض لینے والا مزید دولت پیدا کر سکے، بنک کے قرضداروں پر سود کچھ گراں بھی نہیں گزرتا بلکہ اصل مستعار کے توسل سے وہ خود بھی منافع اٹھا لیتے ہیں: گویا ایک ہی اصل اپنے مالک، بنک، اور قرض لینے والے، تین طبقوں سے گزر کر پیدائش کے میدان میں داخل ہوتا ہے ؛

بنک میں اندوختہ جمع کرنے کے علاوہ شغل اصل کی اور بھی بہت سی صورتیں ہیں، یہاں چند کاروباری اصطلاحات کی تشریح کرتے ہیں جس سے خود بخود واضح ہو جائیگا کہ کاروبار میں روپیہ لگانے کے آجکل کیا کیا طریق رائج ہیں:۔

'انجمن سرمایۂ مشترک' سے کوئی ایسا کارخانہ یا دوکان مراد ہے جسکو متعدد لوگوں

نے مل کر جاری کیا ہو، کاروبار میں سب نے مل کر اپنی اپنی گرہ سے روپیہ لگایا ہو، اور بحالت ضرورت اپنی مجموعی ذمہ داری اور ضمانت پر دوسروں سے قرض لیکر کاروبار کو فروغ دیا ہو۔ انجمن کا انتظام وغیرہ تنخواہ دار منیجر اور ملازموں کے ہاتھ میں ہوتا ہے، البتہ شرکا کی ایک کمیٹی عام نگرانی رکھتی ہے۔ قانون نے ایسی انجمنوں میں دو بڑی خوبیاں پیدا کردی ہیں: اوّل تو سرکاری سند یافتہ محاسبوں سے ہر ششماہی یا سالانہ حساب وکتاب کی جانچ پڑتال کراکے عام اطلاع کے واسطے کاروبار کی رپورٹ شائع کرانی قانونًا لازم ہے، گویا انجمن کے حسابات میں ردوبدل کرنا بہت دشوار ہے؛ مزید براں ایسی انجمنیں محدود بھی ہوسکتی ہیں۔ اگر خدانخواستہ کسی مشترک سرمایہ دار محدود انجمن کو خسارہ آئے تو شرکا سے زیادہ سے زیادہ اسقدر رقم وصول کی جاسکتی ہے جسقدر کہ انھوں نے اپنی گرہ سے کاروبار میں لگا رکھی ہے، گویا بار کفالت صرف اسی رقم تک محدود ہے۔ مطالبہ داروں کو اس کے علاوہ شرکا کے دیگر مال وجائداد پر کچھ دعویٰ نہ ہوگا؛ مثلاً کسی محدود انجمن میں دس ہزار روپیہ شرکا کی طرف سے لگا ہوا ہو اور بارہ ہزار روپیہ واجب الادا ہو، مطالبہ دار زیادہ سے زیادہ دس ہزار روپیہ جو شرکا نے انجمن میں لگا رکھا ہے وصول کرسکتے ہیں۔ ان کے مطالبے کا بار کفالت شرکا کے دیگر مال وجائداد پر عائد نہیں ہوتا تو وہ بس انجمن کی رقم تک محدود ہے۔ ایسی کاروباری انجمنوں میں شریک ہونے میں لوگوں کو زیادہ پس وپیش نہیں ہوتا: چنانچہ مشترک سرمایہ دار محدود انجمنیں ترقی یافتہ ممالک میں بکثرت جاری ہیں، اور بیشتر کاروبار انھی کے ہاتھ میں نظر آتا ہے؛

بونڈ اور ڈبنچر میں کوئی فرق نہیں، دونوں کا مفہوم ایک ہے۔ اگر کسی کمپنی کو عوام سے روپیہ قرض لینا منظور ہو تو وہ بونڈ یا ڈبنچر فروخت کرکے روپیہ فراہم کرلیتی ہے اور بونڈ کے مالکوں کو بشرح معین سود ادا کرتی رہتی ہے۔ مثلاً سو سو روپے کے بونڈ جاری ہوں اور فی بونڈ چار روپے سالانہ سود دیا جائے گویا کمپنی نے چار فی صدی سود کے حساب سے قرض لیا اور قرض دہندوں کو بونڈ بطور تمسک دیدیا، تاکہ اسکے ذریعے سے وہ سود پاتے رہیں، اور جب چاہے اس کو فروخت کرکے کم وبیش روپیہ نکالیں یا بروقت معینہ کمپنی سے اصلی رقم وصول کریں۔ واضح ہو کہ بونڈ یا تمسک کی حالت

بعینہ جائداد کی سی ہے، اس لئے مستقل آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے لوگ بلا تکلف اسکو خرید و فروخت کرتے رہتے ہیں۔ بونڈ کے سود کی مقدار معین ہوتی ہے: مثلاً سو سو روپے کے بونڈ کا سود فی بونڈ چار روپے سالانہ ہو، بازاری شرح سود کے حساب سے عام خرید و فروخت میں اسکی قیمت کم و بیش ہوتی رہیگی۔ اگر بازاری شرح سود تین فی صدی ہو تو مذکورۂ بالا سو روپے والے بونڈ کی قیمت جس سے چار روپے سالانہ آمدنی حاصل ہوتی ہے، سو کے بجائے ایک سو تیس کے قریب ہو جائیگی۔ اس کے برعکس اگر بازاری شرح پانچ فی صدی ہو تو اسکی قیمت گھٹ کر اسّی روپے کے قریب آ رہیگی۔ جو قیمت کمپنی کی طرف سے بونڈ پر درج ہو وہ قیمت متعارفہ کہلاتی ہے، اور جو قیمت بازار میں وصول ہو اس کو قیمت صحیحہ کہتے ہیں: مثلاً بونڈ مذکورۂ بالا کی قیمت متعارفہ سو روپے ہے، لیکن اسکی قیمت صحیحہ ایک وقت ایک سو تیس روپے کے قریب ہے، اور دوسرے وقت صرف اسّی روپے۔ اور اسی طرح وہ اکثر تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

بونڈ کی کئی قسمیں قرار پاتی ہیں: انسکرائبڈ بونڈ یا رجسٹرڈ بونڈ کو درج شدہ تمسک، یا رجسٹری شدہ تمسک سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ان کے مالکوں کے نام کمپنی کے رجسٹروں میں باقاعدہ درج رہتے ہیں؛ اگر ایسا تمسک گم ہو یا چوری جائے تو کمپنی کے رجسٹروں میں اس کی ملک کا ثبوت محفوظ رہتا ہے۔ اسقدر احتیاط برتی جاتی ہے کہ خود مالک یا اس کے مختار کے سوائے کوئی اور سود بھی وصول نہیں کر سکتا۔ اس کے برعکس بیرر بونڈ یا دست گرداں تمسک یوں ہی ہاتھوں ہاتھ منتقل ہوتے رہتے ہیں، کمپنی کے رجسٹروں میں مالکوں کا نام درج نہیں رہتا، "القبضۃ دلیل الملک" کے اصول پر عمل ہوتا ہے، جو کوئی ایسا بونڈ یا تمسک کمپنی کے ہاں پیش کرے سود وصول کرے۔ اسیطرح اگر بیرر بونڈ گم ہو یا چوری جائے تو مالک کو ثبوت پیش کرنے میں دقت کا سامنا ہوگا۔ اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان تمام خطروں کے ہوتے ہوئے لوگ ایسے بونڈ کیوں خریدتے ہیں۔ اس کی وجہ ذیل میں بیان ہوگی:-

کمپنیوں کے اکثر بونڈ میعادی ہوتے ہیں؛ یعنی کمپنی وقت معینہ مثلاً دس پندرہ سال کے اندر اندر یا اختتام پر اصلی رقم یعنی متعارفہ کے حساب سے بونڈ واپس لیکر قرض ادا کرنے کا ذمہ لیتی ہے۔ اس اصول پر میونسپلٹیاں بھی سڑکوں کی روشنی اور

واٹر ورکس میں ذرائع آبرسانی کے واسطے عوام سے قرض لیکر چلاتی ہیں، اور کمپنیوں کی طرح ان کو بھی سود ادا کرنے پر کچھ منافع بچ رہتا ہے لیکن جب کوئی سلطنت قرض لیتی ہے اور سلطنتوں میں قرض ستانی کا رواج بہت بڑھ رہا ہے، تو وہ اکثر دائمی بونڈ یا تمسک فروخت کرتی ہے: یعنی بونڈ واپس لینے اور قرضہ ادا کرنے کا کوئی وقت مقرر نہیں کرتی، البتہ مالکان تمسک کو مستقل طور پر سود دیتے رہنے کا پورا ذمہ کر لیتی ہے؛ جب تک بونڈ اپنے پاس ہو، سرکار سے سود ملتا رہیگا، اور جب روپیہ نکالنا چاہے بونڈ کسی کے ہاتھ بہ نرخ بازار فروخت کردے، بونڈ کے خریدار ملنے میں دقت نہیں ہوتی۔ البتہ یہ دوسری بات ہے کہ بازاری شرح سود کے مطابق بونڈ کی قیمت کم اٹھے یا زیادہ ایسے سرکاری بونڈ کو پرامیسری نوٹ یا گورنمنٹ اسٹاک یعنی سرکاری تمسک بھی کہتے ہیں۔ اسٹاک کا ایک خاص مفہوم اور بھی ہے جو ابھی بیان ہوگا ؛

اگر سلطنت زر قرض کو کاروبار میں لگا دے: نہریں کھدوائے، ریلیں نکالے تو سلطنت پر سود کا کوئی بار نہیں پڑتا؛ بلکہ ایسی چیزوں کی آمدنی میں سے سود اور مصارف منہا کرنے کے بعد الٹا منافع بچ رہتا ہے۔ چنانچہ سرکار ہند کا بیشتر قرضہ پیدآور ہے: یعنی اس سے آمدنی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن کبھی کبھی سلطنتوں کو بحالتِ مجبوری غیر پیدآور کاموں کے واسطے بھی قرض لینا پڑتا ہے: مثلاً مصارف تاوان جنگ یا امداد قحط کے واسطے، یا بصورت قلت محاصل معمولی مصارف کیواسطے، ایسی سلطنت کی حالت بعینہٖ کسی خستہ حال اور مقروض رئیس کی سی ہوگی۔ غیر پیدآور قرض اور اس کا سود محاصل سلطنت پر سراسر بار ہوگا، اور ملک کی ترقیات میں جس قدر حارج ہو کم ہے ؛

چونکہ اکثر ترقی یافتہ ممالک میں آئینی اور نیابتی حکومتیں قائم ہیں، سرکاری قرضہ پبلک لون یا قرض عامہ کہلاتا ہے۔ فنانس یعنی مالیات کی ضخیم کتابوں میں قرض عامہ کی پیچیدہ مگر دلچسپ بحث خاص توجہ اور غور سے مطالعہ کی جاتی ہے۔ جنگ یورپ کی بدولت قرض عامہ کا جال اسقدر پھیل گیا ہے کہ گھر گھر اس کے اصول و قواعد سمجھنے کی ضرورت پیش آرہی ہے۔ لیکن مفصل بیان کے واسطے ایک جداگانہ کتاب درکار ہے ؛

جو لوگ اسٹاک یا شیر یعنی حصے خریدتے ہیں، وہ کمپنی کو روپیہ قرض نہیں دیتے بلکہ مالکان کمپنی کی جماعت میں شریک ہو جاتے ہیں: یعنی قرضخواہ کے بجائے وہ کمپنی کے مالک شمار ہوتے ہیں۔ انکو بشرح معین سود نہیں ملتا بلکہ منافع میں سے حصہ ملتا ہے، جس کو اصطلاحاً مقسوم کہتے ہیں۔ کاروبار کی اچھی یا بری حالت کے لحاظ سے مقسوم کی شرح بڑھتی گھٹتی رہتی ہے: مثلاً کسی سال سو سو روپے کے حصوں پر چھ روپے فی حصہ مقسوم ملے، اور کسی سال ممکن ہے کہ صرف تین روپے فی حصہ ملے۔ اسٹاک اور شیر میں تھوڑا سا فرق ہے: اول تو اسٹاک بالعموم درج شدہ ہوتا ہے، حالانکہ شیر کا درج شدہ ہونا ضروری نہیں، بلکہ اکثر شیر دست گرداں ہوتے ہیں؛ دوم کمپنی سے اسٹاک خریدتے وقت رقم کا کوئی تعین نہیں ہوتا، کوئی چاہے تو شکستہ رقمیں مثلاً ۹۳، ۲۱۱، ۳۵۷ روپے کمپنی میں داخل کر کے اسی قدر رقم کا اسٹاک خرید لے۔ اسکے برعکس کمپنی سے خریدتے وقت شیر کی رقم معین اور بالعموم بستہ ہوتی ہے: مثلاً پچاس یا سو روپے، یا نسو یا ہزار روپے کا ایک حصہ۔ حصے بھی مذکورہ بالا تمسکوں کے مانند خرید و فروخت ہوتے ہیں، جنکی مقدار مقسوم تمسکوں کی مقدار سود کی طرح معین تو ہوتی نہیں، کمپنی کی موجودہ کاروباری حالت اور دو ایک گزشتہ سالوں کے مقسوم سے حصوں کی آمدنی کا اندازہ کر لیا جاتا ہے: مثلاً کسی کمپنی نے سو روپے کے شیر پر سال گزشتہ چھ روپے مقسوم نکالا، اور اسکا کاروبار اب بھی سرسبز ہے، اگر موجودہ بازاری شرح سود چار فی صدی ہو تو اس کمپنی کا سو روپے والا شیر آجکل ایک سو پچاس روپے کے قریب فروخت ہوگا۔ شکستہ رقموں کے حساب کرنے میں ہمیشہ دقت ہوتی ہے: مثلاً مذکورۂ بالا کمپنی کا ایک اسٹاک ہے جس کی اصلی رقم ۳۵۷ روپے ہے گویا کسی نے کمپنی میں یہ شکستہ رقم داخل کر کے ایک اسٹاک لے لیا۔ اب اگر کمپنی سو روپے کے شیر پر چھ روپے سالانہ مقسوم نکالتی ہے، یا بالفاظ دیگر اسٹاک پر بشرح ۶ فی صدی مقسوم دیتی ہے تو اسی حساب سے اس اسٹاک پر اکیس روپے چھ آنے آٹھ پائی سے کچھ زیادہ مقسوم ملیگا۔ اور اگر بازاری شرح سود چار فی صدی ہو تو اسٹاک مذکورہ کی قیمت ۵۳۵ روپے آٹھ آنے ہوگی۔ اور اگر شرح ۵ فی صدی ہو تو قیمت ۴۲۸ روپے چار آنے ہوگی اور اگر شرح پونے پانچ فی صدی ہو تو اسٹاک کی قیمت میں پائیاں تک شامل ہو جاتی ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ بستہ رقوم کے مقابل ایسی شکستہ رقموں کے

حساب اور لین دین میں کس قدر طوالت اور دقت ہوگی ؂

اوپر کے بیان سے واضح ہوا کہ جو لوگ بونڈ یا ڈبنچر یعنی تمسک خریدیں وہ کمپنی کو روپیہ قرض دیکر اسکے قرضخواہ بن جاتے ہیں، اور تا ادائے قرض بشرح معین سود پاتے رہتے ہیں۔ اسکے برعکس جو لوگ اسٹاک یا شیر یعنی حصے خریدتے ہیں وہ کمپنی کے کاروبار میں روپیہ لگا کر اس کے مالک شمار ہونے لگتے ہیں، اور منافع میں سے حصہ رسد مقسوم پاتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کمپنی کو خسارہ پہنچے یا اس کے ٹوٹنے کی نوبت آئے تو اول زر تمسکات اور اس کے سود کی ادائی لازم ہے، اسکے بعد اگر کچھ بچے تو وہ حصے داروں کا حق ہے: گویا تمسک والوں کا مطالبہ حصہ داروں کے حق پر مقدم ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ حصوں کے مقسوم کی شرح تمسک کے سود کی شرح سے بالعموم بڑھی رہتی ہے: مثلاً اگر سو روپے کے تمسک پر چار فیصدی سود ملے تو سو روپے کے حصے پر پانچ روپے مقسوم کی توقع کی جائیگی، اس بیشی کو مطالبات خطر سمجھنا چاہیئے۔ یوں کہنے کو تو تمسک، حصے سے زیادہ محفوظ ہے، تاہم کسی متنزل کمپنی کے تمسک سے مستحکم کمپنی کا حصہ ہزار درجے محفوظ ہے ؂

جو لوگ چاہیں کہ انکا اندوختہ کہیں ٹھکانے لگ جائے اور محفوظ بھی رہے اور اس سے کچھ مستقل آمدنی بھی حاصل ہو، انکے واسطے کسی عمدہ کمپنی یا سلطنت کے بونڈ خریدنا بہت مناسب حال ہے۔ انکی آمدنی مستقل ہوتی ہے اور اگر درج شدہ ہوں تو بھم گم ہونے یا چوری جانے سے نقصان پہنچنے کا ظن بھی کم رہ جاتا ہے۔ بوڑھوں، عورتوں، نابالغوں، اور ملازمت پیشہ لوگوں کے واسطے شغل اصل کا یہی طریق سب سے بہتر ہے ؂

جن کو مستقل آمدنی اسقدر مطلوب نہ ہو بلکہ اضافہ اصل کی زیادہ خواہش ہو ان کیواسطے دست گرداں شیر خاص طور پر موزوں ہیں۔ چونکہ مقسوم معین نہیں ہوتا ان کی قیمتوں میں اکثر خاص تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، اور انکی خرید و فروخت میں بھی کوئی طوالت اور دقت نہیں۔ اگر کسی کو اس قسم کے کاروبار میں دسترس ہو تو کم قیمت پر حصے خریدے اور زیادہ قیمت پر فروخت کرتا رہے: چنانچہ لوگ اس طرح پر حصوں وغیرہ کی الٹ پھیر کرکے لاکھوں روپے کما لیتے ہیں۔ روپے کا ایسا کاروبار شغل اصل کے بجائے تخمین سے تعبیر ہوتا ہے ؂

مندرجہ بالا از حد سادے اور مختصر خاکے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اصل کا کاروبار

بھی کیسا وسیع اور دشوار فن ہے: چنانچہ شغل اصل کے متعلق انگریزی میں متعدد ضخیم کتابیں موجود ہیں اور آئے دن نئی نئی شائع ہوتی ہیں۔ بھلی بری کمپنیوں میں تمیز کرنا، تمسکوں اور حصوں کی خوبیاں اور نقص سمجھنا، موقع محل پہچاننا، یہ سب کیا کچھ آسان کام ہے؟ لوگ عمریں صرف کر کے یہ مہارت حاصل کرتے ہیں: چنانچہ تمسک اور حصوں وغیرہ کی خرید و فروخت بالعموم دلالوں کی معرفت ہوتی ہے جو اس کام میں بڑے تجربہ کار مبصر اور ماہر ہوتے ہیں۔ دلالوں کی خیر خواہی اور خوش معاملگی ضرب المثل ہے، یہ اپنے موکلوں کو پوری نیک نیتی سے بہترین رائے اور مشورہ دیتے ہیں۔ اگر یہ خوبی نہ ہو تو لوگ اپنے لاکھوں روپے کے معاملات ان کے ہاتھ میں کیوں ڈالیں، اور ان کے کاروبار کیونکر فروغ پائیں؛ ایمانداری ہی ان کی ترقی کا حقیقی راز ہے*

اپنا اندوختہ دوسروں کے سپرد کرنے کی جدید مفید صورتیں اوپر بیان ہوئیں۔ اب رہا لین دین کا قدیم طریق جس کا ہندوستان میں اب تک بہت رواج ہے: یعنی ایسے لوگوں کو سود پر روپیہ قرض دینا جو اس کو غیر پیداآور کاموں میں صرف کریں اور عمل پیدائش میں اس سے مدد نہ لیں؛ بالفاظ دیگر جو کہ زر مستعار کو بطور دولت صرف کریں نہ کہ بطور اصل جیسا کہ قرض لیکر شادی، غمی یا عشرت پرستی میں روپیہ صرف کیا جاتا ہے! اگرچہ قرض دہندہ کے نقطۂ نظر سے یہ بھی شغل اصل ہے کیونکہ اس کو سود ملتا ہے؛ لیکن معاشی، معاشرتی، اخلاقی، اور مذہبی غرضیکہ چند در چند لحاظ سے ایسا شغل بیحد ناجائز و معیوب ہے، اور بذریعۂ قانون اس کو روکنے کی پھر کوشش ہو رہی ہے، ایسے لین دین کا سود بدرجۂ اتم ربا ہوتا ہے۔ سود و ربا کا علمی فرق سود کی روداد میں اوپر بیان ہو چکا ہے، ربا کی خرابیوں سے ہم آئندہ بعنوان "سود کا حاضر و مستقبل" مفصل بحث کریں گے*

شغل اصل کی ایک قدیم اور مفید صورت یہ بھی ہے کہ اپنے اصل سے خود ہی کاروبار جاری کر دے۔ یہ طریق اس قدر عام ہے کہ محض نظر انداز ہو جانے کے خوف سے اس کا حوالہ ضروری سمجھا گیا۔ اس حالت میں کاروبار سے جو منافع حاصل ہوگا اس کا ایک جزو اپنے اصل کا سود ہوگا: چنانچہ چودھویں باب میں بعنوان منافع اسکی تفصیل موجود ہے*

۳۔ سود کیا ہے؟ کس طرح پیدا ہو کر کس اصول کے مطابق تقسیم ہوتا ہے؟ ماہیت سود کے متعلق ان سوالات پر بیحد اختلاف رائے پھیلا ہوا ہے جس کی تفصیل کے واسطے ایک جداگانہ ضخیم کتاب درکار ہے، اور جس کے سمجھنے کے لئے معاشیات کی وسیع معلومات شرط اول ہے۔ سود کے متعلق جو متعدد مسائل نکالے گئے ہیں وہ چند انواع میں مرتب ہوسکتے ہیں۔ ایسے کل انواع کا مختصر بیان اور جو مسئلہ مقابلتاً صحیح ترین تسلیم ہو چکا ہے اس کی مفصل بحث اس کتاب میں نہایت موزوں ہوگی:۔

ا۔ مسئلہ استحصال۔ جس طرح کسی زمانے میں صرف زمین عامل پیدائش دولت خیال کی جاتی تھی آجکل بھی بعض لوگ صرف محنت کو عامل پیدائش مانتے ہیں۔ انکے نزدیک اصلدار غریب مزدوروں کی کمائی کا ایک حصہ چھین لیتا ہے جس کو سود کہتے ہیں: گویا سود محض ان نامساعد حالات کا نتیجہ ہے کہ مزدور بالعموم غریب ہوتے ہیں اور دولتمندوں کے ہاتھ اپنی محنت فروخت کرنیکے سوائے انکو کوئی چارہ نہیں۔ مزدوروں کو جو اجرت ملتی ہے وہ انکی مایحتاج زندگی سے بمشکل زائد ہوسکتی ہے اور محنت کی پیداوار سے یقیناً کم ہوتی ہے۔ پیداوار محنت اور اجرت کا فرق بشکل سود اصلدار کی جیب میں جاتا ہے گویا اصل مزدوروں کی کمائی میں سے حصہ چھیننے کا آلہ ہے۔ علمی تحقیقات سے یہ مسئلہ محض وہمی اور بے بنیاد ثابت ہو چکا ہے کسی زمانے میں اس مسئلے کا بہت زور شور تھا لیکن اسکے حامیوں کی تعداد روز بروز گھٹ رہی ہے۔ بہرحال صرف یہی مسئلہ سود کا مخالف ہے، اسکے علاوہ باقی کل مسائل بالاتفاق سود کے موافق ہیں۔ اور صرف تشریح و توجیہ سود میں اختلاف کرتے ہیں:

ب۔ مسئلہ پیدآوری۔ سود اصل کی ان خدمات کا معاوضہ ہے جو پیدائش دولت میں وہ سرانجام دیتا ہے۔ عمل پیدائش دولت میں سود کا حصہ مسلم ہے: چنانچہ وہ عامل پیدائش مانا جاتا ہے، اور جس طرح کہ مزدور کی محنت کا معاوضہ اجرت کہلاتا ہے، اصل کی خدمات کے معاوضے کو سود کہتے ہیں۔ بظاہر تو یہ مسئلہ نہایت صاف اور صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن

نظر غائر ڈالنے سے اس میں چند دقیق مگر اہم خامیاں نمایاں ہونگی جن کی تشریح سے ہم یہاں معذور ہیں۔ صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ مسئلہ سراسر غلط تو ہے نہیں مگر ادھورا اور غیر تشفی بخش ضرور ہے؛

ج۔ **مسئلہ اجتناب**۔ انسانی خاصہ ہے کہ کسی چیز سے بوقت موجودہ لطف اٹھانے کو بمقابلہ مستقبل کے زیادہ دل چاہتا ہے، اور التوائے لطف بہت گراں گزرتا ہے۔ اول تو پیدائش اصل کے واسطے پس اندازی: یعنی موجودہ ضروریات ترک کرکے مستقبل ضروریات کے خیال سے کچھ بچانا شرط لابدی ہے، دوسرے اندوختے سے بجائے دولت کے بطور اصل کام لینا: یعنی اس سے فوری احتیاجات رفع نہ کرکے مزید دولت پیدا کرنا گویا اس کی لطف اندوزی کو ملتوی کرنا ہے۔ پس پیدائش اور شغل اصل دونوں میں اجتناب مضمر ہے، اور اجتناب کیا ہے؟ لطف اندوزی کے کام سے باز رہنا جیسے ہم مقدمے میں واضح کر چکے ہیں۔ یہ خدمت کی ایک شکل ہے اور ہر طرح پر دولت کہلانے کے مستحق؛ پس سود معاوضہ ہے اسی خدمت اجتناب کا یعنے موجودہ خرچ سے کچھ بچانے کا، اور اندوختے کو فوری احتیاجات پر صرف کرنے کے بجائے اس سے مستقبل دولت پیدا کرنے کا۔ صریح واقعہ ہے کہ جب تک اندوختے سے کچھ آمدنی کی امید نہ ہو بہت کم پس انداز کیا جاتا ہے اور منافع کی امید بغیر اندوختہ کاروبار میں لگانا یا کسی کو قرض دینا تو محال ہے۔ البتہ جو قرض حسنہ براہ ہمدردی بلا سود دیا جاتا ہے وہ خارج از بحث ہے، لیکن ایسی مستثنیات بیحد نایاب اور ناقابل لحاظ ہیں۔ حاصل کلام یہ کہ جو شخص کچھ روپیہ بچا کر کاروبار میں لگاتا ہے وہ فوری احتیاجات پر یہ روپیہ صرف کرنے سے باز رہنے کی خدمت سرانجام دیتا ہے، اور سود اسی خدمت اجتناب کا معاوضہ ہے۔ اس مسئلے کی رو سے پیدائش اصل بہت کچھ اور شغل اصل سراسر سود پر منحصر ہے۔ اور چونکہ پیدائش دولت میں اصل اسقدر معاون ہے سود دینا لابدی اور درست ہے؛

اس واقعے سے تو انکار ہو نہیں ہوسکتا کہ ہر ایک شخص مقابلۃً موجودہ ساری لطف اندوزی کو مستقبل پر ضرور ترجیح دیتا ہے اور پیدائش و شغل اصل میں

اجتناب مضمر ہے، لیکن سود کو اس خدمت اجتناب کا معاوضہ قرار دینا علمی حیثیت سے کافی طور پر تشفی بخش اور قابل تسلیم نہیں۔ اس مسئلے پر چند دقیق اور مسکت اعتراض عائد ہوتے ہیں جن کی روشنی میں اجتناب کی خدمت غائب ہوجاتی ہے ؛

لطف اندوزی حاضر کو مستقبل پر ترجیح دینے کا انسانی خاصہ تو بالکل درست ہے لیکن اس مسئلے میں اس سے جو توجیہ کی گئی ہے وہ صحیح نہیں۔ بہتر توجیہ ہم آگے چلکر مکمل ترین مسئلے کے ضمن میں بیان کریں گے ؛

(د) مسئلۂ محنت۔ بعض نے پس اندازی و شغل اصل کو سیدھے سادے طور پر محنت قرار دیکر سود کو اصل دار کی اس محنت کا معاوضہ یا اجرت قرار دیدیا۔ یہ مسئلہ بھی مسئلۂ اجتناب سے ملتا جلتا مگر اس سے زیادہ سادہ ہے۔ مذکورۂ بالا مسائل سے سود کے بجا اور درست ہونے کی تائید ضرور ہوتی ہے؛ لیکن ان میں سود کی علمی تشریح و توجیہ بالکل ادھوری اور غیر تشفی بخش نظر آتی ہے ؛

مذکورۂ بالا مسائل کے علاوہ چند اور مسائل بھی پیش کئے جاسکتے ہیں، جن میں سے بعض تو قطعاً رد ہو چکے ہیں، اور محض تاریخی لحاظ سے سود کی بحث میں ان کا ذکر کردیا جاتا ہے؛ اور بعض مذکورۂ بالا مسائل کے عجیب عجیب مرکب ہیں جن میں انکی خامیاں بھی بدرجۂ اولی موجود ہیں ؛

اب ہم سود کا وہ آخری مسئلہ ذرا تفصیل سے پیش کرنا چاہتے ہیں جو مقابلتہً مکمل ترین خیال کیا جاتا ہے؛ اور یہ بھی جتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ فی نفسہٖ ابھی خود یہ مسئلہ بھی تکمیل طلب ہے۔ اس مسئلے کے حامیوں میں بھی باہم اختلاف رائے پھیلا ہوا ہے اور اسی وجہ سے مسئلے کی موجودہ شکل بعینہٖ کسی ایک مصنف کی کتاب میں نظر آنی محال ہے۔ مطالعے اور غور سے پورا پورا کام لے کر اس مسئلے کے بیان میں ہم نے دَعْ مَاکَدِرَ وَخُذْ مَاصَفَا کے اصول پر عمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا اگر یہ مسئلہ بعض سے ملتا جلتا، لیکن ہر ایک سے جدا نظر آئے تو عجب نہیں۔ کتاب ہٰذا میں یہ طریق ناگزیر معلوم ہوا؛ ورنہ مسئلۂ سود کی بحث کے واسطے ضخیم کتاب اور اس کے سمجھنے کے واسطے معاشیات میں بہت کچھ وسعت معلوم لابدی ہے ؛

سود کی سب سے بہتر علمی تشریح و توجیہ اصل کے دو مسلّم خواص سے متعلق

حصہ سوم
باب سیزدہم

معلوم ہوتی ہے: ایک توقع پسندی جو اصل سے کام لینے میں کم و بیش لاحق ہوتی ہے؛ دوسرے پیدآوری جو اصل کا لاینفک خاصہ ہے اور جس کی بدولت وہ عامل پیدائش شمار کیا جاتا ہے۔ مندرجۂ ذیل تفصیل سے واضح ہوگا کہ توقع پسندی سود کا باعث اور پیدآوری اس کا منبع ہے؛ علی ہذا اصل کی رسد و طلب بھی انھی خواص سے علی الترتیب متعلق ہے۔

توقع پسندی

۴۔ بعض لوگوں کے پاس تو اسقدر دولت ہوتی ہے کہ ان سے خرچ کیے بن نہیں پڑتا، جبکہ تمام موجودہ ضروریات حاصل ہوں تو باقی ماندہ دولت کو پس انداز کیے بغیر کیا چارہ ہو سکتا ہے۔ لیکن بعض زیادہ اہم مستقبل احتیاجات رفع کرنے کے خیال سے اگرچند موجودہ ضروریات ترک کر کے بھی لوگ کچھ اندوختہ جمع کریں تو عجب نہیں؛ چنانچہ واقعہ ہے کہ حسب حیثیت لوگ بالعموم علالت و پیری کے خیال سے موجودہ آمدنی میں سے کچھ نہ کچھ جمع کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایسے اندوختے لوگ خود بخود پس انداز کرتے ہیں انکو مزید معاوضے کی ترغیب ضروری نہیں؛ بلکہ ایسے اندوختوں کی نگہداشت کا کوئی معاوضہ وہ اپنی گرہ سے دینے پر بھی رضامند ہو جائیں تو عجب نہیں۔ چنانچہ جبکہ شغل اصل کا میدان نہایت تنگ تھا، بنک رقم داخل شدہ کے تحفظ و نگہداشت کا معاوضہ داخل کنندوں سے الٹا وصول کرتا تھا۔ اب تک پس اندازی دو حالتوں تک محدود تھی: اول جبکہ دولت کی خوب افراط ہو، دوم جبکہ بمقابل چند موجودہ احتیاجات کے آئندہ زیادہ اہم احتیاجیں پیش آنی یقینی ہوں۔ لیکن معاشی ترقیات کی بدولت جبکہ شغل اصل کے مواقع بیحد کثیر اور وسیع ہو گئے ہیں، ایک جدید تیسری قسم کی پس اندازی شروع ہوئی یعنی بلا زیادتی دولت، و بلحاظ احتیاجات مستقبل محض مزید معاوضے کے لالچ سے موجودہ احتیاجات کو دبا دبا کر لوگوں نے پس اندازی شروع کر دی۔ ایک شخص سے دریافت کیا جائے کہ آیا وہ سو روپے آج لینا چاہتا ہے یا ایک سال کے بعد؟ اب اگر اسکو اس وقت کوئی احتیاج ہی درپیش نہ ہو، یا آئندہ احتیاجات موجودہ سے زیادہ اہم احتیاجیں پیش آنے کا یقین ہو تو بشرطیکہ اس کو پورا اعتماد بھی ہو، وہ رقم مذکورہ سال بھر میں لینا زیادہ پسند کریگا؛ بلکہ انتظاری کا کچھ معاوضہ بھی اپنی گرہ سے دے تو عجب نہیں۔ لیکن بحالت سوم اگر اس کو موجودہ احتیاجیں دبا رہی ہوں

تو اسکو رفع کرنے کی غرض سے وہ اس رقم کی ادائی حاضر کو مستقبل پر ضرور ترجیح دیگا۔ البتہ اگر کچھ مناسب اضافے کا وعدہ کیا جائے تو ممکن ہے کہ وہ حال کے بجائے ایک سال ہی بعد لینا گوارا کرے۔ اس واقعے سے ایک عام اصول واضح ہوتا ہے کہ بحالت احتیاج کسی چیز کے ملنے کے وقت میں جسقدر بعد ہوگا اسی قدر موجودہ معیار کے مطابق اسکی قدر گھٹ جائیگی "نو نقد نہ تیرہ اُدھار" اسی کو خاصۂ توقع پسندی کہتے ہیں۔ اگر شخص مذکور اسوقت سو روپے یا ایک سال بعد ۱۰۵ روپے لینے پر یکساں رضامند ہو تو گویا اسوقت ایکسال بعد ملنے والے ۱۰۵ روپے کی قدر اسکے نزدیک فوراً ملنے والے سو روپے کے برابر ہے لیکن واضح ہو کہ سال بھر بعد بوقت حصول ۱۰۵ روپے کی قدر موجودہ سو روپے کی قدر سے بمقدار ۵ روپے زائد ہوگی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو سال بھر انتظار کرنے پر وہ رضامند کیوں ہونے لگا تھا! گویا اسوقت تو ان ۵ روپیوں سے بمقابلہ سو روپے حاضر کے ۱۰۰ روپے مستقبل کی قدر کی موجودہ تخفیف کی تلافی ہوتی ہے؛ لیکن سال بھر بعد جبکہ بوقت حصول یہی ۱۰۰ روپے مستقبل؛ ۱۰۰ روپے حاضر کے مساوی القدر ہو جاویں تو وہ ۵ روپے سود بن جاویں گے: یا بالفاظ دیگر، ۱۰۵ روپے مستقبل کی موجودہ قدر سو روپے حاضر کے برابر ہے؛ اور سال بھر بعد بوقت حصول ۱۰۰ روپے حاضر سے بقدر ۵ روپے زائد ہوگی۔ یہی ۵ روپے جو اس وقت تخفیف قدر کی تلافی کرتے ہیں اسوقت بطور قدر مزید سود شمار ہوں گے:۔

پس صاف ظاہر ہے کہ سود کا باعث توقع پسندی ہے۔ اور توقع پسندی اکثر اصل کی پیدائش اور تمام اصل کے شغل سے لاینفک ہے۔ چند دولتمندوں کو چھوڑ کر عام طور پر لوگ تھوڑی بہت موجودہ احتیاجات دبائے بغیر پس انداز کم کر سکتے ہیں؛ رہا شغل اصل؛ خواہ اندوختہ کچھ عرصے کے واسطے قرض دیا جائے، یا زراعت، صنعت و حرفت اور تجارت میں لگایا جائے، اس کی واپسی ہمیشہ قریب یا بعید مستقبل میں ہوگی:۔

جو اندوختہ محض بوجہ زیادتی دولت یا بخیال اہمیت احتیاجات مستقبل، جمع ہوتا ہے اگر موجودہ کاروباری ضروریات کے لیے کافی ہوتا تو نہ توقع پسندی کا کوئی دخل ہوتا نہ اصلدار کی زیادہ پروا کی جاتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ آج کل تو امرا اس اصل کا عشر عشیر بھی مہیا نہیں کر سکتے جو عوام اور متوسط الحال لوگوں کے اندوختوں سے ملتا ہے۔ اور آخر الذکر طبقے کے اصل کی پیدائش و شغل میں توقع پسندی کو بہت بڑا دخل ہے،

بلا امید منفعت سود نہ تو یہ لوگ اسقدر پس انداز کر سکتے ہیں اور نہ اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی قرض دینے یا کاروبار میں پھنسانے پر رضامند ہو سکتے ہیں۔ اور موجودہ کاروبار ضروریات کے لحاظ سے ان کا اصل بھی ناگزیر ہے؛ پس ان کو سود دینا لابد ہوا۔ اور جب ان کو سود ملنے لگا تو پھر دولتمند اپنے اصل کا سود کیوں نہ طلب کریں، کام تو انکا اصل بھی وہی کرتا ہے جو دوسروں کا، پھر کیا وجہ کہ اس پر سود نہ دیا جائے۔ آجر کو اس سے کیا بحث کہ آیا اس کی پیدائش اور شغل میں توقع پسندی مضمر ہے یا نہیں، اس کو تو صرف اصل کے کام سے تعلق ہے اور بس۔ لہذا بلا تفریق موجودگی و عدم موجودگی توقع پسندی ہر قسم کے اصل پر سود دیا جانے لگا۔ لیکن سود کا حقیقی باعث پھر بھی توقع پسندی ہے۔

پیدآوری

۵۔ پیدآوری بھی اصل کا جدید خاصہ ہے، اس کی جابجا تفصیل بھی کی جا چکی ہے؛ مختصراً یہاں بھی تشریح کرتے ہیں: فرض کرو کہ ایک درزی جو ہاتھ کی سلائی سے آٹھ آنے روز کما سکے سنگر مشین کی مدد سے بارہ آنے روز کمائے تو چار آنے کی پیداوار اصل مشین سے منسوب کرنا بیجا نہ ہوگا۔ لیکن واضح ہو کہ اصل کی پیدآوری ثابت کرنے کے لئے چار آنے کا محض پیدا ہونا کافی نہیں، دوران شغل میں اصل قائم برابر فرسودہ ہوتا رہتا ہے حتی کہ کچھ عرصے میں بالکل بیکار ہو جاتا ہے، ابتدائے استعمال کے وقت سے بیکاری کے وقت تک اس پیداوار میں سے جو استعمال اصل کا نتیجہ ہو مطالبات فرسودگی ایسی شرح سے منہا کرتے رہتے ہیں کہ کل اصل واپس آجائے؛ پس اگر ایسی پیداوار مطالبات فرسودگی سے کمتر ہو تو گویا اصل پھر واپس ہی نہیں آسکتا اور اس کے استعمال میں سراسر نقصان ہے۔ اگر مطالبات فرسودگی کے مساوی ہو تو کچھ عرصے میں صرف اصل واپس آجائیگا؛ استعمال سے اصول توقع پسندی کے مطابق پھر بھی نقصان رہیگا۔ البتہ اگر مطالبات فرسودگی سے ایسی پیداوار کچھ زائد ہو تو بیشک وہ پیدآوری اصل کا ثبوت ہوگی اور پیداوار اصل کہلانے کی مستحق۔ تجربہ شاہد ہے کہ شغل اصل سے علاوہ مطالبات فرسودگی کے مزید پیداوار بھی حاصل ہوتی ہے، جس میں سے بالعموم سود ادا کیا جاتا ہے۔ یہی پیدآوری ہے جس کی بدولت لوگ خوشی خوشی بمقدار کثیر سود پر قرض لیکر اصل مستعار سے کاروبار چلاتے ہیں، اور سود ادا کرنے پر بھی منافع اٹھاتے ہیں۔ اگر اصل سے

پیداوار میں جداگانہ اضافہ نہ ہوتا تو لوگ اس قدر شوق سے قرض لے کر اس کو کیوں کام میں لاتے اور فضول کیوں سود کے زیر بار ہوتے۔ البتہ جو لوگ روپیہ قرض لیکر مجبوری یا بخوشی غیر پیداآور کاموں میں صرف کرتے ہیں: جیسا کہ بحالت افلاس قرض لیکر بسر اوقات کرنا، یا آوارہ مزاج رؤسا کی طرح رنگ رلیاں منانا، ایسے اصل میں قرض دہندہ کی طرف سے توقع پیداوری موجود ہوتی ہے، لہذا وہ سود کا طالب ہوتا ہے۔ لیکن مقروض کے ہاتھ میں آکر ایسا اصل محض دولت رہ جاتا ہے، اس سے پیدآوری مفقود ہو جاتی ہے اور اسی وجہ سے وہ مع سود اس پر بار گراں بنکر تباہی کا باعث ہو جاتا ہے۔ اب اگر محض اس بنا پر کہ اصل مستعار سے پیدآوری کا کام نہیں لیا گیا تھا، قرض دہندہ کو سود سے محروم کیا جائے تو وہ قرض دینے سے انکار کر دیگا۔ لیکن یہ خیال غلط ہے کہ ایسی قانونی بندش سے لین دین رک سکتا ہے، ایسے قرض لینے والے جو نہایت ناعاقبت اندیش ہوتے ہیں طرح طرح کی تدابیر نکال کر قرض لیے بغیر نہ رہینگے۔ البتہ قانونی گرفت کے خوف سے قرض دہندے شرح سود کو اور بھی بڑھا دینگے، اور اس اضافے کو مطالبات خطر کہیں گے، جس کی تشریح ہم اقسام سود کے تحت میں آئندہ کریں گے۔

اگر قرض دہندہ کو قانوناً سود سے محروم کرکے قرض دینے سے روکنے کے بجائے بذریعہ قانون قرض لینے والے کو روکا جائے تو نتیجہ زیادہ حسب دلخواہ ہوگا۔

محتاجوں کو اور رفاہ عام کے کاموں کیواسطے بلا سود قرض دینا، آوارہ لوگوں کو قرض دینے سے انکار کرنا، معاشرتی و اخلاقی لحاظ سے نہایت ضروری اور پسندیدہ ہے، لیکن اسکی مثال اسقدر نایاب ہے کہ معاشی معاملات پر اس کا اثر قابل لحاظ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح غریبوں سے بیحد زیادہ شرح سے سود لیکر چھوٹی چھوٹی رقمیں قرض دیکر، ہمیشہ کے واسطے ان کی کمائی کا شریک غالب بن جانا، یا شوق دلا دلا کر بھولے بھالے وارستہ مزاج رئیس زادوں کو قرض دیکر انکی جائداد ضبط کر لینا، سوسائٹی کے حق میں اسقدر خطرناک اور اخلاقی لحاظ سے مذموم ہے کہ قانوناً اس کی بندش اشد ضروری بھی ہے اور ممکن بھی۔ سود کے بھلے برے نتائج سے ہم آئندہ سود کے حاضرہ مستقبل کے تحت میں بحث کریں گے؛ یہاں صرف یہ جتا دینا مقصود تھا کہ سود

حصہ سوم
باب پنجم

توقع پسندی اور پیدا آوری کا آفریدہ ہے، اور یہ دونوں خواص شغل اصل میں مضمر ہیں۔ لہٰذا سود بھی شغل اصل سے لاینفک رہا۔

شرح سود

۶۔ جیسا کہ شرح اجرت کے بیان میں اشارہ کیا جا چکا ہے، اصل بھی قانون تقلیل حاصل کا پابند ہے: یعنی کسی کھیت یا مزدوروں کی جماعت میں جو اصل استعمال ہوتا ہے حسب دلخواہ کسی مقدار تک اس کا اضافہ کر کے اسی نسبت سے پیداوار میں بھی اضافہ ممکن نہیں۔ خواہ زراعت ہو یا صنعت و حرفت اصل کے جرعے استعمال کرتے کرتے ایک ایسا درجہ ملیگا کہ اس کے مابعد جرعوں کی پیداوار درجہ بدرجہ گھٹتی چلی جاویگی: مثلاً کاشتکار اپنے کسی کھیت میں دس روپے کی کھاد ڈالے یا بیج بوئے یا پانی لگائے، اب اگر ان مدوں میں چوگنا اصل لگائے تو پیداوار کا چوگنے ہونے کا گمان نہیں ہے۔ اسی طرح کسی درزی کی دکان میں جب دو سنگر مشین استعمال ہوتی ہیں تو چار آنے روز فی مشین ملتے ہیں، اب اگر دو مشینیں اور بڑھادی جائیں تو ان پر بمشکل دو تین آنے مل سکیں گے۔ حاصل کلام یہ کہ دیگر عاملین پیدائش زمین، محنت کے مقابلے میں اصل کی مقدار جس قدر بڑھیگی پیداوار اصل کی شرح گھٹتی جائے گی، اور شرح اجرت کی طرح شرح سود بھی سب سے کم پیداوار کے مساوی قرار پائیگی۔

زمین کی وسعت تو تقریباً معین ہے، اس میں اضافے کی برائے نام بھی گنجائش نہیں۔ محنت کے اضافے میں بھی دیر لگتی ہے اور وبا، قحط، جنگ، جیسے عاملین موت اس کی کاٹ چھانٹ کرتے رہتے ہیں، لیکن اصل کے اضافے کا کیا کہنا، "نہ سرگ بیل اسقدر پھیلے نہ مچھلی کی نسل اسقدر بڑھے"۔ گزشتہ صدی میں نہ معلوم اصل کے سوگنا ہو گیا ہوگا؛ اور جسقدر بڑھتا ہے ساتھ ساتھ قوت اضافہ اور بھی بڑھتی جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایسے اصل کی مقدار بڑھ رہی ہے جسکی پس اندازی و شغل میں توقع پسندی مضمر نہیں۔ ایسے اصل کی مقدار جسقدر بڑھیگی توقع پسندی والی اصل کی عوضی بنکر اسکی مقدار مطلوبہ کی تخفیف کا باعث ہوگی؛ اور جسقدر آخر الذکر اصل کی مقدار کم ہوگی ادنیٰ شرح سود پر اصل ملنا آسان ہوگا۔ علاوہ ازیں قیام امن و امان اور عام بیداری کی بدولت خود توقع پسندی کا اثر کمزور ہورہا ہے: یعنی بہ نسبت سابق اب لوگ کمتر معاوضے پر اپنا اندوختہ قرض دینے کا کاروبار میں لگانے پر رضامند پائے جاتے ہیں۔ چنانچہ اعلیٰ یا ادنیٰ شرح سود پر

شغل اصل گوارا کرنا بھی معاشی ترقی و پس ماندگی کی علامت مانی جاتی ہے۔ ضافہ اصل کے ساتھ ساتھ معاشی ترقیات کی بدولت شغل اصل کے واسطے بھی نئی نئی راہیں پیدا ہورہی ہیں، اور قانون تقلیل حاصل کے مقابلے میں نت نئی ایجادیں اصل کی قوت پیدآوری بڑھا رہی ہیں۔ ایک طرف تو طلب اصل، زراعت، صنعت وحرفت، تجارت اور عام کاروباری حالت پر منحصر ہے، دوم کثرت اندوختہ معاشی ترقیات اور عام بیداری کا رسد اصل پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے، اور پھر طلب ورسد میں بہت کچھ باہمی انحصار موجود ہے اور ان کے عمل میں کوئی تقدم وتاخر مقرر نہیں۔ ایسی حالت میں شرح سود کے کل اسباب کا جداگانہ تعین محال ہے، صحت کے ساتھ اس سے زیادہ کیا کہا جاسکتا ہے کہ شرح سود طلب ورسد اصل کے باہمی عمل سے مقرر ہوتی ہے لیکن اتنا تحقیق ہے اور علمی لحاظ سے یہ واقفیت نہایت اہم ہے کہ مقدار سود بالعموم اصل کی پیداوار مختتم کے مساوی ہوتی ہے۔

یہ ایک نہایت دقیق اور معرکۃ الآرا مسئلہ ہے کہ چونکہ سود قلت اصل کا نتیجہ ہے: یعنی توقع پسندی والا اصل ناگزیر ہے کسی زمانے میں کثرت اصل کی بدولت، یعنی جبکہ غیر توقع پسندی والا اصل کاروباری ضروریات کے واسطے کافی ہوگا، سود بھی غائب ہوجائے گا، یہ تو رسد کا پہلو تھا۔ ادھر طلب کے پہلو پر بھی بوجہ کثرت اصل پیداوار مختتم میں تخفیف ہوتے ہوتے صفر رہ جائیگا: بالفاظ مختصر سود محض موجودہ حالات کا آفریدہ ہے، پیداوار کا مستقل حصہ قرار نہیں پاسکتا۔ شرح سود برابر گھٹ رہی ہے، اس سے تو کسی کو انکار نہیں ہوسکتا؛ لیکن جہاں ایک گروہ کا خیال ہے کہ وہ کبھی بالکل غائب ہوجائیگا دوسرا گروہ ثابت کرتا ہے کہ ایک خاص حد پر موجودہ تخفیف ضرور رک جائیگی، اور سود ہمیشہ برابر جاری رہیگا؛ اور وہ پیداوار کا مستقل حصہ ہے۔ سود دائمی ہے یا عارضی اس کا فیصلہ تو بہت بحث طلب اور دشوار ہے، لیکن عرصہ دراز تک اس کا رواج جاری رہنا تو بہرحال یقینی ہے۔

تمام مذکورہ بالا بحث سے صرف یہ جتا دینا مقصود تھا کہ شرح سود معاشی اسباب سے خود بخود مقرر ہوجاتی ہے، وہ محض رواج یا قانون کی آفریدہ نہیں، اور معاشی شرح سود میں قانونی مداخلت بیکار بلکہ مضر ہوتی ہے، لیکن پسماندہ ممالک میں

حصہ سوم

باب سیزدہم

جہاں معاشی اسباب کا اثر ضعیف ہے اور اب تک قدیم طرز پر غیر پیداآور کاموں کے واسطے زر نقد
کا لین دین ہوتا ہے، سود بالعموم قرض گیر کی احتیاج کے مطابق ہوتا ہے۔ ایسے قرض ناچاری
اور مجبوری کے ہوتے ہیں اور مثل مشہور ہے "مرتا کیا نہ کرتا" جب کسی کو قرض لئے بغیر
چارہ ہی نہیں تو شرح سود پر ردّ و قدح کرنے کی اس کو کہاں سے جرأت ہو سکتی ہے۔
زیادہ شرح جس کا وہ بظاہر متحمل ہو سکتا ہے قرض دہندہ اس سے طلب کرتا ہے اور
اس کو بھی منظور کرنا پڑتا ہے۔ ایسے لین دین کی مضرتوں سے ہم آئندہ سود کے حاضرہ
مستقبل کے تحت میں مفصل بحث کرینگے، یہاں صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس کی
شرح سود قانوناً محدود و مقرر کرنا ممکن بھی ہے اور از حد مفید بھی ؎

اصطلاحی زبان میں مذکورۂ بالا بحث کا لب لباب یہ ہے کہ شرح سود معاشی
اسباب کے تابع ہوتی ہے اور قانونی نگرانی کی محتاج نہیں۔ لیکن شرح ربا بیشتر قرض گیر
کی شدت احتیاج اور قرض دہندہ کی قوت دستبرد کے مطابق ہوتی ہے اور بذریعۂ قانون
اس کے حدود مقرر کرنا بیحد مفید اور اشد ضروری ہے ؎

اقسام سود

۷۔ سود کی دو قسمیں ہیں: سود خام و سود خالص۔ سود خام میں علاوہ سود
خالص کے جسکی ماہیت مسائل سود کے تحت میں واضح کی جاچکی ہے، بعض اور مدیں
بھی خصوصاً مطالبات خطر و مطالبات فرسودگی شامل ہوتی ہیں۔ کاروباری مقابلے
کی آزادی اور اصل کے سریع الانتقال ہونیکی بدولت سود خالص کی شرح تقریباً ہر جگہ
ایک ہی سطح پر پائی جاتی ہے۔ یہ جو ۳ فی صدی سے لیکر ۲۰، ۲۵ فی صدی تک شرح
میں فرق پھیلا ہوا ہے، یہ درحقیقت سود خام سے متعلق ہے۔ جن کاروبار میں اصل
ضائع ہونے کا اندیشہ زیادہ قوی ہے یا فرسودگی اصل کی رفتار تیز ہے، اور اصل بھی بیش
قیمت ہے تو سود خالص عام شرح کے مطابق ہونے کے باوجود بھی مطالبات خطر و
فرسودگی کی زیادتی کی وجہ سے سود خام کی شرح بہت ہو جائے گی؛ اور مذکورۂ بالا
مطالبات طے بغیر کوئی اپنا اصل ایسے کاروبار میں کیوں لگانے لگا۔ بمقابلہ زر رہن کے
قرض پر زیادہ سود طلب کیا جاتا ہے، خوشحال لوگوں کو بمقابلہ عوام کے کمتر شرح سود پر
قرض ملتا ہے۔ کمتر شرح سود پر بھی لوگ قدیم اور معتبر بینکوں ہی میں روپیہ داخل کرنا
زیادہ پسند کرتے ہیں اور اپنی طرف متوجہ کرنے کی غرض سے نئے بینکوں کو زر داخلہ پر

شرح سود بڑھائے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ شرح سود کے ایسے فرقوں کا باعث مطالباتِ خطر کی کمی بیشی ہوتی ہے۔ بعض کاروبار ایسے ہیں کہ ان میں خاص طور پر نقصان کا اندیشہ لگا رہتا ہے: مثلاً شیشہ آلات یا اونی اور زردوز کپڑوں کی تجارت کہ ذراسی بد احتیاطی سے ہزار ہا روپے کا سامان ٹوٹ پھوٹ کر یا کرم خوردہ اور ماندہ ہو کر اکارت جاتا ہے۔ ایسے کاروبار میں بھی باقاعدہ مطالباتِ خطر ملتے رہنے ضروری ہیں تاکہ ان سے اتفاقی نقصانات کی تلافی ہوتی رہے؛ ورنہ کچھ عرصے بعد کاروبار جاری رکھنا محال ہوگا۔ اصل دائر مثل کوئلا و پیداوار خام تو عمل پیدائش میں اول ہی مرتبہ اپنا کام ختم کر کے جلد واپس آجاتا ہے، لیکن عمارت و مشین کے مثل اصل قائم عرصۂ دراز تک عمل پیدائش سرانجام دیکر مدت میں واپس ہوتا ہے۔ لیکن دوران عمل پیدائش میں وہ برابر کھِستا اور فرسودہ ہوتا رہتا ہے، حتیٰ کہ کچھ عرصے میں وہ بالکل بیکار ہو جاتا ہے؛ لہٰذا اس وقت تک اسکی واپسی بھی ضروری ہے۔ پس قاعدہ یہ ہے کہ کچھ فی صدی سالانہ بطور مطالبات فرسودگی شمار کیا جاتا ہے، تاکہ بتدریج کل اصل قائم اسکی ناکارگی کیوقت تک واپس آجائے۔ اصل قائم جسقدر بیش قیمت اور سریع الزوال ہوگا مطالبات فرسودگی بھی زیادہ ہونگے بالصورت دیگر مطالبات کی مقدار بھی بہت کم ہوگی ؛

پس معلوم ہوا کہ سود خام میں علاوہ سود خالص کے جسکی شرح کم و بیش مساوی ہو مطالبات خطر و فرسودگی بھی خاص طور پر شامل ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ان مطالبات کی مقدار کاروبار کی نوعیت سے متعلق ہوتی ہے، سود خام میں بیحد فرق پایا جاتا ہے ؛

یہاں یہ نکتہ جتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کہیں کہیں سود خالص کی شرح بھی معمولی سے اعلیٰ پائی جاتی ہے لیکن یہ اس حالت میں ممکن ہے جبکہ کاروبار متعلقہ میں اجارہ حاصل ہو یعنی وہ مقابلے کی مداخلت سے محفوظ ہو۔ اجارے و مقابلے سے ہم آئندہ بحث کرینگے، یہاں صرف یہ بتانا کافی ہے کہ مقابلے کی خاصیت قیام مساوات ہے، خواہ اجرت میں یا سود و قیمت میں۔ اسکے برعکس اجارہ داران میں اپنے موافق فرق بھی پیدا کر سکتا ہے، لیکن یہ شرح صرف کاروبار کے قدیم شرکاء کے نزدیک اعلیٰ شمار ہو سکتی ہے؛ جدید شرکاء کے حق میں وہ بھی معمولی سطح پر آرہتی ہے۔ اسکی تفصیل یوں ہے کہ اگر کسی کاروبار میں بغایت اعلیٰ شرح سود خالص حاصل ہو رہی ہو تو مروجہ شرح

حصہ سوم
باب نہم

کے حساب سے ایسے کاروبار کے حصص کی قیمت صحیح بھی بڑھ جاویگی، اور جدید شرکا کو وہی
معمولی شرح مل سکیگی: مثلاً کسی کارخانے میں شرح سود خالص پندرہ روپے ہو اور معمولی
شرح ۵ روپے تو ایسے کارخانے کے سو سو روپے قیمت متعارف والے حصے تین تین سو
روپے میں فروخت ہو کر خریداروں کو معمولی شرح سے سود دینگے۔ البتہ قدیم شرکا کو اب بھی
۱۰۰ روپے پر ۱۵ فیصدی ملیگا لیکن انکے قدیم ۱۰۰ روپے بھی اب ۱۰۰ روپے نہیں رہے،
بلکہ تین سو کے مساوی ہو گئے۔ لہذا اصل کی موجودہ قیمت کے مطابق انکو بھی ۵ فیصدی
ہی ملتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی کارخانے کی شرح سود ادنیٰ ہو تو حصص کی قیمت صحیح قیمت
متعارفہ سے گھٹ کر شرح سود معمولی شرح تک بلند کریگی: حاصل کلام یہ کہ سود خالص
کی شرح کم و بیش ہر جگہ مساوی پائی جاتی ہے، جو کچھ فرق نظر آتا ہے اکثر سود خام سے متعلق ہے ؛

سود و ربا اور سود خام و سود خالص کا فرق ظاہر ہو گیا۔ اب ہم سود کی ایک اور
تفریق بتانا چاہتے ہیں جو کاروبار کی اصطلاحی زبان سے متعلق ہے:۔ اصل قرض دیکر
جو معاوضہ بشرح معین فی صدی سالانہ ہم قرضدار سے پاتے ہیں وہ سود کہلاتا ہے؛
لیکن اگر کسی انجمن سرمایہ مشترک کے حصہ دار بنکر ہم کاروبار کے نفع نقصان میں یکساں
شریک رہیں اور غیر معین شرح سے حسب حالات مشغل اصل کا معاوضہ پائیں تو وہ
اگرچہ سود سے مختلف نہیں لیکن کاروباری زبان میں مقسوم کہلاویگا؛ اور اگر بلا شرکت
غیرے ہم اپنے اصل سے خود کاروبار چلائیں تو اس کا سود منافع میں شمار ہوگا۔ جو سود کہ
بشکل مقسوم یا منافع حاصل ہوتا ہے اسکی شرح غیر معین ہوتی ہے اور بمقابلہ اضافہ
تخفیف کا اندیشہ زیادہ دامنگیر رہتا ہے، اس وجہ سے ان میں علاوہ مطالبات خطرہ
فرسودگی، مطالبات ضمانت بھی شامل ہوتے ہیں تاکہ کمی سود کی تلافی ہوتی رہے۔ چنانچہ
یہی وجہ ہے کہ انکی شرح عام مروجہ شرح سود سے کسی قدر اعلیٰ ہوتی ہے؛ لیکن بحیثیت
سود خالص سب تقریباً ایک ہی سطح پر ہوتے ہیں ؛

زر اور سود کا تعلق۔

۸۔ زر کی ماہیت اور اسکے اصول و مسائل سے مبادلۂ دولت کے تحت میں
مفصل بحث کی جائیگی۔ یہاں صرف زر و سود کا رشتہ واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے
جیسا کہ آئندہ مفصل بحث سے بخوبی روشن ہوگا۔ زر کی تین حیثیتیں ہیں: وہ آلۂ مبادلہ
ہے، معیار قدر ہے، اور تیسرے خزینۃ القدر بھی ہے۔ بالفاظ دیگر زر سے ہر چیز کا مبادلہ

ہوسکتا ہے، اور اسی وجہ سے اسکو بدلے میں لینے سے کوئی انکار نہیں کرتا۔ علاوہ بریں چونکہ زر کا مبادلہ بالکل عام ہے اسکی وساطت سے مختلف چیزوں کی قدر و قیمت کا باہمی مقابلہ ممکن ہے: مثلاً روپے سے ہم غلہ، شکر، نمک، کپڑا، جوتا، غرضکہ دنیا بھر کی چیزیں خرید سکتے ہیں۔ اور اگر غلے کا نرخ چار روپے من اور شکر کا آٹھ روپے اور نمک کا دو روپے من ہو تو قیمت کے مقابلے سے ہم دریافت کر سکتے ہیں کہ دو من غلہ، ایک من شکر اور چار من نمک مساوی القیمت ہیں۔ اور چند در چند آسانیوں کی وجہ سے بجائے دیگر اشیا کے لوگ بالعموم روپیہ ہی پس انداز کرتے ہیں، البتہ اندوختے سے بعد کو اور چیزیں خریدنا اختیاری امر ہے۔ زر کی مذکورۂ بالا تین حیثیتوں سے شرح سود کا بھی تعلق قابل توجہ ہے؛ چونکہ دولت بشکل زر بیشتر پس انداز کیجاتی ہے، اور زر میں یہ خوبی ہے کہ حسب دلخواہ اس کا ہر چیز سے مبادلہ ممکن ہے، اصل کا لین دین بشکل زر ہوتا ہے، اور زر ہی کے حوالے سے فیصدی سالانہ سود شمار کیا جاتا ہے۔ درحقیقت تو اصل سے وہ آلات، عمارات، پیداوار خام وغیرہ مراد ہوتی ہے جو عمل پیدائش میں کام آئے، لیکن حساب کتاب اور علمی مباحث میں اصل ہمیشہ بشکل زر شمار کیا جاتا ہے۔ اور پر ہم یہ بھی سمجھا چکے ہیں کہ سود خالص کی شرح آجکل ہر جگہ کم و بیش مساوی پائی جاتی ہے، اور اصل بشکل سامان شرح مروجہ کے حساب سے اپنی مقدار سود کے مطابق اصل بشکل زر منتقل کیا جا سکتا ہے: مثلاً کسی مشین سے چار روپے خالص سود سالانہ حاصل ہوتا ہے، اب اگر عام شرح ۳ فی صدی ہے تو یہ مشین ۱۳۳ روپے زر اصل کے مساوی شمار ہوگی، اور اگر ۵ فیصدی ہو تو ۸۰ روپے کے برابر۔ ہر ایک اصل خواہ دائر ہو یا قائم، اوّل بوقت شغل اکثر زر ہوتا ہے؛ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ زر چونکہ عام آلۂ مبادلہ ہے، اصل بشکل زر از حد سریع السیر ہے، جہاں موقع ہوتا ہے جا پہنچتا ہے۔ اور شرح سود سطح آب کی مانند ہموار رہتی ہے حتیٰ کہ اصل قائم بھی مساوات شرح کے اثر سے اپنی شکل زر میں بدلتا رہتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اصل یوں تو بکثرت سامان و آلات کی شکل میں موجود ہے لیکن لین دین اور علمی مباحث میں وہ ہمیشہ بلباس زر پیش کیا جاتا ہے۔

زر کی دوسری حیثیت بھی کہ وہ معیار قیمت ہے، شرح سود سے ایک نہایت دلچسپ تعلق رکھتی ہے۔ زر یوں تو عام آلۂ مبادلہ ہے کہ اس سے دنیا کی ہر ایک چیز خرید سکتے ہیں لیکن فی نفسہ زر سے ہماری کوئی احتیاج رفع نہیں ہو سکتی۔ زر کیا

ہے؟ سونے چاندی اور تانبے کے سکّے یا کاغذ کے پرزے کہ جن کو نہ ہم کھا سکتے ہیں، نہ پی سکتے ہیں، نہ اوڑھ پہن سکتے ہیں، نہ جن سے براہ راست ہماری اور کوئی احتیاج پوری ہو سکتی ہے۔ لیکن زر عام آلۂ مبادلہ ہے اور اس سے دنیا کی بیشمار چیزیں خریدی جا سکتی ہیں، جن سے ہماری احتیاجات رفع ہوں۔ پس صاف ظاہر ہے کہ زر محض مبادلے کیواسطے درکار ہے تاکہ حسب ضرورت اس سے ہر چیز خرید لی جائے۔ زر کے مبادلے میں جس قدر کوئی چیز زیادہ یا کم ملیگی، اسی قدر گویا زر کی قدر بھی بحوالہ اس چیز کے بیش یا کم ہوگی؛ مثلاً کسی زمانے میں گیہوں کا نرخ ۱۵ سیر ہو تو ایک روپیہ اس زمانے کے بارہ آنے کے برابر ہے، جبکہ گیہوں ۲۰ سیر فی روپیہ فروخت ہوتے ہوں؛ اور اس زمانے کے ڈیڑھ کے مساوی القدر ہے، جبکہ نرخ ۱۰ سیر ہی ہو۔ زر سے جو بیشمار چیزیں خریدی جاتی ہیں ان کا نرخ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے، لیکن علمی طریق تحقیق ہوا ہے کہ جس سے من حیث المجموع زر کی قدر و قیمت کا اضافہ یا تخفیف قابل اطمینان حد تک دریافت ہو سکتی ہے؛ اسکو انڈکس نمبر کہتے ہیں۔ بخوبی ثابت ہو چکا ہے کہ بحیثیت مجموعی تقریباً ہر ملک میں گرانی بڑھ رہی ہے: یعنی زر کی قدر و قیمت گھٹ رہی ہے اور بمقابلہ سابق کمتر چیز اسکے مبادلے میں ملتی ہے۔ تخفیف قدر کے اسباب کی بحث بہت طویل ہے، ہم یہاں اسے نہیں چھیڑ سکتے؛ صرف اسی تخفیف کا شرح سود پر اثر دکھانا مدنظر ہے۔ زر عام معیار قدر ہے اور معیار ہمیشہ مقرر ہوتا ہے؛ مثلاً گز کہ وہ ۳۶ انچ لمبا ہے، یا من کہ ۴۰ سیر وزنی ہے، لیکن زر ایسا معیار ہے جو خود تغیر پذیر ہے، اور اشیا کی گرانی ارزانی کے مطابق کبھی گھٹکر اپنے ماسبق روپے کا تین چوتھائی یا نصف رہجاتا ہے، کبھی ڈیوڑھا دوگنا ہو جاتا ہے۔ اسکی مثال ایک ایسے گز کی سی ہے جو کبھی سکڑ کر ۲۰، ۲۵ انچ اور کبھی پھیل کر ۴۰، ۵۰ انچ ہوتا ہے۔ فرض کرو کہ کوئی شخص ۵ فیصدی شرح سود سے سال بھر کیواسطے ۱۰۰ روپے قرض لے، اب اگر روپے کی قدر بمقدار ۲۰ فیصدی بڑھ جائے یعنی آخر سال میں سو روپے شروع سال کے ۱۲۰ روپے کے مساوی القدر ہوں تو گویا قرضدار بوقت ادا کرنے قرض و سود، بقدر ۱۰۵ روپے کے درحقیقت ایسے ۱۲۶ روپے ادا کرتا ہے جیسے کہ اس نے قرض لئے تھے: گویا کہ شرح متعارفہ ۵ فیصدی اور شرح صحیحہ ۲۶ فیصدی ہوگی۔ اسکے برعکس اگر روپے کی قدر بیس فی صدی گھٹ جائے یعنی آخر سال کے ۱۰۰ روپے شروع سال کے ۸۰ کے مساوی القدر

رہجائیں تو بوقت ادائی ۱۰۵ روپے وہ درحقیقت ایسے ۴۸ روپے ہوتے ہیں جیسے کہ قرض لیئے تھے: یعنی کہنے کو تو ۵ فیصدی سود ادا کرتا ہے لیکن درحقیقت ۱۲ فیصدی بٹا، گویا بمعاوضہ قرض گیری خود کاٹتا ہے: بالفاظ مختصر زر کی قدر و قیمت تغیر پذیر ہے اور اسکے گھٹنے بڑھنے سے سود کی شرح صحیحہ میں بھی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے؛ چنانچہ واقعہ ہے کہ نصف صدی میں روپے کی قدر گھٹتے گھٹتے بمشکل نصف رہ گئی ہے، اور قدیم قرضخواہوں کو بھی درحقیقت قرض کم و بیش ۵۰ فیصدی مل رہا ہے۔ اگرچہ روپے کی تعداد اب بھی وہی ہے لیکن چونکہ اصلی غایت قدر زر ہے جو قرض دئے ہوئے روپوں کے نصف کے برابر رہ گئی ہے، ایسے قرضوں پر سود ملنا تو درکنار رہا قرضخواہ کو اپنی گرہ سے بٹا دینا پڑتا ہے؛ لیکن واضح ہو کہ زر کی قدر و قیمت میں ایسا بڑا فرق کہیں مدتوں میں نمودار ہوتا ہے۔ مختصر زمانوں میں جن کیواسطے بالعموم قرض دیا لیا جاتا ہے، قدر و قیمت میں کوئی قابل لحاظ تبدیلی نہیں ہوتی۔ چنانچہ تخفیف قدر زر کا واقعہ اور اس کا سود پر اثر عملاً زیادہ اہم نہیں، البتہ اصولاً بہت قابل توجہ ہے ؛

زر کے متعلق یہاں بلحاظ ضرورت جو کچھ بیان کیا گیا ہے اسکی مفصل تشریح زر کے تحت میں ملیگی ؛

سود کا حاضر و مستقبل

۹- آجکل حتی الوسع ہر شخص اپنے اندوختے سے بطور اصل کام لینے کا خواہشمند نظر آتا ہے۔ موجودہ طریق کاروبار نے شغل اصل میں ایسی آسانیاں پیدا کردی ہیں کہ ہر شخص بلا درد سر اپنے اصل سے سود حاصل کرسکتا ہے؛ معتبر بنک میں اندوختہ داخل کردے، یا سرکاری شرح معین سود والے پرامیسری نوٹ اور اسٹاک خریدلے، یا کسی انجمن سرمایہ مشترک کے حصے خریدلے۔ غرضکہ بلا محنت و مشقت اصلدار اپنے سود کی آمدنی سے نہایت عیش و عشرت کی زندگی بسر کررہے ہیں۔ غریب مزدور تو پیٹ پالنے کے لیے دن رات جان کھپاتا ہے، زمیندار کو بھی ریاست کے انتظام میں بہت کچھ تگ و دو کرنی پڑتی ہے، لیکن اکثر اصلداروں کو وقت معینہ پر گورنمنٹ یا بنک یا کارخانوں سے سود وصول کرنا اور چین اڑانا، اسکے سوا اور کام ہی نہیں۔ سیر و سیاحت، شکار و تفریح کے سوا ان کو نہیں معلوم کہ دنیا میں کونسی ہوا چل رہی ہے؛ دوسروں کا اُن کے عیش و بیفکری پر حسد کرنا بالکل قدرتی بات ہے: چنانچہ اصل کے متعلق ایک عام شکایت ہے کہ وہ آمدنی غیر مکتسب کا آلہ بنا ہوا ہے۔

لیکن اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو اس میں اصل کا کوئی قصور نہیں اور نہ سود میں کچھ عیب۔ اصلداروں کی اصلاح کیواسطے ان اسباب کا روکنا ضروری ہے، جنکی بدولت وہ بلا محنت ومشقت بڑی بڑی مقدار دولت کے مالک بن بیٹھے ہیں۔ اگر امریکا والے راک فیلر کی طرح کوئی غریب شخص اپنی سخت محنت اور غیر معمولی قابلیت سے ناجائز طریق اختیار کئے بغیر کروڑپتی کیا بلکہ ارب یا کھرب پتی بن جاوے تو کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے، لیکن غضب تو یہ ہے کہ نہایت ناکارہ لوگ خود ہاتھ پیر ہلائے بغیر باپ دادا کے بڑے بڑے ورثوں کی آمدنی پر ـــ جسکو بذریعہ شغل اصل بطور سود حاصل کرنے سے شاید ہی کوئی دنیا میں آسان کام ہوگا ـــ دن عید اور رات شب برات مناتے ہیں۔ زمیندار بھی اگرچہ ریاست کے انتظام میں کچھ توجہ اور وقت صرف کرتے ہیں، جیسا کہ لگان کی بحث میں واضح کیا جاچکا ہے، لیکن ان کی ملک وجائداد کی آمدنی و قیمت بہت سی عام معاشی ترقیات کی بدولت انکی کوشش بغیر خود بخود دن دونی رات چوگنی ہو رہی ہے۔ یہ لوگ بھی ایسے اضافوں سے روز بروز بلا محنت ومشقت زیادہ دولتمند ہو رہے ہیں۔ مزید برآں بوجہ سہولت شغل اصل کا ان کو بھی شوق پیدا ہو چلا ہے، اور ان کو آمدنی غیر مکتسب کے دو ذرائع حاصل ہیں۔ علاوہ ازیں بطریق اجارہ بھی کاروبار میں اجرت وسود سے زیادہ معاوضہ وصول کیا جا سکتا ہے: گویا وراثت، زمین اور اجارہ، یہی تین طریق ہیں جن سے کافی محنت وکوشش کئے بغیر بڑی بڑی دولتیں افراد کے ہاتھ آجاتی ہیں، پس انکی اس طرح پر اصلاح کرنی چاہیئے کہ تقسیم دولت بہت کچھ مساوی رہے۔ اس وقت نہ لوگوں کے پاس جدا گانہ بہت زیادہ اندوختہ ہوگا، نہ شغل اصل سے موجودہ آمدنی غیر مکتسب اسقدر زیادہ مقدار میں میسر آسکیگی۔ ماحصل غیر مکتسب کے اصلی ذرائع تو مسدود نہ کرنا جن کی وجہ سے لوگ بڑی بڑی دولت کے مالک بن بیٹھے ہیں اور یہ شکایت کرنا کہ دولتمند شغل اصل سے بہت کچھ سود پارہے ہیں نہ اصولاً صحیح ہے نہ عملاً مفید؛

بالفاظ مختصر لوگوں کو بلا مشقت بہت سی دولت رول لینے سے روکنا چاہیئے نہ کہ جو دولت وہ حاصل کرلیں اس کے استعمال سے روکا جائے؛

باب چہاردہم

منافع

(۱) آجر کی کارگزاری (۲) منافع کی ماہیت (۳) شرح منافع

۱۔ اس سے قبل بھی آجر کے کام کا جا بجا ذکر آچکا ہے، یہاں اسی کی تفصیل مقصود ہے۔ ہر سہ عاملین پیدائش کے مالک تین جداگانہ گروہ میں منقسم پائے جاتے ہیں: زمیندار، مزدور اور اصلدار۔ چنانچہ باب اوّل میں واضح ہو چکا ہے کہ ملک عاملین کی اس تقسیم کی بدولت پیداوار میں لگان، اجرت اور سود کی تفریق ضروری معلوم ہوئی۔ بہت کم زمیندار خود کاشت کرنا پسند کرتے ہیں، لگان پر زمین اٹھانے کا طریق مدت سے مروّج ہے؛ غریب مزدور کے پاس آجکل کے کاروبار کے لائق اصل کہاں، اکثر دوسروں کے ہاں اجرت پر کام کرتے ہیں؛ اکثر اندوختے والے چاہتے ہیں کہ کاروبار کے مخمصوں میں پڑے بغیر کسی دوسرے کی معرفت شغل اصل سے سود حاصل کریں۔ زمینداروں کا جداگانہ گروہ تو قدیم سے چلا آتا ہے، لیکن جب سے پیدائش بر پیمانۂ کبیر کا رواج ہوا اور خاص و عام میں اپنے اندوختے سے بطور اصل کام لینے کا شوق بڑھا، مزدور، اصلدار، اور آجر بھی جداگانہ طبقوں میں تقسیم ہو گئے۔ چنانچہ آجر کرائے پر زمین اور سود پر اصل قرض لے کر، اجرت پر مزدوروں سے کام لیتا ہے؛ گویا اپنے اہتمام، نگرانی اور ذمہ داری میں دوسروں سے عاملین پیدائش مستعار لیکر کاروبار جاری کرتا ہے۔ واضح ہو کہ بمقابلہ زراعت کے صنعت و حرفت میں آجر کے کام کی بہت گنجائش ہے اور آخر الذکر شعبۂ پیدائش میں اصل و محنت کے عمل کا غلبہ ہوتا ہے؛ براہ راست زمین اس میں بہت کم حصہ لیتی ہے: لہٰذا آجر کا کام بالخصوص قابل لحاظ حصۂ اصل و محنت کو یکجا کرنا ہے۔ مزدوروں سے اجرت پر کام لیئے بغیر تو کوئی چارہ نہیں، آجر اپنی ذات سے

حصہ سوم
باب چہارم

کل کاروبار کیونکر چلا سکتا ہے؟ البتہ یہ ممکن ہے کہ زمین اور اصل یا انکے کسی حصے کا خود مالک ہو، لیکن انکے ذاتی ملک ہونے سے آجر کی حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا: بالفاظ مختصر آجر کا کام عاملین یکجا کر کے دولت پیدا کرنا ہے، خواہ خود مالک زمین ہو اور اپنی گرہ سے اصل لگائے، یا دوسروں سے مستعار لے۔ لیکن مزدوروں سے بہر صورت اجرت پر کام لیتا ہے، اور خاص اسی وجہ سے آجر کہلاتا ہے۔ چونکہ ہر عامل پیدائش ایک جداگانہ گروہ کے ہاتھ میں جا پڑا ہے، اور مالک خود کام لینے سے یا تو جان چراتے ہیں یا معذور ہیں، اس لیئے عاملین یکجا کر کے دولت پیدا کرنے کا کام خاص طور پر ایک جداگانہ گروہ کے سپرد کرنا پڑا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ معاشی ترقیات کی بدولت پیدائش کا کام اسقدر دشوار اور تخصیص طلب ہو گیا ہے کہ اس میدان میں اچھے اچھے ٹھوکریں کھاتے اور راستہ بھولتے ہیں۔ اول تو یہ پیدائش بر پیمانہ کبیر کا زمانہ ہے، صدہا بلکہ ہزارہا مزدور، اور لاکھوں کروروں روپے، قیمتی اصل کا اہتمام، نگرانی کیا کوئی آسان کام ہے؟ ذرا تفصیل پر غور کیجیئے تو قدم قدم پر بیحد ہوشیاری، خبرداری، وقت شناسی، ذہنی مستعدی اور استقلال کی ضرورت نظر آئیگی۔ آجر کو کاروبار کا کپتان کہتے ہیں، اور تشبیہ ازحد موزوں اور درست ہے؛ لڑتی تو فوج ہی ہے لیکن فتح و نصرت کا دارومدار بیشتر جنرل کی عاقلانہ ترکیب اور مناسب چالوں پر ہوتا ہے۔ عمدہ افسر جن بہادر سپاہیوں سے بڑے بڑے فتوحات پاتے ہیں، ناقابل افسر انھیں بیکار کٹوا کر ہزیمت اٹھاتے ہیں؛ ایسی مثالوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ خالد بن ولید، صلاح الدین اور نپولین کا نام جنگی دنیا میں کیوں روشن ہے؟ سپاہی تو ان کے بھی ایسے ہی تھے جیسے کہ بہت سے پیش رفتہ اور پس آئندہ سپہ سالاروں کے، لیکن کام ان سے وہ وہ لیے گئے کہ دنیا آج تک مداح اور حیران ہے۔ یہی حال آجکل کاروبار کا ہے! یوں تو سینکڑوں مزدور اور ملازمین شریک کار ہوتے ہیں، لیکن کامیابی اور سرسبزی ایک ہی دو نگران کار کی قابلیت پر منحصر ہوتی ہے؛ چاہے انکی ذرا سی غلطی اور لغزش سب کی کوشش خاک میں ملادے، چاہے ان کی پیش بینی اور عاقلانہ کوشش کاروبار کو آسمان پر چڑھا دے۔ دوسرے مزدور اور اصل کی نگرانی کیا ادنیٰ کام ہے؟ وسیع الاثر معاشی تغیرات کا بغور مطالعہ کرنا، اقتضائے وقت کو پہلے سے تاڑنا، اور اس کا ساتھ دینا، نہ صرف مروجہ ضروریات بہم پہنچانا، بلکہ نت نئے

اختراع وایجاد سے جدید ضروریات رائج کرنا، عمدگی تنظیم، اور سائینس کی تحقیقات، اور عام معلومات، سے مدد لیکر مصارف پیدائش میں کفایات داخلی وخارجی نکالنا، نرخ گھٹاکر خریدار بڑھانا، یا مروجہ نرخ سے اعلیٰ منافع اٹھانا، غرضکہ ہروقت نہایت باخبر اور مستعد رہنا، اور حریف کارخانوں سے دوڑ میں آگے بڑھنے کی کوشش برابر جاری رکھنا، کیسے کیسے دشوار کام آجر کے ذمے آپڑے ہیں! یہ جو یورپ اور امریکا کے کارخانوں اور کاروبار نے دنیا پر تسلط کر رکھا ہے، کیا یہ محض حسن اتفاق کا نتیجہ ہے؟ نہیں، بلکہ علاوہ چند در چند معاشی اسباب کے آجروں کی کوشش بھی اس عالمگیر کامیابی کا خاص اور بہت بڑا باعث ہے۔ حتیٰ کہ چند مشہور بنکوں اور کارخانوں کے ڈائرکٹر اور منیجر بلحاظ کارگزاری و ذمہ داری اعلیٰ سے اعلیٰ سلطنت کے وزیر اعظم اور پریسیڈنٹ کے ہم پلہ مانے جاتے ہیں۔ انگلستان کی وزارت اور بنک آف انگلینڈ کی ڈائرکٹری ان دونوں عہدوں میں کون زیادہ اہم ہے؟ اس پر اب تک اختلاف رائے موجود ہے۔ کسی گروہ، طبقے کے کل افراد کی حالت یکساں نہیں ہوسکتی، علیٰ ہذا یہ کس طرح سے ممکن ہے کہ تمام آجر ایسی ہی عظیم الشان کارگزاریاں دکھا سکیں، یہ تو معدودے چندہی کا حصہ ہے۔ لیکن اس سے انکار نہیں ہوسکتا ہے کہ اپنی اپنی حیثیت کے موافق وہ ایک خاص قسم کا ضروری کام سرانجام دے رہے ہیں، جس میں قابلیت درکار ہے۔ گو یہ کام فی نفسہ ایک قسم کی محنت ہے لیکن بوجوہ مذکورۂ بالا اسقدر اہم اور ممیز ہوگیا ہے کہ عمل پیدائش دولت کا چوتھا جزو شمار ہوکر تنظیم کے جداگانہ نام سے موسوم ہوا۔

ٹھیٹ آجر تو وہی ہے جو ہر سہ عاملین یکجا جمع کرکے دولت پیدا کرے۔ لیکن تاجر، بنکوں کے ڈائرکٹر وغیرہ، ایسے لوگ جو کسی کاروبار کے نگران ہوں، اسی زمرے میں شمار کئے جاتے ہیں، کیونکہ ان کے کام بھی مذکور الصدر تنظیم کی صرف مختلف شکلیں ہیں۔ یہاں یہ نکتہ بیان کردینا نہایت ضروری ہے کہ آجر کہلانے کے واسطے نہ صرف کاروبار کی نگرانی بلکہ براہ راست ذاتی نفع نقصان کا تعلق بھی لازمی ہے؛ بالفاظ دیگر اگر کوئی تنخواہ دار منیجر کاروبار کا نگران ہو تو وہ آجر نہیں شمار ہوسکتا۔ کیونکہ اگرچہ بحیثیت ملازم وہ بھی جوابدہ ہے اور کاروبار کی سرسبزی وتباہی کا اسکے مالی مفاد پر اثر ضرور پڑتا ہے؛ لیکن اس کی ذمہ داری اور تعلق اتنا قوی اور قریبی نہیں ہے جتنا

حصہ سوم
باب چہارم

اس وقت ہوتا جبکہ وہ خود اپنی طرف سے کاروبار جاری کرتا اور اس کا خود نگران بنتا۔ بحالت اول صرف تنزل یا زیادہ سے زیادہ ترک ملازمت کا اندیشہ ہو سکتا ہے، لیکن بحالت دوم کاروبار کے کل نفع ونقصان کا اثر براہ راست اسکی ذاتی حالت پر پڑتا ہے: چنانچہ یہی وجہ ہے جیسا کہ تجربہ شاہد ہے کہ کسی کارخانے اور کاروبار کے تنخواہ دار ملازم اور منیجر اسقدر توجہ اور تندہی سے نگرانی نہیں کرسکتے جتنا کہ خود مالک کرتا ہے ؛

حاصل کلام یہ کہ آجر سے مراد وہ لوگ ہیں جو عاملین پیدائش کو یکجا کرکے اپنی ذاتی نگرانی اور ذمہ داری میں ان سے دولت پیدا کریں۔ آجکل اکثر آجر زمین و اصل، دوسروں سے کسی معاوضے پر مستعار لے لیتے ہیں اور بعض خود ہی انکے مالک ہوتے ہیں۔ آخر الذکر قسم کے آجر تو زمانۂ قدیم میں بھی موجود تھے لیکن پیدائش بر پیمانہ کبیر، شغل اصل کے رواج، اور عام معاشی ترقیات کی بدولت، اول الذکر قسم کے آجروں کا گروہ اور اقتدار بہت بڑھ گیا ہے۔ اور چونکہ یہ نہ زمیندار ہوتے ہیں نہ محض مزدور، نہ اصلدار، اور پھر بھی پیدائش دولت کیواسطے انکا کام وسیع حد تک ناگزیر سا ہوگیا ہے، لہذا عاملین کے مالکوں سے انکا بحیثیت عاملین سے کام لینے والوں کے ایک جدا طبقہ بن گیا ہے اور انکا حاصل زائد بھی ایک خاص نام یعنی منافع سے تعبیر کیا جاتا ہے ؛

لیکن چند روز سے آجروں کا حلقۂ عمل پھر تنگ ہوتا جاتا ہے، خصوصاً جب سے انجمن سرمایۂ مشترک اور شراکت کا رواج پھیلا کاروبار کے اہتمام اور نگرانی میں تنخواہ دار منیجر آجروں کے قائم مقام بنتے جاتے ہیں؛ علاوہ بریں مشین کا استعمال جسقدر بڑھ رہا ہے، بہ نسبت سابق نگرانی کی ضرورت بھی گھٹتی جاتی ہے۔ جو کاروبار کمال کو پہنچ چکے ہیں اور جن کے چلانے کے طرز وطریق مقرر سے ہوگئے ہیں، وہ تنخواہ دار منیجر کے بھی سپرد کئے جاسکتے ہیں؛ لیکن جن کاموں میں جدت، جرأت اور جانکاہی کی ضرورت ہے وہ آجر کے ہاتھ ہی سے سرسبز ہو سکتے ہیں۔ آجکل بھی آجر و تنخواہ دار منیجر کے درمیان کام تقسیم کرنے میں اسی اصول پر عملدرآمد ہو رہا ہے ؛

منافع کی ماہیت

۲۔ تقسیم دولت کے دیگر مباحث کی مانند منافع کا مسئلہ بھی کچھ کم معرکۃ الآرا اور پیچیدہ نہیں۔ اول تو خود اس کا مفہوم غیر معین، دوم اس کے اسباب تحقیق کرنے پر

اب تک معدودے چند لوگوں نے توجہ کی ہے۔ اور ایسے مسائل کی لازمی وقت ان کے عدم تعین کی خاصیت ہوتی ہے، انکے متعلق جو کچھ بیان کیا جائے زیادہ سے زیادہ وہ تقریباً صحیح ہوسکتا ہے، کوئی بات قطعی طور پر کہنی محال ہے؛ ایسی صورت میں جسقدر اختلاف رائے ہو کم ہے۔ مستند تصانیف کے مطالعے اور ذاتی غور و خوص کے بعد منافع کی جو تشریح سب سے زیادہ اصولاً قرین عقل اور تشفی بخش نظر آئی وہ بیان کی جاتی ہے:۔

منافع کا مفہوم اول ایک مثال سے واضح کرکے بعدۂ اسکے اسباب دریافت کرنیکی کوشش کرینگے۔ فرض کرو کہ کسی کارخانے کے سالانہ آمد و خرچ کا حساب حسب ذیل ہے:۔

		روپیہ
قیمت پیداوار		۵۰۰۰۰
مصارف پیدائش: قیمت اشیائے خام مستعملہ	۲۵۰۰۰	
اجرت مزدوراں	۹۰۰۰	
اصل مستعار کا سود	۴۰۰۰	
اگر دوسرے کی زمین ہے تو اسکا کرایہ جو معاشی لگان سے زائد ہو	۲۰۰۰	
دوسروں کی رقمیں جو حسب تفصیل بالا اپنی جیب سے دی گئیں		۴۰۰۰۰
منافع خام		
اجرت تنظیم	۴۰۰۰	
کچھ ذاتی اصل ہے جس کا سود	۳۰۰۰	
کچھ زمین ذاتی ہے جس کا کرایہ زائد از معاشی لگان	۱۰۰۰	
اصل قائم کے مطالبات فرسودگی و خطر	۱۰۰۰	
جو رقمیں حسب تفصیل بالا اپنی جیب میں رہیں		۹۰۰۰
منافع خالص		۱۰۰۰

اس مثال میں بغرض جامعیت وہ تمام مدیں دکھائی گئی ہیں جو منافع کی بحث میں قابل توجہ ہوسکتی ہیں، لیکن ہر ایک کارخانے کے حساب میں ان سب مدوں کی موجودگی لازمی نہیں۔ فرض کرو کہ کسی آجر کے پاس نہ ذاتی اصل ہو نہ زمین یعنی

دونوں مستعار ہے، تو منافع خام میں سے صرف اجرت تنظیم اور اصل قائم کے مطالبات فرسودگی و خطر منہا کرنے کے بعد جو بچے وہ منافع خالص ہوگا۔ اسی طرح پر اگر کوئی آجر نہ سود پر اصل مستعار لے نہ کرائے پر زمین: یعنی دونوں اسکے ذاتی ہوں، تو قیمت اشیائے خام و اجرت مزدوراں منہا کرنے کے بعد جو بچے وہ منافع خام ہوگا۔ اجرت، سود اور کرایۂ زمین، مصارف پیدائش کی ان تین مدوں کو دو دو جزو میں منقسم کر کے ایک ایک کو منافع خام سے خارج اور باقی کو شامل شمار کرنے کی وجہ، ایک تو حساب کتاب کی سہولت ہے، جو اجرت، سود یا کرایہ دوسروں کو ادا کرنا پڑتا ہے، وہ تو مصارف پیدائش میں جداگانہ شمار کیا جاتا ہے؛ لیکن جو اپنی ہی جیب میں رہتا ہے، اسکی ایسی باقاعدہ تفریق غیر ضروری سمجھ کر لوگ اس کو منافع شمار کر لیتے ہیں۔ مطالبات فرسودگی و خطر اگرچہ مصارف پیدائش کے ضروری اجزو ہیں لیکن جبتک وہ آجر کی جیب سے نہیں نکلتے، منافع میں ملے جلے رہتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہ ہوگا کہ منافع خام محض رواج کا نتیجہ ہے۔ علمی لحاظ سے اس کا کوئی وجود نہیں: اول تو منافع خام کے دو جزو، یعنی اجرت تنظیم اور ذاتی اصل کے سود کا موازنہ، اس اجرت و سود سے جو خارج از منافع ہے، علمی غرض سے ضروری ہے؛ دوم منافع خام کاروباری مقابلے کا ایک کارگر آلہ ہے، جس کی ہم ابھی مختصر تشریح کریں گے:۔

اول اجرت تنظیم کو لیجئے! بحیثیت ملازم دوسرے کے کاروبار کی نگرانی و اہتمام میں اسقدر تندہی و ذمہ داری درکار نہیں جتنی کہ ذاتی کاموں میں۔ چنانچہ واقعہ ہے کہ آجر اپنے کاروبار کی ترقی میں جسقدر جانفشانی کرتا ہے، تنخواہ دار منیجر ہرگز نہیں کر سکتا۔ ایسی محنت و ذمہ داری سے بچنے کے لیے اکثر لوگ کمتر شرح معین پر اپنا اصل قرض دیدینا، اور دوسرے کارخانوں کی ملازمت کو آجر بننے کے مقابلے میں زیادہ پسند کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ منیجر کو جو تنخواہ دینی پڑے، یا جو تنخواہ خود آجر کو کسی دوسرے کارخانے میں بحیثیت منیجر مل سکے، اس سے غالباً کچھ زیادہ اجرت تنظیم کے طور پر آجر وصول کرنے کی کوشش کریگا۔ یہی حال سود کا ہے: دوسروں کو اصل قرض دیکر اصل دار سود بشرح معین اطمینان سے وصول کر سکتا تھا۔ لیکن اپنے کاروبار میں لگانے سے اسکے سود کی شرح ہمیشہ غیر معین رہتی ہے؛ کبھی معمول سے زیادہ ملا تو کبھی کچھ نہیں۔ ایسی غیر اطمینانی حالت میں آجر مطالبات ضمانت کے

اصل لگانا بغیر جن سے قلت مقدار سود کی تلافی ہوتی رہنا یقینی ہو، بطور خود کاروبار میں
ہرگز پسند نہ کریگا، اور بشرح معین سود پہ دوسروں کو قرض دینا ہزار درجہ غنیمت
سمجھیگا؛ لہٰذا ذاتی اصل کے سود کی شرح بھی بازاری شرح سے بقدر مطالبات
ضمانت زیادہ مطلوب ہوگی۔ البتہ ذاتی زمین کے کرائے میں کوئی بیشی ضروری نہیں
اور اصل ذاتی و مستعار کے مطالبات فرسودگی و خطر بھی یکساں ہونگے ؛

واضح ہو کہ اس بحث میں یہ لازم نہیں آتا کہ آجر کو ہمیشہ اجرت تنظیم اور ذاتی
اصل کا سود بشرح اعلیٰ ہی ملتا ہے۔ بلکہ ایسا ہونا عجب نہیں کہ کاروبار جاری کرنے
کے بعد ناموافق تغیرات کی بدولت معمولی شرح سے بھی کم وصول ہو! یہ آجر کی
بڑی بدقسمتی ہوگی، لیکن وہ اکثر بے بس ہوجاتا ہے۔ فرض کرو کہ آجر ہزارہا بلکہ لاکھوں
روپے عمارت اور مشین میں لگاکر کارخانہ جاری کرے اور حالات نامساعد اسکے
کاروبار پر محیط ہوجائیں۔ اب اگر وہ کاروبار بالکل بند کردے تو جو کچھ منافع ملتا
ہے وہ بھی نہ ملیگا اور سراسر نقصان ہوگا، اور اگر کاروبار فروخت کرے تو بحالت
موجودہ قیمت نہایت ادنیٰ اٹھیگی؛ لہٰذا کچھ مجبور ہوکر اور کچھ آئندہ اصلاح کی امید
پر وہ کاروبار جاری رکھیگا اور بمصداق "گندم اگر بہم نرسد جو غنیمت است"
تھوڑا بہت منافع جو کچھ بھی ملیگا، اسی پر قناعت کریگا۔ یہاں یہ نکتہ سمجھنا ضروری
ہے کہ اگر آجر کے کاروبار میں منافع کی گنجائش ہی بہت کم ہو یعنی زمین اور کل اصل
مستعار ہو تو کساد بازاری کا وہ بہت کم متحمل ہوسکیگا اور جلد تباہ ہوجائیگا۔ پس
جبکہ عملاً منافع میں شرح اجرت و سود اسقدر تغیر پذیر ہو تو پھر ایسی شرح کا بازاری
شرح سے اعلیٰ ہونا کیونکر ضروری بتایا جاتا ہے؟ اس سے صرف یہ جتانا مقصود ہے
کہ کن وجوہ پر کاروبار جاری کرتے وقت آجر لازماً اعلیٰ شرح کی امید باندھتا ہے
اور بحالت کامیابی کس بنا پر اپنے آپ کو اعلیٰ شرح کا مستحق قرار دے سکتا ہے ؛

منافع خام کو مقابلے کا آلہ اس وجہ سے کہا گیا کہ چونکہ وہ آجر کی جیب میں
جاتا ہے اور کسی دوسرے کو ادا نہیں کیا جاتا؛ چند روز اس سے دست بردار ہوکر
ایسے حریف کو میدان مقابلہ سے بھگانا دشوار نہیں کہ جس کو منافع خام کا کچھ سہارا
نہ ہو، اور کل مصارف پیدائش اسکو جیب سے نقد ادا کرنے پڑیں۔ لیکن صاف ظاہر

ہے کہ منافع خام بھی عرصے تک مقابلے کے بار کا متحمل نہیں ہو سکتا، زیادہ سے زیادہ ایک آدھ برس تک، تو تلافی یا استقبال کی امید پر منافع خام کو کوئی صبر کر سکتا ہے؛ لیکن یہ کیونکر ممکن ہے کہ سالہا سال کیواسطے کوئی اس سے ہاتھ دھو بیٹھے، اس کا نتیجہ تو سراسر تباہی ہوگا۔ مقابلہ جاری رکھ سکنے کی مدت کا دار و مدار بار مقابلہ اور مقدار منافع کی باہمی نسبت پر منحصر ہے، اگر مقابلے میں کم نقصان اٹھانا پڑے اور مقدار منافع خام کثیر ہو تو زیادہ عرصے تک مقابلہ جاری رکھا جا سکتا ہے؛ ورنہ اس کا جلد خاتمہ کرنا ناگزیر ہوگا۔ لیکن واضح ہو کہ ایسے مقابلے کا منشا ہمیشہ حریف کی تباہی ہوتا ہے، دوران مقابلہ میں تخفیف نرخ سے خریداروں کو جو کچھ نفع ہو مقابلہ ختم ہونیکے بعد ممکن ہے کہ فتحیاب کارخانہ کچھ اجارے کے زعم میں جسکی وجہ سے مقابلہ کیا گیا، اور کچھ نقصان مقابلہ کی تلافی کرنے کیواسطے نرخ بڑھا کر خریداروں سے کل منافع تلف شدہ مع سود دام دام وصول کرلے۔ مقابلے اور اجارے سے ہم مبادلۂ دولت کے تحت میں مفصل بحث کرینگے، اسوقت منافع خام کا جداگانہ وجود تسلیم کرنے کی عملی سہولت اور علمی ضرورت واضح کرنے کے بعد منافع خالص پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں ؛

جبکہ منافع خام کی مقدار غیر معین ہو، اور اس میں بیحد تخفیف ہو سکتی ہو تو منافع خالص کا ملنا معلوم! چنانچہ اکثر معاشیئین کا خیال ہے کہ مقابلے کے دباؤ سے نرخ گھٹتے گھٹتے مصارف پیدائش کے برابر آ چکا ہے، اور منافع خالص کی عام شرح صفر ہے۔ لیکن علمی لحاظ سے یہ سوال نہایت قابل توجہ ہے کہ منافع خالص اگر کبھی نمودار ہو تو اول اس کے کیا اسباب ہو سکتے ہیں، دوم کن کن حالتوں میں وہ آجر کو ہاتھ آتا ہے اور کب اس کے ہاتھ سے نکل جاتا ہے؟

تعیین شرح اجرت و سود کی بحث میں اس سے قبل بالتفصیل سمجھایا جا چکا ہے کہ ہر دو شرح محنت و اصل کے جزءِ مختتم کی پیداوار کے مساوی ہوتی ہیں؛ جس سے صاف ظاہر ہے کہ جزءِ مختتم کے کل ماسبق جزءوں کی پیداوار سے آجر کو کچھ حاصل زائد ضرور ملتا ہے۔ اور اس واقعے کی اس سے قبل لگان اجرت و سود کے تحت میں متواتر تشریح ہو چکی ہے، جس کا اعادہ یہاں محض طوالت ہوگا۔ منافع خالص کی یہ مد تو کم و بیش جائز مانی جاتی ہے کیونکہ یہ ماحصل زائد تنظیم آجر کی بدولت پیدائش بر پیمانہ کبیر سے حاصل ہوتا

ہے! اگر تنظیم نہ ہو اور مزدور جدا جدا بطور خود کام کریں تو غالباً یہ ماحصل زائد پیدا ہی نہ ہو؛ بلکہ اگر موجودہ شرح سے بھی اجرت کم پڑے تو عجب نہیں۔ البتہ اگر مزدور خود مل جل کر کاروبار چلائیں، جیسا کہ شراکت کے عنوان سے اجرت کے بیان میں واضح کیا جا چکا ہے تو یہ منافع پیدا ہوگا اور خود انھی کی جیب میں رہیگا۔ لیکن بحالت موجودہ آجر ناگزیر ہے اور اس لئے اگر وہ مذکورہ بالا منافع خود اپنے ڈب میں رکھے تو چارہ نہیں؛ اور اگر بطریق شراکت منافع کچھ مزدوروں کو بھی دے تو اس کا ہزار احسان اور لاکھ شکریہ! لیکن اگر آجر مزدوروں کی تہی دستی، غفلت و نااتفاقی، اور اپنے قابو سے ناجائز فائدہ اٹھا کر شرح اجرت محنت کی پیداوار مختتم سے بھی گھٹا دے تو ایسا منافع میں جو اضافہ ہو وہ سراسر بیجا ہوگا۔ اجرت میں اضافہ یا تخفیف جس پر مزدوروں یعنی نسل انسان کی سب سے بڑی جماعت کی حیات و ترقی کا دارومدار ہے، از حد قابل توجہ ہے۔ اگر شرح اجرت پیداوار مختتم کی پابند ہے اور اس پابندی میں ایک عملی سہولت ضرور ہے تو آجر کو چاہیئے کہ شرح اجرت میں تخفیف کرنے کے بجائے محنت کے ماحصل زائد کا ایک جزو اپنی طرف سے مزدوروں میں تقسیم کر دے۔ چنانچہ شرکت منافع کے تحت میں اس تجویز کی تفصیل کی جا چکی ہے، اور کہیں کہیں تجربتاً اس پر عملدرآمد بھی ہو رہا ہے؛ اور آجر و مزدور دونو کے حق میں مفید ثابت ہوا ہے۔ رہی شرح سود وہ بھی اصل کی پیداوار مختتم کے مساوی ہوتی ہے، لیکن اگر اس سے بھی کم ہو سکے تو ایسی تخفیف صرف اضافۂ اصل کی رفتار گھٹانے کی وجہ سے قابل توجہ ہے اور بس۔ مزید براں واقعات شاہد ہیں کہ معاشی ترقیات کے ساتھ ساتھ پس اندازی کی قابلیت و عادت بڑھنے سے اصل کا اضافہ سود کے لالچ سے روز بروز مستغنی ہوتا جاتا ہے۔ گویا تخفیف اجرت کے برعکس تخفیف شرح سود سے کسی بڑی مضرت کا اندیشہ نہیں؛ اور منافع خالص کا جو حصہ پیداوار اصل کے ماحصل زائد سے مرکب ہو وہ معاشی لحاظ سے قطعاً بے ضرر اور ناقابل اعتراض ہے ؛

اوپر کی کل بحث سے مترشح ہوتا ہے کہ ہم کاروباری دنیا میں دیرپا سکون فرض کر کے تمام اسباب زیر بحث متعین قرار دے رہے ہیں۔ اسکی دو وجہیں ہیں:۔ اول تو ایسے مفروضات کے بغیر کسی معاشی مسئلے کی تحقیق محال ہے، دوم کاروبار کے روزانہ ماہانہ اور سالانہ تغیرات نظرانداز کر کے جب ہم کسی طویل زمانے مثلاً چالیس پچاس سال

پر نظر ڈالتے ہیں تو کسی حد تک سکونِ تعیّن کے مفروضات ضرور قرین حقیقت معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جلد جلد جو تغیرات ہوتے رہتے ہیں، وہ بھی اپنا اثر کیے بغیر نہیں رہتے؛ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ خلاف اُمید کبھی کاروبار کی حالت ایسی ابتر ہو جاتی ہے کہ منافع خام تک غائب ہو جاتا ہے؛ اور کبھی گرم بازاری کا یہ زور بندھتا ہے کہ منافع خام سے بڑھکر منافع خالص نمودار ہونے لگتا ہے۔

اب یہ سوال باقی ہے کہ منافع خالص اگر نمودار بھی ہو تو آجر کے ہاتھ کب آسکتا ہے؟ اس وقت جبکہ آجر کو کسی نہ کسی شکل پر اجارہ حاصل ہو یعنی صرف وہی، یا چند اور آجر بھی، کوئی کاروبار چلائیں، لیکن باہمی اتفاق سے پیداوار کی حسب دلخواہ قیمت مقرر کریں! ایسی حالت میں مصارف پیدائش کی کل مدیں قیمت میں شامل کر کے اصل و محنت کی پیداوار کا ماحصل زائد یعنی منافع خالص بچا سکیں گے۔ بلکہ مصارف پیدائش سے بھی قیمت بڑھا کر اگر منافع خالص میں اضافہ کر لیں تو عجب نہیں۔ لیکن واضح ہو کہ ایسا اضافہ از حد مذموم اور عوام کے حق میں مضر ہو گا۔ بیش قیمت تنعمات کے سوا جنکی خریدار دولتمندوں کی مختصر جماعت ہوتی ہے، مایحتاج زندگی کی ارزانی و گرانی کا اثر کل لوگوں پر پڑتا ہے جنکی تعداد کثیر مزدوری پیشہ ہے، اور جن میں سے اکثر غریب اور بہت سے متوسط الحال ہیں! پس آجروں کا باہمی اتفاق کر کے اضافہ و منافع کی ہوس میں بیجا طور پر مصارف پیدائش سے زیادہ قیمت بڑھانا جبر و تعدی نہیں تو اور کیا ہے؟ بہرحال اگر بیشی قیمت سے منافع میں ایسا اضافہ نہ بھی کیا جاوے تو بحالت اجارہ منافع خالص جو اصل و محنت کی پیداوار کے ماحصل زائد سے نمودار ہو بآسانی اپنی جیب میں رکھا جا سکتا ہے۔ اسکے برعکس اگر آجروں میں مقابلہ ہو تو ہر ایک اپنے کارخانے کی بکری بڑھانے اور حریف کو زک دینے کی غرض سے قیمت میں یہاں تک تخفیف کریگا کہ اگر منافع خالص نمودار ہوا بھی ہو گا تو تخفیف کی نذر ہو جائیگا، اور قیمت مصارف پیدائش کی سطح پر آرہیگی۔ آجر منافع خام پر قناعت کریگا، بلکہ مقابلے کے جوش میں بخوشی اسے بھی تخفیف کے ریلے میں بہادے تو عجب نہیں۔ چونکہ آجکل مقابلے کا زور شور خیال کیا جاتا ہے، لہذا شرح منافع خالص محض صفر قرار دی جاتی ہے۔

المختصر منافع کا مفہوم، اس کی دو قسمیں، اور منافع خالص نمودار ہونے اور آجر کے

قبضے میں آنیکی صورتیں، یہ سب نکات حتی الوسع سلیس طور پر واضح کرنیکی کوشش کیگئی ہے، لیکن فی نفسہٖ منافع کے مفہوم اور ماہیت پر اسقدر جزوی اختلاف رائے پھیلا ہوا ہے کہ بتدی حیران رہجاتا ہے۔

شرح منافع

۳ - اگرچہ اصل مستعار کا سود منافع سے خارج ہوتا ہے، لیکن عام قاعدہ ہے کہ منافع کی شرح اس کل اصل کی نسبت سے شمار کی جاتی ہے جو کاروبار میں صرف ہو، خواہ وہ اصل مستعار ہو، یا ذاتی، یا ہر دو قسم کا: مثلاً اگر اصل کی مقدار ایک لاکھ ہو اور منافع کی پانچ ہزار تو شرح منافع ۵ فیصدی شمار ہوگا- ذاتی اصل و زمین کا سود اور کرایہ اور اجرت تنظیم تو ایک خاص شرح سے تجاوز نہیں کر سکتی، منافع خالص کی بھی ایک حد ہے- یہ جو کاروبار میں ایک بلکہ نصف فی صدی سے لیکر سو اور دو سو فی صدی تک شرح منافع میں حیرت انگیز فرق پایا جاتا ہے، اسکے درحقیقت دو باعث ہیں: اول اجرت تنظیم اور مقدار اصل کی باہمی نسبت، دوم اصل کا مستعار نہ ہونا- فرض کرو کہ ایک شخص بذریعہ ملازمت سو روپے ماہوار کما سکتا ہے، اب اگر وہ بشرط امکان کوئی ایسا کاروبار جاری کرے کہ جس میں ہزار روپے سالانہ سے زیادہ شغل اصل کی گنجائش ہی نہ ہو، تو ظاہر ہے کہ جب اس کا گزارہ اسی کاروبار پر ٹھیرا تو علاوہ سود اصل وہ سو روپے ماہوار کی بچت بھی اسی کاروبار کے منافع سے نکالیگا؛ اس حالت میں سود کے علاوہ صرف اجرت تنظیم کی شرح اصل کی نسبت سے ۱۲۰ فیصدی پڑیگی- اب اگر شرح سود ۵ فیصدی ہو اور اصل ذاتی ہو تو شرح منافع ۱۲۵ فیصدی ہو جائیگی، اور اگر اصل مستعار ہے تو سود منافع میں شمار نہ ہوگا اور شرح منافع ۱۲۰ برقرار رہیگی، اور اگر کچھ منافع خالص ہو تو اسکے شامل ہونیکے بعد منافع خام کی شرح اور بھی بڑھ جائیگی- مشہور بات ہے کہ قصبات کے بساطی، عطار، تنبولی اور پنساری ایسے دکاندار جو صبح سے شام تک دو دو چار چار پیسے کا پھٹکل سودا فروخت کرکے بمشکل چند روپے روز کا کاروبار چلاتے ہیں، تھوک فروشی کے نرخ کے مقابلے میں بھی بہت زیادہ قیمت وصول کرتے ہیں؛ اور کہنے کو شرح منافع بھی بہت اعلیٰ پاتے ہیں- لیکن ایسا ہونا نہ کچھ عجیب نہ کاروبار والوں کے حق میں خاص طور پر مفید؛ انکو درحقیقت منافع کی مجموعی مقدار سے غرض ہے، شرح خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو- اور اوپر کی مثال سے صاف ظاہر ہے کہ باوجود شرح اسقدر اعلیٰ ہونے کے مقدار منافع معمول سے زیادہ نہیں

ہوتی۔ اب یہ سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ حلوائی، نان بائی، بقال ایسے خردہ فروشوں کی دکانیں، اگر ضرورت سے زیادہ بڑھ جائیں تو ہر ایک دکان کی مقدار فروخت گھٹنے سے نرخ اشیاء بڑھ جاویگا، اور باوجود اضافہ شرح اگر مقدار منافع میں تخفیف ہو جائے تو عجب نہیں۔ دکانداروں کے باہمی مقابلے کا نتیجہ بالعموم تو تخفیف نرخ ہوتا ہے لیکن بعض صورتوں میں خود مقابلہ اضافہ نرخ کا باعث بن جاتا ہے۔ مقابلے کے اس خلاف توقع خاصے سے ہم مبادلۂ دولت کے تحت میں مفصل بحث کرینگے۔ جو چیزیں قیمتی ہوں اور بآسانی عقوک فروشوں سے منگائی جا سکیں، انکی قیمت میں تو اضافہ دشوار ہے اور نہ ایسی چیزوں کی تجارت میں خردہ فروشی سرسبز ہو سکتی ہے؛ لیکن جو چیزیں کم قیمت ہوں یا بآسانی باہر سے نہ منگائی جا سکیں، انکی تجارت میں چھوٹے چھوٹے دکانداروں کی بن آتی ہے۔ خریدار یا تو بوجہ قلت مقدار اضافۂ قیمت کی پروا نہیں کرتے یا بوجہ مجبوری اس کو گوارا کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں خردہ فروشوں کی دکانیں جسقدر بڑھیں گی قیمت بھی چڑھیگی۔ اور گو فرداً فرداً بوجہ قلت مقدار اضافہ محسوس نہ ہو لیکن بحیثیت مجموعی خریدار ضرور زیربار ہونگے۔ اس توضیح کی روشنی میں اب صاف معلوم ہو جائیگا کہ بعض تجارتوں میں خردہ فروشی اسقدر کیوں مروج ہے اور بعض میں بہت کم، اور کسی کاروبار میں ضرورت سے زیادہ لوگوں کی شرکت کس طرح پر شرکا اور عوام دونوں کے حق میں یکساں مضر ہے۔

مذکور الصدر مثال کے مقابلے میں فرض کرو جو شخص سو روپے ماہوار کی ملازمت پا سکتا ہے، ایسا کاروبار جاری کرے کہ جس میں ۲۴ ہزار روپے سالانہ شغل اصل کی گنجائش ہو، اس میں بھی وہ سو روپے ماہوار کاروبار کے منافع میں سے نکالیگا، لیکن اسی اجرت تنظیم کی شرح اصل کی نسبت سے مثال اول الذکر میں ۲۰ فی صدی قرار پائی تھی اور یہاں صرف ۵ فیصدی رہی؛ شرح میں تو زمین آسمان کا فرق ہے، لیکن مقدار مجموعی وہی ایک ہے: یعنی ۱۰۰ روپے ماہوار یا ۱۲۰۰ روپے سالانہ، اور آجر کے حق میں نتیجہ یکساں۔ نیز فرض کرو کہ شرح سود ۵ فیصدی ہے! اب اگر اصل مستعار ہے تو منافع جس میں صرف اجرت تنظیم شامل ہے ۵ فیصدی رہیگا، اور اگر ذاتی ہے تو سود بھی شامل منافع ہو کر شرح تا مقدار ۱۰ فیصدی بڑھا دیگا؛ منافع خالص اس کے علاوہ رہا۔ چھوٹے چھوٹے کاروبار تو ذاتی سرمائے سے چلتے ہیں، لیکن آجکل کے بڑے بڑے

کارخانوں میں اور تجارتوں میں بالعموم کروڑہا روپے قیمتی اصل قرض لیکر لگاتے ہیں: بالفاظ دیگر کبھی سود جزو منافع شمار ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا۔ ہر دو مذکورہ بالا مثالوں پر غور کرنے سے یہ سمجھنا دشوار نہ ہوگا کہ بالعموم بڑے کاروباروں میں بمقابلہ چھوٹوں کے شرح منافع کیوں ادنیٰ ہوتی ہے؟ شرح میں اسقدر فرق کیونکر ممکن ہے؟ اور وہ کس طرح پر اجرت تنظیم اور اصل کی باہمی نسبت اور نیز اصل کے ذاتی یا مستعار ہونے سے متعلق ہے؟

اسی سلسلے میں اس نکتے کا بیان بھی ضروری ہے کہ آجر کو تو منافع کی مجموعی مقدار سے غرض ہے، شرح جو دیگر اسباب پر منحصر ہے، خواہ اعلیٰ پڑے یا ادنیٰ؛ لیکن عوام یعنی خریداروں کا حال مختلف ہے۔ اصل ذاتی یا مستعار ہونے کے مطابق سود کے شامل یا خارج ہونے سے جو بیشی و کمی شرح منافع میں نمودار ہو، اس کا نرخ اشیا پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اور اسی لیے وہ خریداروں کے حق میں مفید نہ مضر۔ اسکے برعکس اگر اجرت تنظیم اور مقدار اصل کے موافق نسبت سے شرح میں تخفیف یا اضافہ ہو تو اس کا اثر بذریعہ ارزانی و گرانی نرخ اشیا عوام کے مالی مفاد پر اچھا خاصا پڑیگا؛

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، یوں تو اصل کی نسبت سے شرح منافع فیصدی سالانہ شمار کیا جاتا ہے، لیکن شرح کی ایک اور قسم بھی قرار دی گئی ہے جو عملی لحاظ سے بہت قابل توجہ ہے۔ اصل قائم تو عرصہ دراز تک عمل پیدائش سرانجام دے کر بشکل مطالبات فرسودگی قسط وار واپس آسکتا ہے، لیکن اصل دائر جلد جلد بشکل قیمت پیداوار وصول ہوتا رہتا ہے۔ اب اگر کسی کاروبار میں اصل دائر کی مقدار بہت زیادہ ہو اور وہ تیزی سے گھومتا رہے تو فی گردش شرح منافع ادنیٰ ہونے پر شرح سالانہ اعلیٰ ہونی ممکن ہے، اور مقدار منافع بھی بہت زیادہ ہو سکتی ہے: مثلاً اگر کوئی شخص ۲۰ ہزار کا مال صرف ایک فیصدی منافع پر ہر مہینے ارزاں فروخت کرتا ہے تو گو شرح منافع کی گردش نہایت ادنیٰ ہے شرح سالانہ ۱۲ فیصدی آپڑیگی؛ اور مقدار منافع جو اصل مقصود ہے، ۲۰۰ روپے ماہوار یا ۲۴۰۰ روپے سال ہوگی۔ اس کے برعکس اگر کوئی کوتہ نظر تاجر زیادہ منافع کی ہوس میں صرف ۵ ہزار کا مال ۳ فی صدی کے منافع سے سال میں صرف دو مرتبہ فروخت کرے تو گو شرح منافع فی گردش ۳ فی صدی نظر آئے، لیکن شرح سالانہ صرف ۶ فیصدی

ہوگی اور مقدار منافع صرف ۲۵ روپے ماہوار یا ۳۰۰ روپے سالانہ ہوگی۔ شرح فی گردش، شرح سالانہ اور مقدار منافع کے مذکورۂ بالا تعلق سے ایک نہایت اہم اصول تحقیق ہوتا ہے! کاروبار میں کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ قیمت گھٹا گھٹا کر بہت بہت سا مال جلد جلد اس طرح پر فروخت کرے کہ نہایت ادنیٰ شرح فی گردش سے نہ صرف اعلیٰ شرح سالانہ ملے، بلکہ منافع کی بڑی سے بڑی مقدار ہاتھ آئے۔ چنانچہ ترقی یافتہ ممالک کے کارخانے سال میں کئی بار ½ بلکہ ¼ فیصدی منافع فی گردش کی شرح سے کروڑہا روپے کا قیمتی سامان فروخت کرکے لاکھوں روپے منافع اٹھا رہے ہیں۔ لیکن معاشی پسماندگی اور ناواقفیت کی بدولت ہمارے اکثر ہموطن کاروباری لوگ اسکے بالکل برعکس کوشاں رہتے ہیں! یعنی شرح فی گردش اسقدر اعلیٰ چاہتے ہیں کہ بوجہ تاخیر فروخت شرح سالانہ بہت ادنیٰ رہ جاتی ہے، اور بوجہ قلت فروخت مقدار منافع اور بھی کچھ نہیں رہتی! گویا خود اپنے ہاتھوں اپنے پیر میں کلہاڑی مار لیتے ہیں۔ خریداروں کی آگاہی کے واسطے قیمت نقد کا نوٹس تو اکثر جلی حروف میں دکان پر آویزاں رہتا ہے، لیکن کیا اچھا ہو کہ "منافع کم" کا زرین اصول دکاندار اپنے دلوں پر نقش کرلیں۔ البتہ جہاں کمی منافع سے اضافۂ فروخت کی گنجائش نہ ہو وہاں تخفیف سے سراسر نقصان ہوگا؛ لیکن ایسا شاذونادر ہوتا ہے، بالعموم تخفیف منافع سے ارزانی بڑھانے کا وہی نتیجہ ہوتا ہے جو اوپر مذکور ہوا!

صاف ظاہر ہے کہ منافع کی شرح فی گردش بحوالۂ اصل دائر شمار کی جاتی ہے۔ اس شرح کا تجارت میں اس وجہ سے خاص طور پر رواج ہے کہ اس میں اصل کی بیشتر مقدار بشکل دائر ہوتی ہے: چنانچہ تجارت کا مشہور گر "منافع کم اور بکری زیادہ" اسی شرح کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ رہی صنعت وحرفت، اگرچہ اس میں اصل کی بڑی مقدار بشکل قائم ہوتی ہے، لیکن تاہم شرح منافع فی گردش بحوالۂ پیداوار اس میں بھی قرار پا سکتی ہے اور پاتی ہے!

باب پانزدہم

ترکیب عاملین پیدائش

(۱) تقسیم دولت کا خلاصہ (۲) قانون تقلیل و تکثیر و استقرار حاصل کا تعلق (۳) ترکیب عاملین کا اصول (۴) تنظیم کا ہر سہ عاملین سے تعلق (۵) ضروری نتائج

تقسیم دولت کا خلاصہ۔

۱۔ ہر سہ عاملین پیدائش ''زمین'' محنت و اصل'' اور نیز محنت کی ایک خاص الخاص قسم ''تنظیم'' جس کی حیثیت کم و بیش ایک جداگانہ عامل پیدائش کی سی ہے، جو کچھ پیدائش دولت میں حصہ لیتے ہیں اور انکی کارگزاری کا جو معاوضہ ملتا ہے' اس سے پہلے لگان' اجرت' سود اور منافع کے تحت میں مفصل بیان کیا جا چکا ہے۔ یہاں یہ تحقیق درپیش ہے کہ آیا ان عاملین کے مل کر کام کرنے کا کوئی اصول بھی ہے اور اگر ہے تو کیا؟ اس غرض کے لیے ہم اوّل ہر سہ قوانین پیدائش یعنی قانون تقلیل و تکثیر و استقرار حاصل کے مفہوم اور باہمی تعلق کی تشریح کر کے عمل پیدائش میں عاملین کی ترکیب مذکورۃ الصدر قوانین سے متعلق ثابت کریں گے؛ ان کے علاوہ اور چند ضروری نتائج بھی اخذ کئے جائیں گے۔ پس موجودہ بیان کو تقسیم دولت کے کل مذکورۃ الصدر مباحث کا خلاصہ اور لب لباب سمجھنا بیجا نہ ہوگا؛

قانون تقلیل و تکثیر و استقرار حاصل کا تعلق

۲۔ زراعت کی بحث میں قانون تقلیل حاصل کا ذکر خاص طور سے کیا جاتا ہے، لیکن جیسا کہ ہم آگے چلکر واضح کریں گے' اس قانون کا عملدرآمد پیدائش کے کل شعبوں میں عام ہے' اور زراعت تک محدود نہیں۔ اس قانون سے مراد یہ ہے کہ کسی کھیت میں محنت و اصل کے جرعے بڑھانے شروع کرو! اگر اب تک بیحد ناکافی جرعے مستعمل تھے تو چند جدید جرعوں کی پیداوار سابق جرعوں کی پیداوار سے نسبتہً زیادہ ہونی ممکن بلکہ اغلب ہے' اور اس حد تک زراعت قانون تکثیر حاصل کے تابع

کہلائیگی لیکن جرعے بڑھاتے بڑھاتے بالآخر ایک ایسا جرعہ آئیگا کہ اس کے مابعد جرعوں کی پیداوار نسبتہً گھٹتی چلی جائیگی؛ گویا قانون تقلیل حاصل کا عمل شروع ہو گا۔ ایک مثال لو! بغرض سہولت ہم اول محنت و اصل کے جرعوں میں کوئی تفریق نہیں کرتے۔ فرض کرو! کہ دس بیگھے زمین میں صرف ایک جرعہ لگایا جائے، غالباً کچھ بھی پیدا نہ ہوسکیگا، اور یہ جرعہ بھی اکارت جائیگا؛ ۵ جرعوں سے کچھ تھوڑا بہت پیدا ہوگا، غالباً ۱۰ جرعونکی پیداوار ۵ کی دوگنی سے بھی زیادہ ہوگی، اور اگر ۲۰ جرعونکی پیداوار ۵ کی چوگنی یا دس کی دوگنی سے بھی زیادہ ہو تو عجب نہیں؛ لیکن جدید جرعونکی پیداوار میں اضافۂ نسبتی کی بھی ایک حد ہے۔ غالباً چالیس جرعونکی پیداوار بیس کی پیداوار سے دوگنی نہ ہوسکیگی، اور ۶۰ جرعوں کی پیداوار بیس جرعوں کی پیداوار کے سہ چند سے یقیناً کم رہیگی۔ ایسی حالت میں ۲۰ جرعوں تک تو قانون تکثیر حاصل کا اور بعدہٗ قانون تقلیل حاصل کا عمل رآمد شمار ہوگا۔ دس بیگھے زمین اور ۲۰ جرعونکی نسبت جس کے بعد ہی قانون تقلیل حاصل کا عمل نمودار ہوتا ہے اصطلاحاً نسبت اعلیٰ کہلائے گی ؛

واضح ہو کہ اگرچہ قانون تقلیل حاصل کا ذکر بیشتر زراعت کے بیان میں آیا ہے، اس کا عمل زراعت سے مخصوص نہیں، بلکہ صنعت و حرفت اور تجارت بھی یکساں اس کے تابع ہیں۔ جس طرح پر کہ کسی کھیت میں محنت و اصل کے جرعوں کی ایک محدود تعداد استعمال کی جاسکتی ہے اور نسبت اعلیٰ سے تجاوز کرنے کا نتیجہ مزید ماحصل میں نسبتہً بیش افزوں تخفیف ہوتا ہے، بعینہ صنعت و حرفت اور تجارت میں کسی قطعۂ اراضی پر محنت و اصل کے لاتعداد جرعے فراہم نہیں کئے جاسکتے۔ ایک کارخانے یا دکان میں جس قدر آلات و مزدور سے کام لیا جاسکے اس کی مقدار کم و بیش معین ہے، اور مزید اضافے کی حالت میں قانون تقلیل حاصل کا عمل رآمد یقینی ہے۔ فرق ہے تو صرف اس قدر کہ بمقابلہ زراعت کے صنعت و حرفت اور تجارت میں محنت و اصل کے بہت زیادہ جرعے ایک ہی رقبۂ زمین پر کام کرسکتے ہیں۔ لیکن ایسا فرق تو خود زراعت میں بھی بلحاظ فصل کم و بیش موجود ہے: بعض چیزوں، مثلاً تمباکو، آلو اور نیشکر کی کاشت میں بمقابلہ جوار، باجرا، مکا جیسی فصلوں کی کاشت کے کہیں زیادہ

جرعے لگتے ہیں؛ علیٰ ہذا کم و بیش جرعے استعمال ہو سکنے کی گنجائش کا فرق صنعت و تجارت میں بھی عام ہے؛ مثلاً غلہ و آہن کے مقابل سوتی، جواہرات، اور چاندی سونے کی تجارت میں ایک ہی قطعۂ زمین پر صدہا گنے زیادہ اصل کے جرعے فراہم ہوتے ہیں؛ یہی حال بیش قیمت کلوں والے کارخانوں کا ہے۔ علیٰ ہذا بمقابلہ جولاہوں یا رنگریزوں کے بہت زیادہ موچی یا زرگر ایک ہی کارخانے میں ملکر کام کر سکتے ہیں؛ یعنی کام کے مطابق ایک ہی قطعۂ اراضی پر محنت کے جرعوں کی بھی مقدار مختلف ہوتی ہے لیکن جرعونکی مقدار کا عاملین کی باہمی نسبت پر اثر پڑتا ہے، قانون تقلیل حاصل کے عملدرآمد میں جرعونکی کمی بیشی کسی طرح حارج نہیں ہوتی۔ پس ثابت ہوا کہ عاملین کی باہمی نسبت خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، اور جیسا کہ ابھی بتا چکے ہیں، ہر شعبۂ پیدائش میں ان کی نسبت اعلیٰ ضرور مختلف ہوگی؛ لیکن قانون تقلیل حاصل کا عملدرآمد پیدائش کے کل شعبوں پر مسلط ہے۔ اب تک ہم نے زمین کا ایک مقرر قطعہ لیکر باقی دو عاملین یعنی محنت و اصل کو قانون تقلیل حاصل کا پابند ثابت کیا؛ لیکن اگر محنت و اصل کے جرعوں کی مقدار معین فرض کر لی جائے تو زمین بھی اسی طرح مذکور الصدر قانون کے تابع نظر آئے گی۔ فرض کرو کہ عاملین کی نسبت اعلیٰ حسب ذیل ہے :-

ا بیگہ زمین اور ب جرعۂ محنت و اصل کی پیداوار = ی

لہذا ذیل میں چونکہ نسبت اعلیٰ میں تغیر ہو گیا۔

ل ا بیگہ زمین اور ب ل جرعۂ محنت و اصل کی پیداوار (ی) سے زیادہ مگر ی ل سے کم

مگر ذیل میں چونکہ نسبت اعلیٰ برقرار ہے

ا ل بیگہ زمین اور ب ل جرعۂ محنت و اصل کی پیداوار = ی ل

آخری دو مثالوں کے مقابلے سے واضح ہو گا کہ جبکہ مقدار جرعہ یکساں ب ل ہو اور زمین ا بیگہ سے بڑھ کر ا ل بیگہ ہو جائے تو پیداوار میں ی سے زیادہ اور ی ل سے کم کوئی مقدار بڑھ کر ی ل ہو جائیگی۔ پس چوتھا نتیجہ یہ نکلا کہ اگر مطابق نسبت اعلیٰ

ا بیگہ زمین اور ب جرعۂ محنت و اصل کی پیداوار = ی

تو

ا ل بیگہ زمین اور ب جرعۂ محنت و اصل کی پیداوار = ی سے زیادہ مگر

ی ال سے کم۔ گویا جس طرح پر کہ محنت و اصل کے جرعے ایک قطعۂ اراضی پر نسبت اعلیٰ کے بعد قانون تقلیل حاصل کی متابعت کرتے ہیں بعینہ زمین کے جرعے بھی محنت و اصل کے معین جرعوں کے ساتھ نسبت اعلیٰ کے بعد اسی قانون کے پیرو بن جاتے ہیں محنت و اصل کی طرح زمین کے جرعوں کا پابند قانون تقلیل حاصل ہونا ہم ایک دوسری مثال سے بھی ثابت کرنا چاہتے ہیں :-

فرض کرو کہ ایک دس بیگے والے کھیت میں اضافہ جرعوں کا نتیجہ حسب ذیل ہے۔

جرعے	مقدار پیداوار
۱	×
۵	۵۰ من
۱۰	۱۵۰ من
۱۵	۲۷۰ من
۲۰	۳۸۰ من
۲۵	۴۵۰ من

۲۰ جرعوں کی دس بیگے زمین میں پیداوار ۳۸۰ من اور اوسط پیداوار فی بیگہ ۳۸ من ہے۔ اب اگر ۲۵ جرعے ۱۲ ½ بیگے زمین میں لگائے جائیں تو چونکہ ۲۰ جرعے اور دس بیگے کھیت، اور ۲۵ جرعے اور ۱۲ ½ بیگے کھیت میں نسبت یکساں ۲ ، ۲ اور ۲ ، ۱ کی ہے، دونوں حالت میں اوسط پیداوار فی بیگہ برابر ہوگی۔ اور وہ اوسط جبکہ ۲۰ جرعے اور دس بیگے کی پیداوار ۳۸۰ من ہے، ۳۸ من فی بیگہ ہوا۔ لہذا ۲۵ جرعے اور ۱۲ ½ بیگے کی پیداوار ۴۷۵ من ہوگی؛ لیکن ۲۵ جرعوں اور ۱۰ بیگے کی پیداوار ۴۵۰ من ہے، لہذا جدید ۲ ½ بیگے کی پیداوار صرف ۲۵ من ہے۔ گویا جبکہ مقدار جرعہ وہی ۲۵ رہے، سابق ۱۰ بیگوں کا اوسط پیداوار ۴۵ من، اور جدید ۲ ½ بیگے کا صرف ۱۰ من بیگہ ہے: گویا محنت و اصل کی مانند زمین کے جرعے بھی قانون تقلیل حاصل کے تابع ہیں ؛

ابتک ہم نے بغرض سہولت جرعوں میں محنت و اصل کو یکجا شمار کیا، لیکن

درحقیقت یہ دونوں عامل جدا جدا بھی قانون مذکور کے اسی طرح پابند ہیں: مثلاً اگر کاشت میں صرف محنت یا صرف اصل کے جرعے بڑھائے جائیں، تب بھی قانون تقلیل حاصل کا عمل نمودار ہوگا۔ پس جبکہ ہر عامل اس قانون کا تابع ٹھیرا تو قانون مذکور کا ماحصل یہ نکلا کہ عمل پیدائش میں جبکہ عاملین کے باہم نسبت اعلیٰ قرار پا جائے، ان میں سے کسی ایک یا دو کو بحال رکھ کر اور باقی دو یا ایک میں اضافہ کر کے نسبت اعلیٰ متغیر کردی جائے تو جدید جرعوں اور ان کی مزید پیداوار کی نسبت بمقابلہ سابق جرعوں اور انکی پیداوار کے ادنیٰ ہوگی ؞

حاصل کلام یہ کہ اگر نسبت اعلیٰ کے مطابق

ا زمین، ب محنت، اور ج اصل کی پیداوار = ی

تو

ا ل زمین، ب محنت، اور ج اصل کی پیداوار		
ا زمین، ب ل محنت، اور ج اصل کی پیداوار	= ی سے زیادہ مگر ی ل سے کم	
ا زمین، ب محنت، اور ج ل اصل کی پیداوار		
ا ل زمین، ب ل محنت، اور ج اصل کی پیداوار		
ا زمین، ب ل محنت، اور ج ل اصل کی پیداوار	= ی سے زیادہ مگر ی ل سے کم	
ا ل زمین، ب محنت، اور ج ل اصل کی پیداوار		

اوپر کی کل بحث سے ایک نتیجہ خیز واقعے کا پتا چلتا ہے: عمل پیدائش میں اگرچہ ہر سہ عاملین مختلف نسبتوں سے ملکر کام کر سکتے ہیں، لیکن ان سب میں کوئی نسبت بلحاظ نسبت پیداوار بطور حدّ فاصل واقع ہوتی ہے۔ اگر عاملین میں سے کسی ایک یا دو میں تخفیف یا اضافہ کر کے نسبت ردّو بدل کردی جائے تو قانون تقلیل حاصل کے عمل جاری ہونے سے پیداوار میں باقی جرعوں کی پیداوار سے نسبتہً کمتر اضافہ ہوگا۔ نیز یہ بھی تحقیق ہوا کہ ہر عامل کی پیدا آوری سب کی باہمی نسبت پر منحصر ہے، جداگانہ معیّن نہیں ہوسکتی۔ علیٰ ہذا پیداوار کی نسبت بھی عاملین کی باہمی نسبت کے ساتھ ساتھ متبدل ہوتی رہتی ہے اس کو کسی عامل سے نسبت مستقیم حاصل نہیں ؞

قانون تقلیل حاصل کی جداگانہ تشریح کے بعد، اب ہم اس کا باقی

دو قانون تکثیر و استقرار حاصل سے تعلق دکھانا چاہتے ہیں۔ فرض کرو کہ نسبت اعلیٰ کے مطابق

ا زمین، ب محنت، اور ج اصل کی پیداوار = ی

اب اگر ان کل عاملین میں برابر اضافہ کیا جائے: مثلاً دوگنا، سہ گنا، چہار گنا، تاکہ صرف مقدار بڑھ جائے اور نسبت اعلیٰ برقرار رہے تو دو نتیجے ممکن ہیں

ا ل زمین، ب ل محنت، اور ج ل اصل کی پیداوار = ی ل
یا
= ی ل سے زیادہ

نتیجۂ اول جو بالعموم زراعت میں نمودار ہوتا ہے قانون استقرار حاصل کہلاتا ہے: یعنی اگر نسبت صحیح یا اعلیٰ برقرار رکھتے ہوئے صرف عاملین کی مقدار بڑھائی جائے، تو پیداوار بھی اسی نسبت سے بڑھیگی، اور بہر صورت جز عوامل اور پیداوار میں ایک ہی نسبت قائم رہیگی۔

نتیجۂ دوم جس کو قانون تکثیر حاصل کہتے ہیں، عموماً صنعت و حرفت میں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس کے اسباب استعمال مشین اور تقسیم کار اور پیدائش بر پیمانہ کبیر کے تحت واضح کر چکے ہیں۔ اس کا ماحصل یہی ہے کہ ہر سہ عاملین کی مقدار جس قدر بڑھیگی، مزید پیداوار ماسبق جز عوں کی پیداوار کے مقابلے میں نسبتہً زیادہ بڑھیگی۔

پس صاف ظاہر ہے کہ قانون تقلیل حاصل عاملین کی نسبت سے متعلق ہے، اور قانون استقرار و تکثیر حاصل، عاملین کی مقدار سے۔ یہاں یہ نکتہ جتانا ضروری ہے کہ قانون استقرار حاصل میں تو سابق نسبت اعلیٰ برابر قائم رہتی ہے، صرف عاملین کی مقدار میں بیشی ہوتی ہے، لیکن قانون تکثیر حاصل میں علاوہ اضافۂ مقدار عاملین ان کی سابق نسبت اعلیٰ میں بھی ردّ و بدل ہونا ممکن بلکہ اغلب ہے: مثلاً

ا زمین، ب محنت، اور ج اصل کی پیداوار = ی

اب اگر عمل پیدائش قانون تکثیر حاصل کے پابند ہو تو

ا ل زمین، ب ل محنت، اور ج ل اصل کی پیداوار = ی ل سے زیادہ۔ لہذا

ا ل زمین، ب ل محنت، اور ج ل اصل کی پیداوار سے کچھ کم = ی ل

آخری نتیجے پر غور کرنے سے واضح ہوگا کہ بحالت قانون تقلیل حاصل و بحالت قانون تکثیر حاصل، سابق نسبت اعلیٰ میں جو ردّ و بدل ہوتا ہے ان میں ایک بیّن فرق

ہے: وہ یہ کہ قانون تقلیل حاصل میں جو نسبت بدلتی ہے وہ صرف ایک یا دو عامل کے اضافے سے، لیکن قانون تکثیر حاصل میں جو نسبت بدلیگی وہ ہر سہ عاملین کے کم و بیش اضافے سے۔ یہاں یہ نکتہ بھی جتا نا ضروری ہے کہ کبھی صرف ایک یا دو عامل کے اضافے سے نسبت بدلنے کے باوجود بھی قانون تکثیر حاصل نمودار ہوتا ہے: چنانچہ کاشت میں اس کی مثال بیان ہو چکی ہے۔ اس کے قیام کے بعد اگر قانون تکثیر حاصل ظہور پذیر ہوگا تو ہر سہ عاملین کے اضافے سے خواہ سابق نسبت اعلیٰ برقرار رہے یا جیسا کہ اکثر ہوتا ہے متبدل ہو جائے ؛

حاصل کلام یہ کہ نسبت اعلیٰ قائم ہونے سے قبل تو صرف ایک یا دو عامل کا اضافہ بھی قانون تکثیر حاصل نمایاں کر سکتا ہے؛ لیکن ایسی نسبت قائم ہو جانے کے بعد صرف ایک یا دو عامل کے اضافے سے قانون تقلیل حاصل نمودار ہوگا لیکن ہر سہ عامل کے اضافے سے قانون تکثیر حاصل پیدا ہو سکتا ہے اور عاملین کی جدید مقدار کی نسبت سابق نسبت اعلیٰ سے مختلف ہو سکتی ہے اور ہوتی ہے۔ لیکن جدید نسبت میں بھی ایک ایسی نسبت اعلیٰ قرار پا سکتی ہے کہ حسب سابق محض ایک یا دو عامل کے اضافے سے اب بھی ویسے ہی قانون تقلیل حاصل نمودار ہو۔ رہا قانون استقرار حاصل؛ اس میں ایک ہی نسبت اعلیٰ برابر قائم رہتی ہے؛ صرف عاملین کی مقدار بڑھتی ہے اور پیداوار کی نسبت بھی بہر صورت برقرار رہتی ہے ؛

واضح ہو کہ مقدار عاملین کے اضافے سے ہمیشہ قانون تکثیر حاصل یا استقرار حاصل کا عمل لازمی نہیں۔ جیسا کہ ہم تنظیم اور دیگر عاملین کے تعلق کے تحت ظاہر کریں گے، اضافۂ مقدار کی بھی ایک حد ہے، جس سے تجاوز کرنے کا نتیجہ قانون تقلیل حاصل کا ظہور ہوگا: گویا جس طرح کہ ہر سہ عامل کے باہم نسبت اعلیٰ ہوتی ہے، تینوں عامل اور تنظیم کے درمیان بھی ایک ایسی ہی نسبت اعلیٰ پائی جاتی ہے ؛

المختصر ہر سہ قوانین پیدائش کے باہمی تعلق کی مذکور الصدر بحث میں عاملین کی باہمی نسبت اور مقدار کے ردّ و بدل کی مختلف صورتیں اور نتائج واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اب ہم تقرر نسبت کے اصول دریافت کرنا چاہتے ہیں ؛

۴۔ ہر سہ عاملین مل جل کر جو عمل پیدائش میں حصہ لیتے ہیں؛ انکی ترکیب کیونکر

ترکیب عاملین کا اصول

قرار پاتی ہے؟ بالفاظ دیگر کس اصول کے مطابق عاملین کی باہمی نسبت قائم ہوتی ہے؟
جیسا کہ اس سے قبل واضح کیا جا چکا ہے، نسبت اعلیٰ سے مراد عاملین کی ایسی ترکیب ہے
کہ اگر ان میں سے کسی ایک یا دو میں اضافہ کیا جائے، ان کی مزید پیداوار قانون تقلیل
حاصل کے تابع ہو۔ لیکن لگان کی بحث میں صاف بتا چکے ہیں کہ قانون مذکور کا عمل
مقدار پیداوار کے معیار سے دریافت کرتے ہیں، اس کو قیمت پیداوار سے کوئی تعلق
نہیں۔ البتہ جرعۂ مختتم ہمیشہ قیمت سے قرار پاتا ہے، قیمت جسقدر زیادہ ہوگی جرعۂ مختتم
قانون تقلیل حاصل کی حد سے آگے بڑھیگا؛ اگر قیمت گھٹیگی نتیجہ اس کے برعکس ہوگا۔
جرعۂ مختتم کو قیمت پیداوار مثل فٹ بال قانون مذکور کی حد کے کبھی اس طرف کبھی اسطرف
پھینکتی رہتی ہے۔ دراصل تو ماحصل زائد کی بڑی سے بڑی مقدار مطلوب ہوتی ہے
نہ کہ صرف اعلیٰ سے اعلیٰ شرح، اور اسکی وجہ منافع کی بحث میں واضح کر چکے ہیں، اور
آئندہ بھی تنظیم کے سلسلے میں بیان کرینگے۔ صاف ظاہر ہے کہ ماحصل زائد کی سب سے
اعلیٰ شرح تو قانون تقلیل حاصل کی ابتدائی حد پر قرار پاتی ہے، لیکن ماحصل زائد کی سب
سے بڑی مقدار جرعۂ مختتم کی حد پر حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا ہر سہ عاملین کو انکے جرعۂ مختتم کی
حد تک یکجا کرکے کام لینے میں سب سے زیادہ ماحصل زائد ہاتھ آئیگا۔ پس بلحاظ مقدار
ماحصل زائد عاملین کی بہترین ترکیب وہ ہے کہ ہر ایک عامل اپنے جرعۂ مختتم تک
شامل ہو: یعنی ان میں سے ہر ایک کے آخری جرعے کی پیداوار اسکی لاگت کے برابر
ہو نہ کم نہ زیادہ۔ اسی ترکیب میں عاملین کی جو نسبت قائم ہو وہ اصطلاحاً نسبت مفید
کہلائیگی ٭

جبکہ جرعۂ مختتم کی لاگت اس کی پیداوار کی قیمت کے مساوی ٹھیری تو صاف
ظاہر ہے کہ کوئی عامل جسقدر ارزان ہوگا اس کا جرعۂ مختتم بھی قانون تقلیل حاصل کی حد سے
آگے بڑھا ہوگا، اور جسقدر گراں ہوگا نتیجہ اس کے برعکس ہوگا۔ چنانچہ ترکیب عاملین
کا یہ عام قاعدہ ہے کہ ارزان عامل کے حتی الوسع بیشتر جرعے اور گراں کے حتی الامکان
کمتر استعمال کئے جاتے ہیں: مثلاً سو من غلہ دو طرح پر پیدا کیا جا سکتا ہے، تھوڑی سی
زمین پر محنت واصل کے بہت سے جرعے لگائے جاویں یا بہت سی زمین پر تھوڑے
جرعے استعمال ہوں۔ اگر مقابلتہً زمین گراں ہے اور محنت واصل ارزان تو کاشت

زمین مفید ثابت ہوگی؛ جس میں شرح پیداوار بمعیار زمین بہت اعلیٰ اور بمعیار محنت اب ۱۱ز دہم
واصل متوسط یا ادنیٰ ہوگی۔ لیکن اگر محنت واصل مقابلۃً گراں ہو اور زمین ارزاں تو
کاشت وسیع سے زیادہ منافع ہوگا، جس میں شرح پیداوار بمعیار محنت واصل
بہت اعلیٰ اور بمعیار زمین متوسط یا ادنیٰ ہوگی۔ مثلاً فرض کرو کہ کسی دس بیگے کھیت
کی کاشت کے نتائج حسب ذیل دریافت ہوں :-

جرعے	پیداوار	اوسط فی جرعہ	اوسط فی بیگہ
۵	۵۰ من	۱۰ من	۵ من
۱۰	۱۵۰ من	۱۵ من	۱۵ من
۱۵	۲۷۰ من	۱۸ من	۲۷ من
۲۰	۳۸۰ من	۱۹ من	۳۸ من
۲۵	۴۵۰ من	۱۸ من	۴۵ من
۳۰	۵۱۰ من	۱۷ من	۵۱ من
۳۵	۵۶۰ من	۱۶ من	۵۶ من
۴۰	۶۰۰ من	۱۵ من	۶۰ من
۴۵	۶۳۰ من	۱۴ من	۶۳ من
۵۰	۶۵۰ من	۱۳ من	۶۵ من

اب بفرض محال اگر زمین کی اس قدر کثرت ہو کہ حسب ضرورت مفت
مل سکے تو گویا صرف جرعوں کی لاگت مصارف کاشت میں شمار ہوگی۔ ایسی حالت
میں دس دس بیگے زمین پر ۲۰، ۲۰ جرعے لگانے سے ماحصل زائد کی بیشترین مقدار
ہاتھ آئیگی اور شرح پیداوار بمعیار جرعہ اعلیٰ ترین و بمعیار زمین ادنیٰ ہوگی۔ اس کے
برعکس اگر جرعے مفت میسر آسکیں اور صرف زمین کا کرایہ مصارف کاشت میں
شامل ہو تو دس بیگے زمین پر بجائے ۲۰ کے ۵۰ جرعے بالفاظ دیگر ۲۵ بیگے کی بجائے
۱۰ بیگے پر ۵۰ جرعے استعمال کرنے سے بیشترین ماحصل زائد حاصل ہوگا۔ شرح پیداوار
بمعیار زمین نہایت اعلیٰ و بمعیار جرعہ ادنیٰ ہوگی؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ نہ تو زمین مفت
مل سکتی ہے نہ جرعے بالکل بے قیمت ہوسکتے ہیں۔ البتہ یہ واقعہ ہے کہ مقابلۃً کہیں زمین

گران ہوتی ہے اور کہیں محنت و اصل؛ اس کے مطابق علی الترتیب کاشت دقیق و سیع رواج پاتی ہے۔ مذکورالصدر مثال میں اگر قیمت جرعہ ۱۵ روپے ہو تو ۲۰ جرعے، ۱۳ روپے ہو تو ۲۵ جرعے، ۱۱ روپے ہو تو ۳۰ جرعے، ۹ روپے ہو تو ۳۵ جرعے، ۷ روپے ہو تو ۴۰ جرعے ۵ روپے ہو تو ۴۵ جرعے، اور ۳ روپے ہو تو ۵۰ جرعے استعمال کرنے سے بیشترین ماحصل زائد ملیگا۔ اس واقعے سے دو نتیجے ثابت ہوتے ہیں: اول یہ کہ ارزانی کے ساتھ عامل کی مقدار مستعمل بھی بڑھتی ہے، دوم یہ کہ ہر سہ عاملین کو ان کے جرعہ مختتم تک استعمال کرنے سے بیشترین ماحصل زائد حاصل ہوتا ہے۔

ابتک ہم نے زمین کی ایک معیّن مقدار یعنی دس بیگے فرض کرکے قیمت جرعہ، اصل و محنت کی کمی بیشی کا اثر جرعوں کی مقدار مستعمل پر ظاہر کیا۔ اب ان جرعوں کی ایک مقدار معین لو: فرض کرو کہ کسی کاشتکار کے پاس ۵۰ جرعے ہیں جنکو وہ زراعت میں لگانا چاہتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کتنی زمین پر کاشت پھیلائیگا؟ واضح ہو کہ ارزانی و گرانی عامل کے مذکورالصدر اصول کے مطابق اس کے کھیت کا رقبہ کرائۂ زمین کی کمی بیشی کے حساب سے وسیع اور مختصر ہوگا۔ مذکورالصدر مثال میں ۴۵ جرعوں اور ۱۰ بیگے زمین سے ۶۳۰ من پیداوار حاصل ہوئی: پس چونکہ ۴۵ جرعوں اور ۱۰ بیگے میں نسبت وہی ہے جو ۵۰ جرعے اور ۱۱ ۱/۹ بیگے میں، لہذا اسی اوسط سے ۵۰ جرعوں اور ۱۱ ۱/۹ بیگے کی پیداوار ۷۰۰ من ہوگی۔ لیکن ۵۰ جرعے اور ۱۰ بیگے کی پیداوار ۶۵۰ من ہے، لہذا جدید ۱ ۱/۹ بیگے کی مزید پیداوار کل ۵۰ من یا ۴۵ من فی بیگہ ہوئی۔ اب اگر کرائۂ زمین ۴۵ من بیگے سے زیادہ ہو تو ۱۰ بیگے کی کاشت زیادہ مفید ہوگی، اور اگر ۴۵ من بیگے سے کم تو ۱۱ ۱/۹ بیگے کی۔ اب اگر کرائۂ زمین گھٹتے گھٹتے ۴۰ من بیگے سے بھی کم رہ جائے تو ۱۱ ۱/۹ بیگے کے مقابلے میں ۱۲ ۱/۲ بیگے کی کاشت زیادہ مفید ثابت ہوگی۔ ۴۰ جرعے اور ۱۰ بیگے و ۵۰ جرعے اور ۱۲ ۱/۲ بیگے کی نسبت مساوی ہے، جبکہ ۴۰ جرعے اور ۱۰ بیگے کی پیداوار ۶۰۰ من ہے تو اسی حساب سے ۵۰ جرعے اور ۱۲ ۱/۲ بیگے کی پیداوار ۷۵۰ من ہوگی۔ لیکن ۵۰ جرعے اور ۱۰ بیگے زمین سے ۶۵۰ من پیداوار حاصل ہوتی ہے، لہذا جدید ۲ ۱/۲ بیگے کی مزید پیداوار کل ۱۰۰ من یا ۴۰ من فی بیگہ ہوئی۔ کرایہ ۴۰ من بیگے سے جس قدر

گھٹنے لگا ۱۲ $\frac{1}{2}$ بیگھے کی کاشت سے بیشتر ماحصل زائد ملیگا۔ مندرجہ بالا مثال سے ایک نقشہ بنا کر درج ذیل کرتے ہیں جس سے واضح ہوگا کہ ۱۰ من سے لیکر ۴۵ من بیگھے کرایۂ زمین تک ۵۰ جرعے زیادہ سے زیادہ کس قدر زمین پر استعمال ہوسکیں گے:-

تعداد بیگہ	مقدار پیداوار	مقدار اضافہ زمین	ماحصل مختتم فی بیگہ
۱۰	۶۵۰ من	۱ $\frac{1}{9}$ بیگہ	۴۵ من
۱۱ $\frac{1}{9}$	۷۰۰	۱ $\frac{7}{18}$	۳۶
۱۲ $\frac{1}{2}$	۷۵۰	۱ $\frac{11}{14}$	۲۸
۱۴ $\frac{2}{7}$	۸۰۰	۲ $\frac{8}{21}$	۲۱
۱۶ $\frac{2}{3}$	۸۵۰	۳ $\frac{1}{3}$	۱۵
۲۰	۹۰۰	۵	۱۰
۲۵	۹۵۰		۰

اس نقشے کے بنانے کا طریق ان دو مذکورالصدر مثالوں سے بخوبی واضح ہوگا جہاں بمقابلہ ۱۰ بیگھے کے ۱۱ $\frac{1}{9}$ اور ۱۲ $\frac{1}{2}$ بیگھے پر ۵۰ جرعے استعمال کرنا کرایۂ زمین کی تخفیف کے ساتھ ساتھ زیادہ مفید ثابت کیا گیا ہے:

بغرض سہولت ہم نے زراعت کی مثال پیش کی، لیکن واضح ہو کہ صنعت و حرفت کا بھی یہی حال ہے۔ اگر محنت و اصل کی بجائے زمین و اصل کے جرعے یکجا کر کے محنت سے مقابلہ کیا جائے اور باری باری سے محنت کی مقدار اور جرعوں کی مقدار معیّن فرض کر کے حسب طریق بالا کمی و بیشی قیمت محنت کا اثر ان کی مقدار پر تحقیق کیا جائے تو بعینہ وہی نتیجہ برآمد ہوگا۔ علیٰ ہذا تجارت میں بھی زمین و محنت کے جرعوں کا اصل سے مقابلہ کرنے پر یہی کیفیت نظر آئیگی۔ یہاں یہ نکتہ جتانا بے محل نہ ہوگا کہ زراعت میں زمین، صنعت و حرفت میں محنت، اور تجارت میں اصل کی کارگزاری مقابلۃً باقی عاملین سے عموماً بڑھی چڑھی ہوتی ہے؛ اور پیدائش کے ان تینوں اہم شعبوں میں انکے مخصوص عامل کے مقابل علی الترتیب محنت و اصل، اور زمین و محنت کے جرعے یکجا شمار کرنے سے بیان میں صفائی اور سہولت ہوتی ہے:

حاصل کلام یہ کہ عاملین کی ترکیب محض اتفاقی نہیں، بلکہ ایک اصول کی پابند

ہوتی ہے۔ نسبت مفید میں ہر ایک عامل جزعہ مختتم حد تک شامل ہوتا ہے، اور مقابلۃً جو عامل جسقدر ارزاں ہوگا اسکی مقدار زیادہ، اور جسقدر گراں ہوگا اسکی مقدار کمتر استعمال ہوگی۔ لہذا کل پیداوار کی شرح ارزاں عامل کے معیار سے ادنیٰ اور گراں کے معیار سے اعلیٰ ہوگی ؛

تنظیم کا ہر عاملین سے تعلق

۴۔ خواہ زراعت ہو خواہ صنعت و حرفت یا تجارت ہر شخص کسی کاروبار کی ایک خاص مقدار کا اہتمام اور نگرانی بطریق احسن کر سکتا ہے، اور عمل پیدائش میں تنظیم کا جو رتبہ ہے اور پیداوار پر اس کا جسقدر اثر پڑتا ہے، منافع کے تحت واضح ہو چکا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ مقدار عاملین اور تنظیم میں بھی نسبت اعلیٰ اور نسبت مفید قائم ہے۔ نسبت اعلیٰ کی حد پر عاملین کی ایسی ترکیب ہوتی ہے کہ قانون تکثیر حاصل یا استقرار حاصل کا اثر درجۂ کمال کو پہنچ جاتا ہے، اسکے بعد ضعف تنظیم بتدریج اس اثر کو زائل کرتا ہے: حتیٰ کہ گویا ہر سہ عاملین کا مجموعی جزعۂ مختتم بھی کاروبار میں لگ جاتا ہے۔ یہی نسبت مفید کی حد ہے، اسکے بعد یا تو کاروبار کی توسیع روک دی جاتی ہے، یا نسبت مفید برقرار رکھنے کی غرض سے تنظیم میں بھی اضافہ کیا جاتا ہے۔ چنانچہ واقعہ ہے کہ کاروبار ایک حد تک تو موجودہ تنظیم میں بڑھ سکتا ہے، لیکن اس کے بعد اگر مقدار تنظیم میں بھی مناسب اضافہ کیا جائے تو کاروبار میں بوجہ قلت اہتمام و نگرانی ابتری پھیل کر بجائے نفع کے نقصان ہونے لگتا ہے۔ پس ثابت ہوا کہ ترکیب عاملین میں ان کی مقدار کا اضافہ لامحدود ہو کر قانون تکثیر حاصل یا استقرار حاصل کا پیرو نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس اضافے پر بھی مقدار عاملین اور تنظیم کی نسبت نے ایک حد قائم کر دی ہے جس سے تجاوز کرنے پر قانون تقلیل حاصل پھر نمودار ہوتا ہے؛ حتیٰ کہ عاملین کا مجموعی جزعۂ مختتم مزید اضافے کو قطعاً بند کر دیتا ہے۔ یہ وہ حالت ہے جبکہ کوئی کاشتکار آجر یا تاجر مزید کاروبار سنبھال نہ سکنے کے خوف سے اس کی توسیع روک دے، اور موجودہ مقدار پر قناعت کرنا اپنے حق میں سب سے بہتر سمجھے ؛

یہاں دو نکتے قابل توجہ معلوم ہوتے ہیں :- اوّل یہ کہ جس طرح ہر شعبۂ پیدائش میں عاملین کی مختلف مقداریں یکجا ہو سکتی ہیں: مثلاً بمقابلہ زراعت کے صنعت میں محنت و اصل کی مقدار زیادہ ہوتی ہے، اور زمین کی کم تجارت میں اصل کی مقدار

سب پر غالب ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر بلحاظ نوعیت کاروبار عاملین اور تنظیم بھی مختلف مقداروں میں ترکیب پاتے ہیں۔ بالعموم ایک ہی مقدار تنظیم کے ساتھ بمقابلہ زراعت کے صنعت و حرفت میں عاملین کی بیشتر مجموعی مقدار مل سکتی ہے، اور تجارت میں سب سے زیادہ۔ لیکن جیسا کہ عاملین کی باہمی نسبت کے سلسلے میں سمجھایا جا چکا ہے، مقدار کی کمی و بیشی کا صرف نسبت پر اثر پڑتا ہے؛ اس سے قانون تقلیل حاصل کے عمل میں کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اس سے قبل قانون تقلیل حاصل کا ہر سہ عاملین کی نسبت اعلیٰ کے بعد ایک یا دو عامل کے اضافے سے نمودار ہونا بیان کیا گیا تھا؛ لیکن یہاں معلوم ہوا کہ ہر سہ عاملین اور تنظیم کی نسبت اعلیٰ کے بعد تینوں عاملوں کے اضافے سے بھی قانون مذکور ظہور پذیر ہو سکتا ہے۔ پس تحقیق ہوا کہ قانون تقلیل حاصل کئی طرح نمودار ہوتا ہے؛ کبھی صرف ایک یا دو، اور کبھی تینوں عاملوں کے اضافے سے؛

تنظیم ایک اور لحاظ سے بھی قابل توجہ ہے؛ اس سے قبل جتایا جا چکا ہے کہ کاروبار میں ماحصل زائد کی اعلیٰ شرح اسقدر مطلوب نہیں ہوتی جتنی کہ اس کی مقدار کلّی کی زیادتی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ نسبت اعلیٰ کے بجائے نسبت مفید عاملین کی ترکیب میں قائم کی جاتی ہے اور قانون تقلیل حاصل کی ابتدائی حد کے بجائے جرعۂ مختتم پر کاروبار کی توسیع روکی جاتی ہے۔ اس واقعے کی بنا ہی تنظیم ہے: مثلاً کسی کھیت میں نسبت اعلیٰ کے مطابق ۱۰۰ روپے قیمتی جرعے استعمال ہونے سے ۳۰۰ روپے قیمتی پیداوار حاصل ہوا اور نسبت مفید کے مطابق ۳۰۰ روپے قیمتی جرعوں سے صرف ۷۰۰ روپے قیمتی پیداوار ملے! شرح ماحصل زائد تو بحالت اوّل اعلیٰ ہے، یعنی سہ گنی؛ لیکن مقدار ماحصل زائد بحالت دوم زیادہ ہے، یعنی اول سے دوگنی: (۳۰۰ - ۱۰۰) کے مقابل میں (۷۰۰ - ۳۰۰)۔ گویا جبکہ شرح ماحصل زائد بمعیار جرعۂ اعلیٰ ہے تو اجرت تنظیم اور منافع صرف ۲۰۰ روپے ہے؛ اور جبکہ بمعیار جرعۂ مفید ہے تو ۴۰۰ روپے ہوتا ہے۔ تنظیم اور عاملین پیدائش کی کمی بیشی کا تعلق منافع کے تحت بھی واضح کر چکے ہیں، عاملین کی کثرت، اجرت تنظیم اور منافع کے حق میں بہت مفید ہے اور انکی قلت بیحد مضر؛ یہی وجہ ہے کہ ہر کوئی عاملین کی مقدار بڑھانے اور

حصہ سوم
باب نوزدہم

جرعۂ مختتم تک کاروبار جاری رکھنے کی کوشش کرتا ہے، اور کامیاب ہو کر اعلیٰ تنظیم اور بہت سا منافع پاتا ہے۔

پس واضح ہوا کہ مقدار عاملین کے اضافے اور جرعۂ مختتم کے استعمال کا حقیقی باعث اجرت تنظیم اور منافع ہے۔

ضروری نتائج

۵ - زمین کی مقدار تو ہر ملک میں محدود ہے، اضافۂ اصل بھی چند خاص حالتوں میں ممکن ہے، لیکن آبادی برابر بڑھتی رہتی ہے اور اضافۂ محنت کی ہر ملک میں بہت گنجائش ہے - اب اگر آبادی بڑھے اور اصل نہ بڑھے یا کم بڑھے تو کاروبار کا بیشتر بار زراعت پر آپڑیگا اور قانون تقلیل حاصل زراعت میں محنت کی پیداوار گھٹا کے گھٹاتے شرح اجرت نہایت ادنیٰ کر کے مزدوروں کو مفلس اور خستہ حال بنا دیگا: چنانچہ اکثر پسماندہ ممالک اور ہندوستان کے بعض دور افتادہ حصص میں یہی کیفیت نظر آتی ہے۔

لیکن اگر صرف اصل بڑھے یا آبادی و اصل ساتھ ساتھ بڑھیں تو زراعت ترک ہو کر صنعت و حرفت کا زیادہ رواج ہوگا؛ وجہ یہ ہے کہ زمین جو زراعت کی بنا ہے، رقبہ میں محدود ہے، اس پر طرہ یہ کہ زراعت میں قانون تقلیل حاصل کا عملدرآمد جلد شروع ہو جاتا ہے، اور اس میں قانون تکثیر حاصل سے بہت کم فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، اور اسی وجہ سے بہت زیادہ محنت و اصل کی اس میں کھپت نہیں ہو سکتی - اس کے برعکس اصل جو صنعت و حرفت کی روح رواں ہے، انسانی کوشش سے بہت کچھ بڑھ سکتا ہے اور بڑھ رہا ہے - مزید براں صنعت و حرفت میں اوّل تو قانون تقلیل حاصل کی ابتدائی حد واقع ہوتی ہے، پھر قانون تکثیر حاصل بھی موقع بموقع اس کا زور توڑتا رہتا ہے؛ نتیجہ یہ ہے کہ بمقابلہ زراعت کے صنعت و حرفت میں محنت و اصل کی بہت زیادہ مقدار شریک ہو سکتی ہے - چنانچہ واقعہ ہے کہ یورپ و امریکا جیسے ترقی یافتہ ممالک میں جہاں آبادی بھی گھنی ہے اور اصل کی بھی کثرت ہے، زراعت کے مقابل صنعت و حرفت بہت عروج پا رہی ہے - آجکل کے پسماندہ اور ترقی یافتہ ممالک کا سب سے بڑا امتیازی فرق اصل کی قلت و کثرت ہے؛ اور یہ بھی واقعہ ہے کہ پیداوار خام کی بہم رسانی اور خصوصاً زراعت پسماندہ ممالک کے سپرد ہے، اور مصنوعات کی تیاری بالخصوص صنعت و حرفت، ترقی یافتہ

ممالک نے سنگوار رکھی ہے۔ اوّل الذکر ممالک میں مزدور مفلس اور آخر الذکر میں مقابلۃً خوش ہیں۔ امید ہے کہ مندرجۂ بالا مباحث سے مختلف ممالک کے معاشی حالات سمجھنے اور انکی توجیہ کرنے میں ضرور مدد ملیگی ؛

ترکیب عاملین کا مضمون درحقیقت نہایت دقیق اور پیچیدہ ہے، اعلیٰ درجے کے انگریزی مصنفین میں سے بھی بہت کم نے اس کو واضح کرنے اور سلجھانے کی کوشش کی ہے؛ جو کچھ اوپر بیان کیا گیا وہ تازہ ترین تحقیق کا ماحصل ہے ؛

باب شانزدہم

دولتمندی و افلاس

(۱) سوشیلزم یا اشتراک کا مفہوم (۲) اشتراک کی تشریح و تنقید (۳) تقسیم دولت کی موجودہ حالت (۴) تجاویز اصلاح (۵) اشتراک سرکاری ؛

سوشیلزم یا اشتراک کا مفہوم

۱- کچھ عرصے سے ایک تحریک کا کل ترقی یافتہ ممالک میں بہت چرچا ہو رہا ہے اور اس کے حامیوں کی جماعت اور سرگرمی بھی روز بروز بڑھ رہی ہے؛ اس کا مشہور عالم نام **سوشیلزم** ہے جس کو ہم **اشتراک** سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ کسی زمانے میں یہ محض ایک اخلاقی اور معاشی مسئلہ مانا جاتا تھا، لیکن اب اس پر سیاسیات کا بھی گہرا رنگ چڑھ رہا ہے؛ حتیٰ کہ نیابتی حکومتوں کے انتخابات میں بھی اس کا اثر دخل پانے لگا ہے۔ بحث یہ ہے کہ موجودہ معاشی ترقیات کا بحیثیت مجموعی بنی نوع انسان کی مالی حالت پر کیا اثر پڑا ؟ ایک گروہ کا دعویٰ ہے کہ ان ترقیات کی بدولت زمیندار، اصلدار اور آجروں کی چھوٹی چھوٹی جماعتیں تو بیجا طور پر از حد دولتمند بن گئیں، اور انسانوں کا سب سے بڑا گروہ یعنی مزدور لوگ اور بھی مفلس اور خستہ حال ہو گئے! گویا جماعت قلیل کی مرفہ الحالی اور گروہ کثیر کی تنگدستی ساتھ ساتھ بڑھ رہی ہے۔ موجودہ معاشی ترقیات کو ایک نہایت موٹی آہنی میخ سے تشبیہ دی جاتی ہے جو کسی چپٹی ستون کی چوٹی کے قریب اندر ٹھونک دینے سے چھوٹے بالائی حصے کو اوپر اٹھائے اور نیچے والے بڑے حصے کو اور بھی دبا دے اور جسقدر زیادہ اندر گھسے ان دونوں حصوں میں بُعد اور علٰحدگی بڑھا دے۔ حضرت اکبر نے بھی اس دعوے کو یوں پیش کیا ہے ؎

لاکھوں کو مٹا کر جو ہزاروں کو ابھارے ؛ اس کو تو میں دنیا کی ترقی نہ کہونگا

اس دعوے کی علمی توجیہ و تائید میں یہ بھی ثابت کیا جاتا ہے کہ زمیندار، اصلدار

اور آجروں کی مختصر جماعتوں کی آمدنی نہ صرف بیجا، زیادہ بلکہ سراسر غیر مکتسب اور ناجائز بھی ہے، یعنی وہ آمدنی غریب مزدوروں کے گروہ کثیر کی کمائی میں سے غصب کر لی جاتی ہے؛ گویا تقسیم دولت کے مروجہ طریق کے مطابق ایک لوٹ اور اندھیر مچا ہوا ہے۔ دولتمندوں کی مختصر جماعت، غریبوں کی کمائی کا بڑا حصہ غصب کر کے خود تو لطف و عیش اڑاتی ہے، اور باقی سب کی زندگی تلخ اور ناقابل برداشت بنا رکھی ہے۔ اس افسوسناک حالت کی اصلاح کیواسطے گوناگون تدابیر و تجاویز پیش کی جاتی ہیں، جن میں سے بعض از حد انتہائی قسم کی ہیں: مثلاً یہ کہ موجودہ مالکوں سے کل زمین اور اصل حصین کو کل قوم کی مشترک ملک قرار دیدی جائے اور ہر شخص صرف اجرت کما کر زندگی بسر کرے؛ گویا سب مزدور بن جائیں، زمیندار، اصلدار اور آجر کوئی باقی نہ رہے۔ اور بعض معتدل ہیں: مثلاً سرکاری قوانین کی مدد سے بیجا آمدنیوں کو روکا جائے، تقسیم دولت میں حتی الامکان مساوات پیدا کی جائے، اور مزدوروں کو ہر قسم کی دستبرد سے محفوظ رکھا جائے۔ تجاویز اصلاح کے اختلافات کی بنا پر یوں تو اس تحریک کی متعدد انواع قرار پا چکی ہیں، لیکن دو قسمیں بہت مشہور اور ممتاز ہیں:- اشتراک انقلابی جس میں انتہائی قسم کی تبدیلیوں کا مطالبہ کیا جائے؛ اور اشتراک ارتقائی جس میں معتدل تدابیر کے ذریعے سے بتدریج اشتراک کے مقاصد حاصل کرنیکی کوشش کی جاوے۔ مسئلہ سوشیلزم یعنی اشتراک کی تفصیل نہایت طویل اور پیچیدہ ہے جس کیواسطے ایک جداگانہ ضخیم کتاب درکار ہے؛ یہاں ہم اسکے خاص خاص اور اہم نکات مختصراً پیش کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔ اس تحریک کا عام مفہوم تو اوپر بیان ہو چکا، اب اس کی مزید تشریح ضروری تنقید کے ساتھ پیش کی جاتی ہے تاکہ اگر کامل استحضار حاصل نہ ہو سکے تو ایک سادہ خاکہ ہی پیش نظر ہو جائے؛ اور امید ہے کہ اتنی معلومات بھی اشتراک کا بحث مباحثہ سمجھنے میں قابل قدر حد تک مفید ثابت ہوگی۔

اشتراک کی تشریح و تنقید

۴- اول اشتراکیین کے ان معاشی اصول کو لیجئے جنکی رو سے زمیندار، اصلدار اور آجر کی آمدنی یعنی لگان، سود اور منافع غیر مکتسب اور مزدور کی اجرت کا غصب شدہ حصہ ثابت کیا جاتا ہے۔ وہ اصول دو ہیں:- اول یہ کہ صرف محنت ہی

حصہ سوم
باب نہم

قدر و قیمت کی بنا ہے: یعنی ہر چیز میں قدر و قیمت محض اس محنت سے پیدا ہوتی ہے جو اس کی تیاری میں صرف ہو؛ کسی چیز کی قدر و قیمت میں زمین، اصل اور تنظیم کا کوئی حصہ نہیں ہوتا، جو کچھ ہوتا ہے وہ مزدور کا کیا دھرا ہوتا ہے، اور وہی کل پیداوار یا یوں کہیئے کہ پیداوار کی کل قدر و قیمت کا مستحق ہوتا ہے؛ زمیندار، اصل دار و آجر کون ہوتے ہیں جو اپنا حصہ بانٹیں۔ دوم اجرت جو مزدور کو ملتی ہے لازماً ناگزیر مایحتاج زندگی کے مساوی ہوتی ہے، دوسرے چیرہ دست طبقے جو مزدوروں پر حاوی ہو گئے ہیں ان کو اس سے زیادہ اجرت نہیں دیتے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پیداوار یا اس کی قدر و قیمت کے ایک قلیل جزو پر تو مزدوروں کو قناعت کرنی پڑتی ہے اور باقی پیداوار یا اس کی قدر و قیمت کو جو اصطلاحاً قدر زائد کہلاتی ہے، قابو یافتہ طبقے بطور لگان، سود اور منافع خود ہتیا لیتے ہیں؛ غریب مزدور جو سب کچھ پیدا کرتا ہے منہ تکتا رہجاتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ تنہا مزدور سب کچھ پیدا کرتا ہے، لیکن پیداوار میں دوسرے طبقے بھی شریک ہو جاتے ہیں؛ اور اس پر طرہ یہ کہ غریب مزدور بہت تھوڑا حصہ لیتے ہیں۔ ہر دو اصول اصطلاحاً حسب ترتیب مسئلۂ قدر زائد اور مسئلہ اجرت قفہ تھم کہلاتے ہیں۔ مدتوں ان کی بہت زور و شور سے منادی کی گئی اور پُرجوش مؤیدوں کے رعب میں آکر لوگوں نے ان اصولوں کی صحت میں بھی چون و چرا نہیں کی۔ لیکن بالآخر طلسم ٹوٹ گیا، اور لطف یہ ہے کہ جن معاشیئین نے عمر بھر نہایت شد و مد سے ان اصولوں کی تلقین کی، خود ان پر جب نقص و خامی نمایاں ہوئی تو نہایت اخلاقی جرأت سے کام لیکر ان میں سے بعض نے خود انکی عدم صحت کا نہ صرف اعتراف کیا بلکہ اپنی طرف سے اعلان بھی کرادیا۔ اس معاملے میں مشہور عالم فلاسفر مل کا طرز عمل خاص طور پر قابل ستائش و یادگار رہے کہ مدتوں مسئلۂ اجرت زیادہ کا سخت حامی رہا، اور جب کمتر معروف ہمعصروں نے اس مسئلے کی خامیاں واضح کیں تو نہایت صدق پسندی سے اس مسئلے سے اپنی دست برداری کا صاف اعلان کر دیا۔ مسئلہ قدر زائد کا بھی اس کے اکثر مؤیدوں کے ہاتھ سے یہی حشر ہوا؛ اور اب یہ مسائل صرف معاشی اور بالخصوص تحریک اشتراک کی تاریخ میں دلچسپ اور سبق آموز یادگار مانے جاتے ہیں؛ بلحاظ صحت و استدلال وہ تقریباً انکار رفتہ ہیں؛

تقسیم دولت کے اصول اس سے قبل بالتفصیل بیان ہو چکے ہیں، مسئلہ قدر قیمت سے مبادلہ دولت کے تحت بحث کی جائیگی۔ ان بیانات سے مقابلہ کرنے پر اشتراکیئین کے ہر دو مذکورہ بالا اصول کی خامی اور تنگی کا خوب اندازہ ہو سکتا ہے، اور یہ بھی بخوبی ثابت ہو جائیگا کہ پیدائش دولت کیواسطے زمین، اصل اور نیز تنظیم اسیقدر ضروری ہیں جتنی کہ محنت؛ کسی کا کسی پر فوقیت کا دعوی کرنا بے معنی ہے، سب ناگزیر ہیں۔ اور یہ دعوے کہ کل پیداوار صرف محنت کا نتیجہ ہے، اگرچہ تائید کے جوش میں معقول نظر آیا ہو، لیکن درحقیقت مضحکہ انگیز ہے۔ جہانتک جواز کا تعلق ہے، لگان، سود اور منافع، پیداوار کے ایسے ہی جائز حصے ہیں، جیسے کہ اجرت؛ وہ کسی طرح پر اجرت کے غصب شدہ حصے نہیں شمار ہو سکتے۔ اب رہا یہ سوال کہ لگان، سود اور منافع کے مالک کون بننے چاہئیں؟ آیا خود مزدور ہی زمیندار، اصلدار اور آجر بھی ہوں، یا آخر الذکر طبقے مزدوروں سے جداگانہ رہیں؟ اور بہردوصورت عام مرفہ الحالی پر کیا اثر پڑیگا؟ اور بلحاظ بہبودی کافۃ الناس کونسی صورت بہتر اور قابل ترجیح ہونی چاہئیے؟ یہ ایک دوسری بحث ہے جس کو ہم ابھی بیان کریں گے:-

زمینداروں، اصلداروں اور آجروں کی دولتمندی تو ہر کسی کو تسلیم ہے اور اشتراکیئیں کو اسی کا قلق اور شکایت ہے! فیصلہ طلب امر یہ ہے کہ مزدوروں کی مالی حالت بمقابلہ سابق کے اب کیسی ہے؟ آیا وہ بقول اشتراکیئیں روز افزوں افلاس کا شکار ہو رہے ہیں؟ یا وہ بھی بہ نسبت اپنے آبا و اجداد کے زیادہ آسودہ اور خوشحال ہو گئے ہیں؟ یہاں افلاس و خوشحالی کی مختصر تشریح ضروری اور برمحل معلوم ہوتی ہے۔ کسی طبقے کے مفلس ہو جانیکا مفہوم یہ ہے کہ اسکو بہ نسبت سابق کمتر ضروریات میسر آئیں، اسکے کمتر افراد کو سابق کی کل ضروریات حاصل ہوں۔ اسکے برعکس خوشحالی سے مراد یہ ہے کہ بہ نسبت سابق بہت زیادہ ضروریات پر دسترس ہو، یا زیادہ بڑی جماعت کو سابق کی ضروریات حاصل ہوں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مالی حالت کے وہ کیا قابل عمل معیار ہو سکتے ہیں، جنکے ذریعے سے ہم کو کسی طبقے کے خوشحال یا مفلس ہونیکا بآسانی پتا چل سکے؟ دولتمندی و افلاس کے مذکورۃ الصدر مفہوم سے معیاروں کا صاف پتا چلتا ہے: اول کسی طبقے کی تعداد، دوم اسکی ضروریات۔ اگر دونوں میں اضافہ ہو تو خوشحالی یقینی ہے، اگر کمی ہو تو افلاس میں کچھ شک نہیں ہو سکتا؛

نیز تعداد میں تخفیف اور ضروریات میں سکون، یا تعداد میں سکون اور ضروریات میں کمی، دونوں افلاس کی علامت ہیں۔ اسی طرح پر تعداد کے اضافے اور ضروریات کے سکون، یا تعداد کے سکون اور ضروریات کے اضافے سے خوشحالی کا پتا چلتا ہے۔ علاوہ بریں کسی طبقے کے اوسط اموات اور اوسط عمر سے بھی اسکی مالی حالت پر قابل لحاظ روشنی پڑتی ہے۔ انگلستان سا ملک اس فیصلہ طلب امر کی تحقیق کیواسطے کہ آیا معاشی ترقیات سے طبقہ مزدوران میں افلاس بڑھ رہا ہے یا مرفہ الحالی، دو وجہ سے نہایت مناسب ہے: اوّل تو وہاں جدید معاشی ترقیات کا خوب دور دورہ ہے، دوم وہاں ملکی اور غیر ملکی ہر قسم کی پیداوار جو صرف میں آئے بڑے اہتمام سے درج رجسٹر کی جاتی ہے، جس سے صاف اندازہ ہوجاتا ہے کہ کسی طبقے کی ضروریات میں تخفیف ہورہی ہے یا اضافہ؛ نیز پیدائش و فوتی کی صحت کے متعلق وہاں کی سرکاری یادداشت بہت زیادہ قریب صحت اور مکمل ہوتی ہے۔ اگر یہ اعداد و شمار سراسر درست اور قابل اعتماد نہ بھی سہی تاہم ان سے مالی حالت کا مذکورۂ بالا اصول کے مطابق ضروری حد تک اندازہ بخوبی ہوسکتا ہے، دوم ان سے زیادہ معتبر کوئی دوسرا معیار بھی میسّر نہیں آسکتا۔ پس ہم کو انھی ذرائع پر قناعت کرکے ان سے جو معلومات حاصل ہوں اسکی بنا پر مالی حالت کے متعلق کوئی رائے قائم کرنی چاہیئے۔ اعداد و شمار موجود ہیں، ان سے صرف یہی ایک نتیجہ نکلتا ہے کہ بہ نسبت سابق مزدوری پیشہ عوام کی مالی حالت کہیں بہتر ہے اور روبہ ترقی ہے! اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا اشتراکیین سراسر بیخبر تھے یا انکو دھوکا دہی منظور تھی کہ افزونی افلاس کا انھوں نے بے بنیاد شور مچا دیا؟ اسکے کئی وجوہ ہیں: اول تو یہ کہ اتفاق سے اشتراک کے پرجوش موید معاشی انقلاب کے دوران میں پیدا ہوئے اور عارضی مگر نہایت قوی اثرات سے اسقدر متاثر ہوئے کہ انھوں نے ان اثرات کو مستقل قرار دے دیا۔ یہ سچ ہے کہ گزشتہ دو صدیوں میں مزدوری پیشہ طبقوں پر بڑا نازک وقت گزر گیا اور زمیندار، اصلدار اور آجروں کے طبقوں نے وہ عروج پایا کہ دنیا حیران رہ گئی یہی وہ زمانہ تھا جبکہ نت نئے انجن اور کلیں ایجاد ہوئیں، کارخانے جاری ہوئے، کلوں کی بدولت اصل کا زور بندھا، مزدور آجروں کے دست نگر ہو گئے؛ ایک طرف تو ہزارہا مزدور بیکاری میں مبتلا ہوئے، دوسری طرف کارخانے والے دنیا کی دولت سمیٹنے لگے، جو مزدور کام سے بھی لگے تھے سرکاری نگرانی

نہ ہونے کی وجہ سے کارخانوں میں انکی صحت و اخلاق کی حالت ناگفتہ بہ تھی؛ کارخانہ دار گویا آقا تھے اور مزدوران کے غلام، یہ کماتے اور وہ لطف اڑاتے تھے۔ مگر آندھی کے جھونکے کی مانند یہ حالات چند روزہ تھے، رفتہ رفتہ بوجہ ارزانی پیداوار صنعت و حرفت نے ترقی پائی تو بیکاری کی شکایت بھی بہت کچھ رفع ہونے لگی، اور بہ نسبت سابق صدہا گنے مزدور کاروبار سے لگ گئے۔ ایک چھاپے کی ایجاد کو لو! آج کروڑہا آدمی پریسوں میں ملازم ہیں۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس ایجاد بغیر موجودہ تعداد کا عشر عشیر بھی کتابت کرکے روٹی کما سکتا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ اوّل اوّل کلوں کی ایجاد سے مزدوروں پر ضرور بیکاری کی مصیبت طاری ہوتی ہے، لیکن صنعت و حرفت متعلقہ کی مابعد ترقی سے یہ شکایت بتدریج رفع ہو کر بالآخر کلوں ہی کے طفیل سے مزدوروں کی مانگ اسقدر بڑھ جاتی ہے کہ بہت زیادہ لوگ روزی کمانے لگتے ہیں۔ اس سے قبل کلوں کا مزدوروں کی حالت پر اثر واضح کیا جا چکا ہے، معاشی انقلابات کے زمانے میں گوناگوں انکشافات و ایجادات کی بدولت مزدوروں کی حالت اکثر ناقابل اطمینان بلکہ افسوسناک ہو جاتی ہے۔ لیکن وہ زمانہ بھی یہی ہوتا ہے جبکہ لوگ حسن اتفاق، خوش قسمتی یا عقلمندی سے غرضکہ کسی نہ کسی طرح بڑی بڑی دولتیں جمع کر لیتے ہیں۔ چنانچہ یورپ کے مشہور کروڑپتی اصلدار اور آجروں کی جڑ اسی زمانے میں جمی جبکہ ہر طرف معاشی انقلابات کا طوفان برپا تھا۔ سکون قائم ہونیکے بعد مقابلے کے دباؤ سے سب کاروبار ایک سطح پر آ لگتے ہیں اور اس زمانے میں غیر معمولی ترقی کرنا نہایت دشوار بلکہ اکثر محال ہو جاتا ہے؛ باوجود بہت کچھ جد و جہد کرنے کے بھی معمول سے زیادہ دولت ہاتھ نہیں لگ سکتی۔ ہر تجربہ کار اور سمجھدار آجر اس واقعے کی تصدیق کر سکیگا۔ انکم ٹکس کے اعداد و شمار سے ثابت ہوتا ہے کہ ہر ترقی یافتہ ملک میں متوسط درجے کے دولتمندوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے اور اعلیٰ درجے والے دولتمندوں کے اضافے کی رفتار روز بروز گھٹ رہی ہے! انجمن سرمایۂ مشترک اور بنکوں کے اعداد و شمار سے بھی واضح ہوتا ہے کہ دولت اب زیادہ پھیل رہی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ معاشی انقلابات کے زمانے میں مزدور پریشان حال اور خوش قسمت اصلدار و آجر بیحد مرفہ الحال بن جاتے ہیں۔ کچھ

عرصے تک یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا معاشی ترقیوں سے ایک مختصر جماعت کی دولتمندی
اور نہایت کثیر گروہ کے افلاس میں ساتھ ساتھ اضافہ ہونا لازمی ہے؛ لیکن بالآخر
حالات پلٹا کھاتے ہیں، مزدور کی حالت سدھرنی شروع ہوتی ہے، حتیٰ کہ وہ بہ نسبت
سابق بدرجہا بہتر اور عمدہ ہوجاتی ہے، اور ساتھ ہی غیر معمولی خوش قسمتوں کی تعداد
گھٹنے لگتی ہے، نئے نئے کروڑپتی تو کم پیدا ہوتے ہیں، اور ان کے بجائے بہت سے
متوسط درجے کے دولتمند نمودار ہونے لگتے ہیں۔ اکثر ہمعصر اشتراکیئین پر انقلاب
کے عارضی مگر خوفناک اثرات کی ہیبت اسقدر طاری ہوئی کہ وہ گھبرا اٹھے اور
معاشی ترقیات کو عالمگیر تباہی کا آلہ قرار دے دیا، لیکن جب انقلاب کا طوفان
پورے طور پر فرو ہوچکا تو ان خوفناک اثرات نے کم و بیش قابل اطمینان صورت
اختیار کرلی۔ یہی وجہ ہے کہ جدید اشتراکیئین کی رائے اور تجاویز میں وہ سخت گیری
اور تشدد نہیں پایا جاتا جو ان کے پیش روؤں میں تھا؛ اور بحیثیت مجموعی یہ تحریک
انتہا گزینی سے اعتدال پسندی کی طرف مائل ہوتی جاتی ہے۔

عہد جدید جس کا باقاعدہ آغاز انقلاب فرانس سے شمار کیا جاتا ہے آزادی،
مساوات اور عام بیداری کے لحاظ سے خاص طور پر ممتاز ہے۔ رسم غلامی کا خاتمہ ہوا،
قابو یافتہ طبقوں کا زور ٹوٹا، آئینی اور نیابتی حکومتوں نے جڑ پکڑی، عوام میں اپنے
حقوق کا احساس پیدا ہوا، بطریق نیابت سلطنت کے نظم ونسق میں ان کو بھی دخل ملنے
لگا، اور بتدریج کل باشندگان کو سیاسی آزادی حاصل ہوگئی؛ ساتھ ہی ساتھ عوام
میں تعلیم بھی ہر طرف پھیلی، اور حصول تعلیم کے واسطے طرح طرح کی سہولتیں مہیا
کردی گئیں۔ علم کسی خاص طبقے کی میراث نہیں رہا؛ بلکہ اس کے حاصل کرنے کی
ہر شخص کو کامل آزادی مل گئی اور نیز آسانیاں پیدا ہوگئیں: گویا دماغی اور تعلیمی حالت
میں بھی بہت کچھ مساوات نمودار ہونے لگی۔ سیاسی آزادی اور اشاعت تعلیم کا
لازمی نتیجہ عام بیداری ہوا، لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں، وہ اپنے حقوق سمجھنے لگے اور
اپنی حالت سدھارنے کا ان میں ولولہ پیدا ہوگیا، عوام کے سیاسی حقوق مساوی
قرار پاگئے، اور تعلیمی حالت بہت کچھ یکساں ہوگئی۔ سوسائٹی میں بھی ذات پات
کی تفریق گھٹنے لگی؛ گویا سیاسی دماغی اور نیز سوشیل تفریقیں مٹ کر سب میں

مساوات پھیل گئی، لیکن مالی حالت میں اب بھی زمین و آسمان کا فرق بکثرت قائم ہے۔ جبکہ ہر طرف مساوات کی رو بہ رہی ہو، مالی حالت کے فرق جس قدر ناگوار معلوم ہوں کم ہیں: چنانچہ باوجودیکہ مزدوری پیشہ طبقوں کی حالت بہ نسبت سابق بہتر ہو گئی لیکن پھر بھی ان کو دوسرے دنیکی دولتمندی شاق گزرتی رہی اور اپنی بہتر حالت، ان کو افلاس سے بھی بدتر معلوم ہونے لگی۔ چنانچہ بعض اشتراکیین نے مزدوروں کی مالی حالت بہ نسبت سابق فی نفسہ بہت بہتر تسلیم کرنے پر ان کو اس وجہ سے مفلس قرار دیا ہے کہ بعض دیگر طبقے ان سے بہت زیادہ دولتمند بن گئے، گویا دوسروں کے مقابل مزدوروں کی کمتر ترقی کو وہ تنزل سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کی مثال بعینہ ایسی ہے کہ دو ریل گاڑیاں ایک ہی سمت کو دوڑیں اور ان میں سے ایک زیادہ تیز رفتار ہو، تو چونکہ کمتر رفتار والی گاڑی پیچھے رہ جائے، اس لئے نتیجہ نکال لیا جائے کہ وہ آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹ رہی ہے!

حاصل کلام یہ کہ بحیثیت مجموعی مزدوروں کی مالی حالت بہ نسبت سابق ضرور بہتر ہوگئی ہے، مفلس ہونے کے بجائے اب وہ مقابلۃً خوشحال ہوتے جاتے ہیں؛ لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کی ترقی کی رفتار سست ہے اور باوجود بہتر ہونے کے ان کی مالی حالت ہرگز قابل اطمینان نہیں۔ دیگر طبقے بہت زیادہ دولت سمیٹ رہے ہیں، اور جیسا کہ ہم ابھی اعداد و شمار سے ثابت کریں گے، دولت از حد غیر مساوی حصوں میں تقسیم ہو رہی ہے۔ المختصر اشتراکیین کے بیانات خلاف واقعہ اور مبالغہ آمیز بھی ہوں تب بھی تقسیم دولت کا موجودہ طریق اصلاح طلب ضرور ہے؛

تقسیم دولت کی موجودہ حالت

۳ - مروجہ طریق تقسیم دولت کی علمی تشریح و توجیہ اوپر ہو چکی ہے، جس سے واضح ہوا ہوگا کہ منجملہ چہار حصص پیدائش اجرت تو سب سے بڑی جماعت میں تقسیم ہوتی ہے، اور لگان، سود و منافع، زمیندار و اصلدار اور آجر وغیرہ چھوٹی چھوٹی جماعتیں رول لیتی ہیں۔ ان تینوں حصوں کی مقدار اجرت سے کہیں زیادہ ہے اور اس پر طرہ یہ کہ افزونی آبادی، سہولت آمد و رفت، استعمال مشین، پیدائش بر پیمانہ کبیر، تنظیم کاروبار جیسی معاشی ترقیوں کی بدولت جس قدر ان میں خود بخود اضافہ ہو رہا

ہے، اس کا نصف بھی باوجود ہزار جدوجہد، اجرت میں نظر نہیں آتا! اس فرق کا باعث عاملین کے خواص میں مضمر ہے جن کی اس سے قبل تشریح کی جا چکی ہے۔ نہ صرف یہ کہ فرداً فرداً مزدور کو زمیندار، اصلدار یا آجر کے مقابلے میں پیداوار کا بہت کم حصہ ملتا ہے بلکہ یہ قلیل مقدار حاصل کرنے کے واسطے بھی وہ آجکل اصلدار و آجر کی دستگیری کا محتاج ہے۔ پیدائش بر پیمانۂ کبیر کے رواج نے بطور خود روزی کمانے سے اس کو بالکل معذور کر دیا۔ زمین و پیداوار زمین جو اس کی ضروریات کا جزو اعظم ہے گراں ہو ہو کر زمیندار کو مالا مال اور غریب مزدور کو زیر بار کر رہی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ زمیندار، اصلدار اور آجروں کی چھوٹی چھوٹی ذی اقتدار اور دولتمند جماعتوں کے مقابلے میں غریب مزدوروں کا سب سے بڑا گروہ بہت کمزور اور بے بس نظر آتا ہے: جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ مزدوروں کی حالت بہ نسبت سابق بدتر ہے، صرف یہ جتانا مقصود ہے کہ جدید معاشی ترقیاں بھی مزدوروں کے کمتر موافق ہیں؛ اور مقابلتہً زمینداروں، اصلداروں اور آجروں کی از حد معاون بن کر انھوں نے مزدوروں کی حالت مستحق اعانت بنا رکھی ہے۔ ہم نے مانا کہ مجموعی طور پر مزدوروں کی مالی حالت بہتر ہے، اور اضافۂ دولت کے ساتھ ایسا ہونا کیا تعجب ہے، لیکن در اصل بحث یہ ہے کہ آیا ان کی مالی حالت قابل اطمینان بھی ہے؟ فرض کرو کہ دولت میں بقدر ۲۰ فی صدی اضافہ ہو، اور ان میں سے صرف تین چار فی صدی تو غریب مزدوروں کے گروہ کثیر کو ملے اور باقی کل چند مختصر طبقے سمیٹ لیں تو کیا مزدوروں کی ایسی ترقی کچھ ترقی کہلا سکتی ہے؟ البتہ ع

دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

مزدوروں کی موجودہ حالت جو کچھ ہے وہ بہ نسبت سابق بہتر سہی لیکن اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس کو اب بھی بہت زیادہ بہتر ہونا چاہئے۔ اور اشتراکیین کی خصوصیت نہیں سب عالی حوصلہ اور باخبر لوگ اس خیال سے سراسر متفق ہیں ؟

ترقی یافتہ ممالک میں تقسیم دولت کی عدم مساوات دیکھ کر آدمی چونک پڑتا ہے! چند قابل لوگوں نے نہایت احتیاط اور عرق ریزی سے تقسیم دولت کے

معتبر تخمینے تیار کئے ہیں جن کے اعداد و شمار حسب ذیل ہیں :-

امریکا میں ۲/۵ ۱ فی صدی آبادی ۷۰ فی صدی سے زیادہ مجموعی دولت کی مالک ہے، ۱۲ فی صدی دولت ۱/۵ ۹ فی صدی آبادی کی ملک ہے، اور باقی ۱۸ فی صدی دولت ۲/۵ ۸۹ فی صدی آبادی میں منقسم ہے۔ ایک دوسرے تخمینے کے مطابق صرف ۱/۱۰ فی صدی آبادی ۲۰ فی صدی دولت، ۹/۱۰ ۸ فی صدی آبادی ۵۱ فی صدی دولت، اور باقی ۹۱ فی صدی آبادی صرف ۲۹ فی صدی دولت کی مالک ہے۔ تیسرا تخمینہ ہے کہ امریکا میں کچھ کم نصف خاندانوں کے پاس تو برائے نام بھی اندوختہ نہیں، روز کنواں کھودنا اور پانی پینا، صرف ۱/۸ دولت ۷/۸ خاندانوں کی ملک ہے، اور ایک فی صدی خاندانوں کی دولت باقی ۹۹ فی صدی خاندانوں کی دولت سے کچھ زیادہ ہی ہے، کم نہیں۔ بلحاظ غیر مساوی تقسیم دولت کے انگلستان کی حالت اور بھی ابتر ہے : تین چوتھائی لوگوں کے نام کسی قسم کی ملک و جائداد درج رجسٹر نہیں، ان کے مال و اسباب کی مجموعی قیمت بھی ڈیڑھ ارب روپے سے زیادہ نہ ہوگی۔ ۹۳ فی صدی آبادی کے پاس تو بمشکل ۸ فی صدی دولت ہوگی، اور ۲ فی صدی خاندانوں کی ملک باقی ۹۸ فی صدی کے مقابلے میں سہ گنی سے بھی زیادہ ہے۔ سلطنت برطانیۂ عظمیٰ کے مرکز لندن کا حال ذرا ملاحظہ ہو! جہاں مغربی حصے میں سر بفلک عمارات اور انبار تعیشات، لامحدود دولت کا حیرت انگیز منظر دکھاتے ہیں، مشرقی حصے کے خام و خستہ جھونپڑوں میں خدا کی لاکھوں بے برگ و نوا مخلوق حیوانات سے کچھ ہی بہتر زندگی بسر کرتی ہے۔ جوانی میں فطرۃً جرأت طلب کام کرنے کو دل چاہا کرتا ہے، ایک مشہور انگریزی مصنف نے ایسے کاموں کے سلسلے میں شہ پر گھوڑا دوڑانے، کد لنے، طوفان میں تیرنے، کشتی چلانے اور آتش زدہ مقامات میں گھس پڑنے کے علاوہ لندن کے مشرقی حصے سے دن دہاڑے گزرنے کا بھی ذکر کیا ہے! تحقیق سے معلوم ہوا کہ وہاں کے غرق نکبت و افلاس باشندے بھوک اور شدت سرما سے جھنجھلا کر وحشیوں کی مانند راہ گیروں پر جھپٹتے اور انکو دق کرتے ہیں۔

عام خیال ہے کہ تقسیم دولت کی عدم مساوات امریکا میں سب جگہ سے بڑھی ہوئی ہے، مگر درحقیقت انگلستان اس معاملے میں سب سے پیش پیش ہے۔ انکم ٹیکس

بابِ پانزدہم کے سلسلے میں انگلستان اور امریکا میں ۱۹۱۶ء میں کروڑپتیوں کی تعداد حسب ذیل دریافت ہوئی۔

ہر کروڑپتی کی دولت	ایسے کروڑپتیوں کی تعداد	
	سلطنت متحدہ برطانیہ و آئرلینڈ	ریاستہائے متحدۂ امریکا
تقریباً چالیس کروڑ روپے	۷۹	۱۰
تقریباً بیالیس کروڑ روپے	۶۸	۹
چھبیس اور بتیس کروڑ کے درمیان	۴۵	۱۴
سولہ کروڑ کے قریب	امریکا سے ۱۹ زیادہ	نامعلوم
آٹھ اور بارہ کروڑ کے درمیان	۸۳	۹۷

دیگر ترقی یافتہ ممالک کا حال بھی کم و بیش امریکا اور انگلستان ہی کا سا ہے، جہاں دولت بسرعت بڑھ رہی ہے۔ تقسیم تو وہ سب میں ہوتی ہے اور اسی لیے بہ نسبت سابق مالی حالت سدھرتی جاتی ہے، لیکن حصے بہت غیر مساوی ہوتے ہیں۔ بعض تاجر یافتہ مختصر جماعتوں کو بہت زیادہ ملتا ہے اور مزدوروں کے گروہ کثیر کو مقابلۃً کم۔ تقسیم دولت کی عدم مساوات جب تحقیق ہو چکی تو اب اس میں مناسب مساوات پیدا کرنے کی تدابیر پر غور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے:۔

تجاویز اصلاح

۴۔ واضح ہو کہ سوشیلزم کی بحث میں انفرادی املاک پر از حد رد و قدح کی جاتی ہے۔ اس طریق کی ایک خوبی تو مسلم ہے، اس سے پیدائش و پس اندازی دولت کا شوق از حد بڑھتا ہے؛ لیکن تقسیم دولت کی روزافزوں عدم مساوات کا خاص الخاص باعث بھی یہی طریق قرار دیا جاتا ہے۔ انفرادی املاک طریق کی ابتدا اور توسیع کا مفصل حال اصول قوانین کی کتابوں میں مذکور ہے؛ یہاں اسکا اعادہ ضروری نہیں۔ اس طریق کے صرف معاشی نتائج واضح کرنا اور تجاویز اصلاح جانچنا ہمارے مطلب کے واسطے کافی ہے۔ انفرادی املاک سے چند حقوق وابستہ ہیں جو موجودہ عدم مساوات کے بانی ہیں، اور جن کی قانون ہر ملک میں حمایت کرتا ہے۔ مالک انفرادی ذاتی صرف میں آنے کے علاوہ دوسروں کو بطور ورثہ، ہبہ یا

وقف منتقل کی جاتی ہے، نیز بلا معاوضہ یا کسی معاوضے پر عاریتہً دی جاسکتی ہے، اور جدید معاشی ترقیات کی بدولت بہ نسبت سابق اب اس سے عمل پیدائش میں کہیں زیادہ کام لینا اور ما حصل زائد کی بڑی بڑی مقدار بشکل لگان، سود اور منافع وصول کرنا باسانی ممکن ہے۔ ان حالات سے دو نتیجے پیدا ہوتے ہیں: اول یہ کہ بہت سے لوگ بلا محنت مشقت بڑی بڑی دولتوں کے مالک بن کر نہایت عیش و راحت کی زندگی بسر کر رہے ہیں، حالانکہ بہت سے کام کرنے والوں کو جائز ضروریات بھی بدقت دستیاب ہوتی ہیں؛ دوسرے محض انفرادی املاک کی بدولت تھوڑے سے لوگ تو بطور زمیندار، اصل دار و آجر کثیر پیداوار کے مالک بن بیٹھے اور باقی کل تہی دست مزدور رہ گئے، جو نہایت قلیل معاش کے واسطے ان کی دستگیری کے محتاج بھی ہیں اور انکی آمدنی بڑھانے میں معاون بھی۔ جو لوگ ہزار ہا روپے آمدنی کی جائداد کے مالک ہوں انکی قسمت کا کیا کہنا، خود کمانے کی قابلیت ان میں کتنی ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو، محنتی کاشتکار شب و روز جان کھپانے اور خون پانی کرنے سے جو کچھ کما سکیں، اسکا صدہا گنا وہ ہاتھ پیر ہلائے بغیر وصول کر لیتے ہیں۔ کارندوں کے ہاتھ سے جو تھوڑا بہت نقصان پہنچتا ہے اس کی پروا نہ ہو تو انتظام اور نگرانی ریاست کے دردسر سے بھی نجات ممکن ہے، اگر ان کی ریاست کے قرب و جوار میں ریل یا نہر نکلے، کوئی عدالت، دفتر یا مدرسہ قائم ہو، منڈی یا بازار کھلے، یا آبادی بڑھے تو خواہ مخواہ انکی زمینوں کی قیمت اور آمدنی بھی ضرور بڑھیگی، حالانکہ مذکورالصدر تبدیلیوں میں انکی برائے نام بھی شرکت نہ ہو۔ اسی طرح پر اگر کسی کے پاس کچھ رقم ہو اور وہ اس کو کسی معتبر بنک میں داخل کر دے، یا اسٹاک خرید کر سرکاری قرض خواہ بنے، یا کسی قابل اعتماد کاروبار کے حصے خرید کر صرف منافع کا شریک ہو جائے، اسکی جسمانی صحت، دماغی قابلیت، اور اخلاقی چال چلن کی حالت کیسی ہی ابتر کیوں نہ ہو، خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں جا کر رہے، ہر حالت میں بلا ناغہ اسکو آمدنی ملتی رہنی تقریباً یقینی ہے۔ چنانچہ بہت سے لوگ اپنا کل سرمایہ کسی بنک وغیرہ میں داخل کر کے سود کی آمدنی سے عیش و عشرت اور سیر و شکار میں رشک کے قابل زندگی بسر کرتے ہیں۔ آجر اگرچہ بمقابل زمیندار و اصلدار بہت زیادہ کام کرتا ہے لیکن وہ انفرادی املاک و معاشی

اسباب کی مدد سے اپنی محنت سے کہیں زیادہ معاوضہ پاجاتا ہے اور زندگی کا لطف اٹھاتا ہے، لیکن خدا کی گروہا مخلوق ہے جسے محنت کرتے کرتے صبح سے شام ہو جاتی ہے اور سوائے علالت یا آزار رساں بیکاری کے بچپن سے بڑھاپے تک ان کو کبھی فراغت سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوتا، اور کچا پکا جھونپڑا، موٹا جھوٹا کپڑا، اور روکھا پھیکا کھانا، انکی ضروریات کا منتہی ہے۔ طبقہ مزدوراں اور زمینداروں، اصلداروں اور آجروں کے گروہ میں سوائے اس کے کوئی عام اور مستقل فرق نہیں کہ وہ تہی دست ہیں، اور انکے پاس دولت ہے۔ ہم نے مانا کہ محنت کے علاوہ زمین، اصل اور نیز تنظیم پیدائش دولت کیواسطے ناگزیر ہیں، اور انکی پیداوار لگان، سود، منافع بجا اور درست ہیں، لیکن انکو بطور انفرادی املاک کیوں قائم رکھا جائے کہ پیداوار کا جزو کثیر تو مالکوں کے چند طبقے سمیٹ بیٹھیں اور تھوڑے سے بچے کھچے پر باقی لوگوں کو صبر کرنا پڑے۔ کیا اچھا ہو کہ زمین اور اصل یہ دونوں عاملین پیدائش عوام کی قائم مقام یعنی گورنمنٹ کی ملک بن جائیں، اور ان کی آمدنی چونکہ بیشتر عام معاشی ترقیوں کا نتیجہ ہوتی ہے، سرکاری خزانے میں داخل ہو کر کل ملک کے کام آئے۔ لوگ سرکاری زمینیں جوتیں، بوئیں، یا سرکاری کارخانوں میں کام کریں۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ سب کی کمائی ایک قومی بیت المال میں داخل ہوتی اور اس میں سے ہر شخص جائز ضروریات کیواسطے خرچ لے لیا کرتا۔ لیکن جب تک خود غرضی کے بجائے انسان مجسم بے غرضی نہ بن جائے، اس طریق پر عملدرآمد خواب و خیال سے بھی باہر ہے۔ پس جو جسقدر محنت کرے اسکی اجرت لے لے، جو کچھ ماحصل زائد ہو سرکار کو ملے اور سرکار اپنی طرف سے عام بہبودی پر صرف کرے۔ لوگ بطور اجرت جو کچھ کمائیں اسے کھائیں پئیں یا آڑے وقت کیلیے بچائیں۔ لیکن بطریق انفرادی املاک نہ تو وہ بطور ورثہ یا ہبہ اسکو منتقل کر سکیں، نہ بطور خود اس سے پیدائش دولت میں کام لے سکیں؛ گویا انکی کمائی محض ناقابل انتقال دولت ہو، اور کچھ نہیں ؛

حاصل کلام یہ کہ انفرادی املاک کا طریقہ بند کر کے کل زمین اور اصل سرکاری ملک قرار دینا، نیز تنظیم کا کام گورنمنٹ کے سپرد کرنا گویا زمینداروں، اصلداروں اور آجروں کے گروہ کو توڑنا، لگان، سود اور منافع سرکاری تصرف میں دے دینا اور

عوام کے لیے سوائے محنت و اجرت کے کوئی اور ذریعۂ معاش باقی نہ چھوڑنا؛ اور تاکہ جدید نظام برقرار رہ سکے، کمائی سے تا حین حیات اپنی اور اپنے کنبے کی پرورش کرنا لیکن نہ اس کو بطور ورثہ پس ماندوں کو منتقل کر سکتا، نہ اس سے بطور عامل پیدائش کوئی کام لے سکتا۔ بالفاظ مختصر کمائی کو محض دولت ناقابل انتقال قرار دے دینا یہ سب تجاویز سٹیٹ سوشلزم کی پیش کردہ ہیں۔ انکی غرض واحد انفرادی املاک کا طریق روک کر دولت و آمدنی غیر مکتسب کے ذرائع بند کرنا ہے تاکہ ہر شخص اپنی قوت بازو سے روزی کمائے، نہ بذریعہ ورثہ یا ہبہ، دوسرے کے اندوختے پر چین اڑائے، نہ سوائے محنت کے کسی اور عامل پیدائش کی پیداوار سمیٹے تاکہ تقسیم دولت میں تشویشناک عدم مساوات پھیلتی جاتی ہے، رفع ہو جائے۔ جبکہ پیداوار صرف بلمعیار محنت تقسیم ہوگی تو اول تو لوگوں کی مالی حالت میں موجودہ فرق کا عشر عشیر پیدا ہونا بھی ممکن نہیں۔ اور اس طریق سے اگر دوسروں کے مقابلے میں کسی کے پاس زیادہ دولت ہوگی بھی تو سراسر جائز اور واجبی ہوگی؛ گاڑھے پسینے کی کمائی ہوگی، نہ کہ حسن اتفاق کا نتیجہ۔ واضح ہو کہ بعض نے بحیثیت مجموعی انفرادی املاک کے متعلق اتنی رعایت گوارا کی ہے کہ خالص اجرت کا اندوختہ جو کسی حالت میں بہت زیادہ نہیں ہو سکتا، بطور ورثہ یا ہبہ منتقل ہو سکتا ہے۔ لیکن خود مالک یا وارث اس کو بطور عامل پیدائش استعمال کر کے آمدنی غیر مکتسب حاصل نہیں کر سکتے۔ نیز بعض کا خیال ہے کہ چونکہ اضافۂ اصل و ترقی کاروبار بغیر انفرادی املاک کے محال ہے، لہذا ان میں کوئی ردّوبدل کرنا خلاف مصلحت ہوگا۔ صرف زمین جو کہ عطیۂ قدرت ہے قوم کی مشترک ملک ہونی چاہیئے، چنانچہ اس تجویز سے ہم لگان کے تحت میں مختصراً بحث کر چکے ہیں؛

مذکور الصدر تجاویز پر غور کرنے سے بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ اشتراکیین نے مساوات تقسیم کے جوش میں انسانی فطرت اور عام مشاہدات کو بری طرح سے نظرانداز کیا ہے۔ اور جو خرابیاں رفع کرنی مقصود ہیں، ان سے بھی بدتر خرابیاں ان کی پیش کردہ تجاویز کے عملدرآمد سے پیدا ہونے کا قوی اندیشہ ہے۔ فیاضی اور بہبودی عامہ کی خواہش، مذہب، اخلاق اور روشن خیالی کی بدولت خواہ کتنی ہی قوی اور عالمگیر کیوں نہ ہو جائے، لیکن ذاتی، اور میری منفعت، ہمیشہ سے ترقی کی روح رواں

چلی آتی ہے اور رہے گی؛ یہ تو عام قانون فطرت ہے۔ دوسروں کی خاطر سے جد وجہد گوارا کرنا ہمیشہ ایک عارضی استثنا ثابت ہوا ہے اور ہوتا رہیگا۔ انسانی خلق اور سرشت میں کایا پلٹ ہو جائے تو دوسری بات ہے، ورنہ انفرادی املاک کا طریق توڑنے اور اندوختے کو بطور اصل، عمل پیدائش میں لگانے سے روکنے کا یقینی نتیجہ کاروباری تنزل اور معاشی زوال ہوگا۔ جبکہ اندوختہ اصل بن سکے نہ ورثہ تو پھر لوگ پس انداز کیوں کرنے لگے! اگر کچھ بچائیں گے بھی تو بس اتنا کہ تاحین حیات برے وقت کام آئے، ورنہ صرف اتنی محنت کرینگے کہ اس کی اجرت سے ضروریات ماحضر حاصل ہوتی رہیں! نیز اگر اندوختہ ورثہ بن سکے، لیکن بطور اصل استعمال نہ کیا جا سکے تو بھی پس اندازی میں کوئی نمایاں اضافہ نہ ہوگا۔ ابتک تو جو لوگ پس اندازی کی استطاعت نہیں رکھتے انکے سامنے بھی انفرادی املاک کی دلکش منزل مقصود تو موجود ہے، جس کی طرف ترقی کی امنگ انکو کھینچتی رہتی ہے۔ لیکن جب کل دولت یا کم از کم اصل پر سرکاری املاک کی سد سکندری قائم ہو جائیگی تو جو لوگ پس انداز کر رہے ہیں، انکی بھی امنگیں سرد اور ہمتیں پست ہو جائیں گی۔ محنت کا شوق بھی گھٹ جائیگا اور اضافہ اصل میں سخت رکاوٹ پیش آنی یقینی ہوگی۔ مزید برآں جبکہ کاروبار سرکاری ملازمین کے ہاتھ میں ہوگا اور منفعت ذاتی غائب ہونے کی وجہ سے کسی کو اس سے ذاتی غرض اور دلچسپی بھی نہ ہوگی تو دیگر عاملین کی قوت پیدائش میں بھی ضعف آنا عجب نہیں۔ چنانچہ عام مشاہدہ ہے کہ اپنے نج کے کاروبار کی ترقی میں لوگ جسقدر جان توڑ کوشش کرتے ہیں بحیثیت ملازم دوسروں کے کاروبار کے واسطے نہیں کرتے، اور سرکاری انتظامات میں کفایت طلبی کا تو ذکر ہی کیا اکثر فضول خرچی کی شکایت سننے میں آتی رہتی ہے۔ ضابطے کی تاخیرات جو کہ کارگزاروں کی بے تعلقی کا نتیجہ ہوتی ہیں ضرب المثل ہیں، اور ترقی کا جوش سرکاری کاروبار میں مقابلۃً ہمیشہ کم پایا جاتا ہے، اور اس کا باعث وہی کارکنوں کی ذاتی منفعت کی عدم موجودگی ہوتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ سرکاری کاروبار نج کے کاروبار سے ہمیشہ خراب حالت میں ہوتے ہیں؛ بلکہ بہت سی مثالیں بالکل اسکے برعکس نظر آتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اگرچہ ترقی کی امنگ کی کمی تو سرکاری کاروبار میں مسلم ہے، لیکن اور لحاظ سے سرکاری کاروبار کو ایسی فوقیت

حاصل ہوسکتی ہے کہ وہ اس نقص کی بدرجۂ ادنیٰ تلافی کردے۔ واضح ہو کہ مذکورۂ بالا نقص تو سرکاری کاروبار میں عام ہوتا ہے، لیکن فوقیت ہونا نہ ہونا، یا کم و بیش ہونا کاروبار کی نوعیت پر منحصر ہے۔ چنانچہ یہی عمومیت نقص اور خصوصیت تو فوق اس طویل اور کارآمد بحث کی بنا ہے کہ کون سے کاروبار سرکاری اہتمام کے واسطے مناسب ہیں؛ اور کون سے نامناسب؟ بالفاظ دیگر سرکار کن کاموں کو کامیابی سے چلاسکتی ہے اور کون سے کاروبار نج کے طور پر چلنے زیادہ مفید ہوں گے؟ اس کی تفصیل تو بہت طویل ہے، عام اصول یہ ہے کہ جن کاموں میں پیدائش بر پیمانہ کبیر کے فوائد بدرجۂ اولیٰ حاصل ہوں، جن میں بوجہ کمال، ایجاد و اختراع کا میدان تنگ ہو، جن کیواسطے زر کثیر مطلوب ہو، جنکے چلانے کیواسطے مدت دراز درکار ہو، یا جن میں بہت زیادہ اعتبار کی ضرورت ہو، ایسے کاروبار سرکاری اہتمام کیواسطے خاص طور پر مناسب ہوتے ہیں۔ ڈاکخانہ، تار، نہریں، پختہ سڑکیں، جنگلات، اور سکہ، یہ سب محکمے ہر ملک میں سرکاری قرار پاچکے ہیں؛ اور نج کے طور پر ان کا چلنا دشوار ہے۔ لیکن زراعت اور نیز مصنوعات کے بیشمار شعبے بوجوہ معکوس نج کے طریق سے کاروبار میں خوب پھولتے پھلتے ہیں اور سرکاری ہاتھوں میں ان کا ٹھٹھر کے رہ جانا یقینی ہے۔ بعض قابل مصنفین نے مع وجوہ سرکاری اور نج کے کاروبار کی مکمل فہرستیں مرتب کی ہیں جن کے بیان درج کرنے سے بخوف طوالت ہم معذور ہیں، لیکن اس تفریق کے عام اصول وہی ہیں جو ہم نے بیان کئے؛

حاصل کلام یہ کہ گو بعض شعبے سرکاری اہتمام کے واسطے بھی موزوں سہی، لیکن سرکار کو آجر واحد قرار دیکر پیدائش دولت کا کل کاروبار اس کے سپرد کردیا جائے تو چند در چند وجوہ سے جو انسانی فطرت پر مبنی ہیں، اس کا مجموعی نتیجہ معاشی تنزل ہوگا۔ پیدائش دولت اور اضافۂ اصل کی رفتار ضرور سست پڑجائیگی، اور اگر ایسا ہوا تو عوام کی تھوڑی بہت مرفہ الحالی جو باوجود عدم مساوات تقسیم حاصل پائی جاتی ہے، خاک میں مل جائیگی۔ یہ خیال غلط ہے کہ موجودہ دولتمندوں کی آمدنی غربا میں تقسیم کرنے سے عام مرفہ الحالی میں کوئی نمایاں فرق پیدا ہوجائیگا! اگر دنیا کے کل پہاڑ مسمار کرکے ان کی خاک کرۂ ارض پر ہموار پھیلائی جائے تو سطح زمین بمشکل ایک آدھ انچ بلند ہوسکیگی؛ بعینہ یہی حال دنیا کے بڑے بڑے زمینداروں، اصلداروں اور

آجرونکی آمدنی کا ہے: اگر اس کو عوام میں تقسیم کرو تو دو چار، دس بیس روپے فی کس سے زیادہ اضافہ نہ ہو سکے گا؛ اور بحیثیت مجموعی عوام کی مالی حالت میں کوئی بڑی ترقی نہ ہو گی۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس وقت تک جو مجموعی آمدنی حاصل ہو رہی ہے وہ موجودہ آبادی کی ضروریات کے واسطے سراسر ناکافی ہے، اور افلاس رفع کرنے کی لازمی شرط اضافۂ پیدائش دولت ہے۔ پس کوئی ایسا طریق جس سے پیدائش میں رکاوٹ پیدا ہو اضافۂ افلاس کا یقینی باعث ہو گا۔ ہر چند کہ مساوات تقسیم ضروری ہے، ترقی پیدائش اس سے بھی کہیں زیادہ ضروری ہے، اور عام مرفہ الحالی کے واسطے ہر دو لابدی۔ بدقسمتی سے ان دونوں میں ایک حد تک تضاد سا پھیلا ہوا ہے، اور ایک ایسا طریق جو دونوں مقصد پورے کر سکے: یعنی اضافۂ پیدائش بھی نہ رکے اور تقسیم میں بھی مساوات پیدا ہو جائے اب تک تحقیق نہیں ہو سکا۔ تاہم تھوڑی بہت جس حد تک بھی یہ صفت کسی طریق میں موجود ہو، اس کو اتنا ہی غنیمت سمجھنا چاہیئے۔ اور بحالت موجودہ اس لحاظ سے جو طریق بہترین نظر آتا ہے ہم اس کی ذیل میں تفصیل کرتے ہیں:

اشتراک سرکاری

۵۔ نہ تو موجودہ طریق تقسیم بوجہ روزافزوں عدم مساوات قابل برداشت ہے نہ سوشلزم کی انقلاب انگیز تجاویز پورے طور پر قابل عملدرآمد۔ ان دونوں کے بین بین ایک معتدل طریق اختیار کیا گیا ہے: اصول عدم مداخلت میں ترمیم کر کے سرکار نے حسب ضرورت ہر مناسب طرح سے معاشی معاملات میں اپنی نگرانی و شرکت پھر جاری کر دی۔ اول تو کاروبار کے اہم شعبوں پر نگرانی قائم کی: مثلاً بنک ایکٹ، فیکٹری ایکٹ، قانون دستاویزات قابل خرید و فروخت؛ دوم بعض کاروبار جن کا ملکی بہبودی اور ترقی سے قریبی تعلق ہے، اپنے واسطے مخصوص کر لیئے، اور مثل اصل اور آجر منافع اٹھانے لگی: مثلاً ڈاکخانہ، تار، ریل، نہریں، شفاخانے؛ سوم افتادہ زمینیں، اور جنگل سرکاری ملک قرار دے دیئے گئے اور مثل زمیندار سرکار کو انکی پیداوار سے آمدنی ملنے لگی؛ چہارم زمینداروں سے مالگزاری اور اصل داروآجروں سے طرح طرح کے ٹیکس وصول کر کے سرکار ان کی بڑی بڑی آمدنی کا حصہ عام مرفہ الحالی پر صرف کرنے لگی؛ گویا ایک دم کل انفرادی املاک ضبط کرنے کے بجائے سرکار نے مختلف طریقوں سے

سوشیلزم کی غرض پوری کی۔ کہیں صرف نگرانی پر اکتفا کیا تاکہ کمزور اور نادان فریق جبر و تشدد
اور دغا فریب سے محفوظ رہیں، کہیں کاروبار اور نیز زمین پر قبضہ کر کے زمیندار، اصلدار،
اور آجر کی جانشین، اور لگان، سود و منافع کی مالک بن بیٹھی؛ اور مزید برآں دولتمندوں
پر ٹیکس لگا کر ان کی آمدنی میں سے حصہ بانٹا، تاکہ وہ عوام کے کام آئے، جن میں
فریق غالب غریب اور متوسط الحال لوگ ہوتے ہیں۔ المختصر نگرانی کاروبار، ملک زمین
و اصل اور ٹیکس آمدنی، ان تہری ترکیبوں سے انفرادی املاک کی مضرت گھٹا کر ایک
حد تک تقسیم میں مساوات قائم کر دی۔

کل بحث کا لب لباب یہ ہے کہ موجودہ طریق تقسیم میں دو بڑے نقص ہیں۔
لوگ بلا محنت و مشقت دولت کے مالک بن جاتے ہیں، اور اگر محنت کریں بھی تو
اسکی اجرت سے صدہا گنی زیادہ آمدنی حاصل کر سکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک چھوٹی سی
جماعت تو دولت میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہی ہے، اور باقی خدا کی بیشمار
مخلوق کو مقابلۃً اس کی عشر عشیر ترقی بھی نصیب نہیں، بلکہ تھوڑی بہت آمدنی کیواسطے
بھی آخر الذکر کثیر گروہ اول الذکر مختصر جماعت کی اعانت و دستگیری کا محتاج ہے، حالانکہ
ان ہی کی محنت، ان کی دولتمندی کے واسطے لازمی شرط ہے۔ اس افسوسناک غلبے
اور بے بسی کا حقیقی باعث انفرادی املاک کا رواج ہے۔ عوام کی قائم مقام گورنمنٹ
کل زمین و اصل ضبط کر کے تنہا زمیندار، اصلدار اور آجر تو بن نہیں سکتی اور بن بھی سکے تو
بمقابلہ اس نفع کے جو مساوی تر تقسیم دولت سے حاصل ہوگا، بشکل معاشی تنزل زیادہ
مضرت پہنچنے کا قوی اندیشہ ہے۔ پس مذکور الصدر اصلاح کی غرض سے ایک اعتدال
آمیز طریق پر عملدرآمد جاری ہے: کہیں بذریعہ سرکاری نگرانی غریبوں کو دولتمندوں کی
چیرہ دستی سے محفوظ کیا، کہیں بشرط امکان زمین اور کاروبار پر بھی قبضہ کر لیا، اور
کہیں بڑی بڑی آمدنیوں میں سے حصہ بانٹ کر غریبوں کے مفید مطلب صرف کر دیا۔
گنوارو مثل ہے "سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے"، "و ہم لعل بدست آید و ہم یار نہ رنجد"
مروجہ طریق کو اسی کا مصداق سمجھنا چاہئیے۔ یہی وہ طریق ہے کہ جس کے رواج سے
کمترین مضرت کا اندیشہ ہو سکتا ہے؛ اور جس سے سوشیلزم کی غرض و غایت ایک
معقول حد تک پوری ہو رہی ہے؛ چنانچہ اسی وجہ سے وہ ہر جگہ روز بروز مقبول

باشاہزہ ہم ہو رہا ہے، اس کو اصطلاحاً سرکاری سوشیلزم کہنا بیجا نہ ہوگا۔ اس نکتے کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہر ایسی تدبیر کو جو عدم مساوات تقسیم کو گھٹا دے اشتراک ارتقائی کی نوع سمجھنا چاہیئے۔ چنانچہ سرکاری اشتراک کے علاوہ شرکت منافع کا مندرجہ بالا طریق (۱۲/۷) اور نیز امداد باہمی کا طریق جس کی تفصیل ذیل میں درج ہے، اشتراک ارتقائی میں شامل ہے۔

اب اشتراک کی دو خاص قسم: یعنی "انقلابی اور ارتقائی" کا فرق خوب واضح ہو گیا۔ اول الذکر تو تشدد پر مائل ہے، اس کی تجاویز معدودے چند مگر انقلاب انگیز اور فطرت انسانی کے منافی ہیں۔ اور اگر ان پر بہزار دقت بالجبر عملدرآمد بھی کرایا جائے تو جس قدر خرابی رفع کرنے کی امید ہے اس سے دس گنی مضرت پہنچنا سراسر یقینی ہے۔ اس کے برعکس آخر الذکر انسانی فطرت کا مقتضا بھی مدنظر رکھتا ہے، اسی وجہ سے اس کی تجاویز معتدل اور گوناگون ہیں، اور ان کے عملدرآمد کی منفعت کا پلہ مضرت سے بھاری ہے۔ جوں جوں بیجا جوش اور غلط فہمی رفع ہوتی جاتی ہے اشتراک انقلابی کا زور ٹوٹ رہا ہے، اور اشتراک ارتقائی کا اثر ہر طرف پھیل رہا ہے۔

واضح ہو کہ سنہ ۱۹۱۴ء کی جنگ یورپ کے بعد روس میں جو انقلاب عظیم نمودار ہوا وہ بولشویزم کہلاتا ہے؛ سیاسیات، معاشیات، معاشرت، اور مذہب، اجتماعی زندگی کے سب شعبوں پر اس کا اثر گہرا پڑا۔ معاشی اعتبار سے وہ انقلابی اشتراک نظر آتا ہے، شدت جبر کی بدولت فی الحال تو کام چل رہا ہے لیکن اسکے قیام کی توقع کم ہے۔

جیسا کہ ہم اس سے قبل بھی کہہ چکے ہیں، اس تحریک کی بہت سی انواع در انواع ہیں، ہم نے دقیق اختلافات نظر انداز کر کے سیدھا سادہ لب لباب پیش کرنے پر اکتفا کیا ہے۔ مفصل بحث کے واسطے ایک جداگانہ ضخیم کتاب درکار ہے۔

باب ہفدہم

امداد باہمی

(۱) امداد باہمی کی مختلف شکلیں (۲) قرض بامداد باہمی (۳) خرید بامداد باہمی۔

(۴) فروخت بامداد باہمی (۵) سکونت بامداد باہمی۔

امداد باہمی کی مختلف شکلیں

اتقسیم عمل کے اصول پر کاربند ہونے سے جہاں گوناگوں فوائد حاصل ہوئے وہاں کچھ دقتیں بھی بڑھ گئیں۔ اول تو اصل اور محنت ایک دوسرے سے جدا ہو گئیں، اصلداروں کی ایک خاصی جماعت بن گئی جو کاروبار میں روپیہ لگاتی ہے یا دوسروں کو قرض دیتی ہے؛ لیکن جب سے بنکوں، مشترک سرمایہ دار کمپنیوں کا رواج نکلا، عوام کو بھی اپنے اندوختوں سے بطور اصل کام لینے کا موقع ملنے لگا، چنانچہ اس کی مختصر کیفیت بعنوان شکل اوّل اوپر بیان ہو چکی ہے۔ بنکوں کی بدولت قرض لینے میں بھی بہت کچھ سہولتیں پیدا ہو گئیں؛ اجراے بنک کا منشا ہی یہ ہے کہ عوام کا اندوختہ جمع کر کر کے جن کو ضرورت ہو ان میں بطور قرض تقسیم کرے۔ تاہم یہ جدید طریق بیشتر مرفہ الحالوں اور بڑے بڑے کاروبار والوں کے واسطے مناسب اور مفید ہے۔ غریب لوگ ان سے بہت کم مستفید ہوتے ہیں، اور اکثر ممالک میں ایسے ہی لوگوں کی کثرت ہے؛ سیونگ بنک کے ذریعے سے ان کے قلیل اندوختے تو کچھ کام آ بھی جاتے ہیں، مگر ان کو قرض ملنے میں اب بھی بڑی وقت پیش آتی ہے، اور قرض بغیر ان کا کام چلنا دشوار ہے: اوّل تو قرض ملتا کم ہے، اور ملا بھی تو شرح سود اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ اس کی ادائی دشوار ہو جاتی ہے۔ صنعت و حرفت میں تو اب پیدائش بر پیمانہ کبیر کا رواج بڑھ رہا ہے، مزدور کو اصل قرض لینے کی ضرورت نہیں، گیا اور کسی کارخانے میں کام کرنے لگا، جو اجرت ملی اس پر گزر کی۔ لیکن کاشتکار کو اب بھی تقسیم پیدا۔ ہر ملک میں اپنی کھیتی باڑی کے واسطے تھوڑا بہت قرض لینے کی ضرورت پڑتی

باب ہفدہم ہے۔ اور جہاں اب تک پیدائش بر پیمانۂ صغیر کا رواج باقی ہے، دستکار بھی کاروبار کے واسطے تھوڑا سا قرض لیتے ہیں؛ ایسے بیشمار چھوٹے چھوٹے قرض لینے والوں کی سہولت اور فائدے کے خیال سے لین دین کا ایک نیا طریق نکالا ہے، جو اکثر ممالک میں تجربے سے کامیاب ثابت ہو رہا ہے؛ اس کو قرض بامداد باہمی کہتے ہیں۔ اصلی مقصد یہ ہے کہ غریب کاشتکاروں اور دستکاروں کو کاروبار کیواسطے چھوٹی چھوٹی رقمیں مناسب شرح سود پر بسہولت قرض ملتی رہیں، اور نیز اگر انکے پاس کچھ اندوختہ ہو تو اس سے مستفید ہونے کا موقع ملے۔

اصلداروں کی مانند ایک بڑی جماعت تاجروں اور دکانداروں کی ہے جو کارخانوں، دستکاروں، اور کاشتکاروں سے مال خرید خرید کر عوام کے ہاتھ فروخت کرتی ہے، اور اس خدمت کے معاوضے میں منافع وصول کرتی ہے۔ غریب لوگ خردہ فروشوں سے بمشکل سودا خریدتے ہیں، اس وجہ سے انکو اکثر چیزیں بہت گراں ملتی ہیں اور وہ بھی عمدہ نہیں ہوتیں! اگر بہت سے لوگ مل کر کسی تھوک فروش سے معاملہ کریں تو قیمت میں بھی کفایت رہے اور چیزیں بھی اچھی ملیں: چنانچہ اسی مقصد سے خریداری کا بھی ایک طریق نکالا ہے جس کو صرف بامداد باہمی کہتے ہیں۔ قرض دہندے اور خردہ فروش، یہی دو کاروباری طبقے ہیں، جن کے ہاتھ سے عوام کو بمقابلہ آرام کے زیادہ نقصان پہنچتا رہا ہے۔ اسی وجہ سے قرض بامداد باہمی اور خرید بامداد باہمی کی انجمنیں اکثر ممالک میں بکثرت قائم ہو رہی ہیں۔ ان دو کے علاوہ امداد باہمی کے اور بھی عجیب اور کارآمد طریق نکل رہے ہیں: مثلاً "فروخت بامداد باہمی" کہ بہت سے چھوٹے چھوٹے دستکار یا کاشتکار ملکر اپنا اپنا مال کسی بڑے تاجر کے ہاتھ عمدہ نرخ سے فروخت کریں، اسی طرح "سکونت بامداد باہمی" کہ متعدد خاندان ملکر رہیں تاکہ مصارف خانہ داری میں کفایت ہو۔ یہ طریق سکونت اسکول اور کالجوں کے بورڈنگ ہاوس اور ہاسٹلوں کے اصول پر مبنی ہے؛ اور ان ممالک میں خاص طور پر ضروری اور مفید ہے جہاں مکانات کا کرایہ گراں اور ملازموں کی تنخواہ بہت زیادہ ہو۔

امداد باہمی کے اور اور طریق بھی انگریزی کتابوں میں مذکور ہیں مگر وہ خاص خاص

حالات کے واسطے موضوع ہیں۔ مذکورۂ بالا چار طریقوں کی تفصیل یہاں پر کافی ہے ؛

۲۔ کاشتکار اور دستکار چھوٹی چھوٹی رقمیں قرض لیتے ہیں، اس قسم کے لین دین میں اول تو مصارف کاروبار بہت بڑھ جاتے ہیں؛ بہت سے چھوٹے قرضوں کا حساب و کتاب رکھنا، ان کو وصول کرنا وغیرہ: حالانکہ اگر ان کے مجموعے کا دہیچند بھی صرف دو یا ایک شخص کو قرض دیا جائے تو کاروبار میں بدرجہا سہولت اور کفایت ہو۔ دوسرے بوجہ بے سروسامانی ان لوگوں کا اعتبار بھی بہت تھوڑا ہوتا ہے: یعنی ان سے قرضہ وصول ہونے کی امید کم ہوتی ہے، اور روپیہ مارے جانے کا خطرہ لگا رہتا ہے۔ حالانکہ تاجر یا اور زمینداروں کے مال و جائداد سے قرضہ وصول کرنے میں زیادہ وقت نہیں ہوتی؛ گویا چھوٹے قرضوں کے کاروبار میں مطالبات خطر بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ تیسری خرابی یہ کہ ان غریب جاہلوں کو قرض لئے بغیر چارہ نہیں، خواہ اسقدر سود ادا کرنا پڑے کہ وہ ہمیشہ کے واسطے قرض دہندہ کے غلام بن جائیں، اور اپنی گاڑھے پسینے کی کمائی سالہاسال اس پر بھینٹ چڑھانی پڑے۔ نتیجہ یہ ہے کہ مطالباتِ کاروبار اور مطالبات خطر کی بیشی اور قرض گیروں کی ناچاری و بے بسی کی بدولت، ایسے قرضوں کی شرح سود بہت بڑھی رہتی ہے؛ تیس چالیس فی صدی تو معمولی بات ہے، اس سے زیادہ شرح بھی کچھ عجیب نہیں سمجھی جاتی۔ چنانچہ مہاجن اور ساہوکاروں کی ایک بڑی جماعت اس قسم کے لین دین میں مصروف ہے: اول تو اس کاروبار میں ان کو بھی بہت کچھ دردسر اور صرفہ برداشت کرنا پڑتا ہے، اور پھر بھی کچھ نہ کچھ رقم ماری جاتی ہے۔ دوسرے عوام بھی ایسے قرضوں کی بدولت تباہ ہو رہے ہیں؛ قرضہ اور سود ادا کرتے کرتے عمر گزر جاتی ہے، مگر کیا ممکن کہ حساب بیباق ہو۔ امداد باہمی کے ذریعے سے یہ سب خرابیاں رفع ہو سکتی ہیں، چنانچہ اسی اصول پر ہزارہا انجمنہائے قرض امداد باہمی ملک ملک قائم ہو رہی ہیں ؛

فرض کرو کسی گاؤں میں پچاس کاشتکار رہتے ہیں، ان سب کو تھوڑا بہت قرض درکار ہے: کسی کو پچاس ساٹھ روپے، تو کسی کو سو سوا سو۔ کل قرضوں کی مجموعی مقدار چار ہزار روپے ہے، علیٰحدہ علیٰحدہ معاملہ کرنے کے بجائے یہ سب کاشتکار مل کر ایک انجمن بنائیں، اور اس کے نام سے چار ہزار روپے یکمشت قرض لے لیں، اور

حسب ضرورت بطور خود آپس میں بانٹ لیں! اس صورت میں قرض دہندہ کو بہت سہولت ہوگی، کل رقم صرف انجمن کے نام ہی کھاتے میں درج کر لی، اور انجمن ہی دیندار رہی، مصارف کاروبار بہت گھٹ گئے۔ ممبران انجمن میں بعض مقابلۃً زیادہ خوشحال ہوں گے، اب اگر ہر ایک ممبر بلا لحاظ اپنے قرضے کے بقدر اپنے کل مال و اسباب کے ادائی قرض کا ذمہ دار ہو، یعنی ممبروں کی ذمہ داری غیر محدود ہو، تو انجمن کا اعتبار بھی قرض دہندوں کی نظر میں بڑھ جائیگا اور مطالبات خطر میں معقول تخفیف ہوگی۔ فرداً فرداً معاملہ کرنے میں تو یہ کاشتکار بیشک بہت دبے رہتے تھے، لیکن جب ان کی انجمن بن گئی تو اتفاق کے طفیل سے ان میں ایک گونہ قوت پیدا ہوگئی، ایک طرف تو کاروباری سہولت اور تخفیف خطر کی وجہ سے قرض دہندے شرح سود گھٹانے پر خود ہی آمادہ ہو جائیں گے، دوسری طرف انجمن بھی دیکھ بھال کر معاملہ کریگی، یہ نہیں کہ قرض دہندے جو شرح مانگیں وہی قبول کر لے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو کاشتکار جدا جدا قرض لیکر تیس چالیس فیصدی بلکہ اس سے بھی زیادہ سود ادا کرتے ہیں، انجمن کے ذریعے سے ان کو معمولی شرح سے قرض ملنے لگے گا، اور دس بارہ فی صدی سے زیادہ سود ادا کرنے کی نوبت نہ آئے گی ؛

کچھ کاشتکار یا دستکار جن کی چھوٹی سے چھوٹی تعداد از روئے قانون مقرر ہے: مثلاً کم از کم دس یا بارہ مل کر ایک انجمن قرض امداد باہمی قائم کرنے کی سرکار میں درخواست پیش کریں، اور حسب قانون و ضابطہ منظوری حاصل کر کے اپنی انجمن بنالیں جو انکی طرف سے لین دین کے معاملات انجام دینے کی پوری مجاز ہوگی۔ سرکار کی طرف سے رجسٹرار مقرر ہیں جو انجمن قائم کرنے کی اجازت دیتے ہیں؛ ان انجمنوں پر چند خاص قانونی شرائط و قیود کی پابندی بھی لازم ہے: مثلاً کسی محاسب مجاز یا آڈیٹر سے حساب و کتاب کی ہر ششماہی یا سالانہ جانچ پڑتال کرانا قانونی نگرانی کا منشا صرف یہی ہے کہ انجمنوں کا کام باقاعدہ چلے اور کوئی ممبر خرد برد نہ کر سکے۔ انجمن کے چند عام اساسی اصول مقرر ہو چکے ہیں جو کہ مختصراً درج ذیل ہیں، غور کرنے سے معلوم ہوگا ان سب کا مقصد بھی انجمن کو استحکام اور تقویت پہنچانا ہے، تاکہ اس کے قیام سے ممبر عرصۂ دراز تک فائدہ اٹھا سکیں :۔

۱۔ ممبران انجمن کی ذمہ داری ادائے قرض کے معاملے میں غیر محدود ہوتی ہے یعنی بلا لحاظ خود قرضے کے، ہر ممبر بقدر اپنی کل ملک و مال کے مجموعی قرضے کا کفیل ہے: مثلاً کوئی ممبر انجمن

سے صرف سو روپے قرض لے اور اسکے پاس ڈھائی سو روپے کا مال و اسباب ہو۔ اب اگر خدانخواستہ قرض کے پچاس روپے کسی دوسرے ممبر سے کسی طرح وصول نہ ہو سکیں تو وہ رقم بھی انجمن اس خوشحال ممبر سے وصول کر سکتی ہے۔ بظاہر یہ اصول بہت خطرناک اور خلاف انصاف نظر آتا ہے، لیکن اوّل تو اسپر عملدرآمد ہونے کی شاذ و نادر نوبت آئی ہے، دیگر اصول و قواعد کے ذریعے سے کافی پیش بندیاں کر لی جاتی ہیں کہ قرضدار ممبر سے رقم وصول ہونے میں دقت نہ ہو؛ چنانچہ اسکی تفصیل ذیل میں درج ہے۔ دوسرے غیر محدود ذمہ داری کی بدولت ہر ایک ممبر انجمن کے کاروبار میں بغایت احتیاط اور مآل اندیشی سے کام کرتا ہے: بالفاظ دیگر انجمن کے کام پر تمام ممبر پوری پوری نگرانی رکھتے ہیں اور بدانتظامی کا خطرہ نہیں رہتا۔ تیسرے اسی اصول کے طفیل سے عوام کی نظر میں انجمن کا اعتبار بہت بڑھ جاتا ہے اور کمتر شرح سود پر روپیہ قرض ملنے لگتا ہے؛ چنانچہ غیر محدود ذمہ داری کا اصول انجمہائے امداد باہمی کا اصل بنیاد مقرر ہوتا ہے؛

۲۔ صرف وہی لوگ انجمن کے ممبر بن سکتے ہیں جنکی ایمانداری، نیک چلنی، اور خوش معاملگی تحقیق اور مسلم ہو۔ یہ اصول پہلے اصول کا جزو لاینفک ہے، اس پر عمل ہو نیکے بعد غیر محدود ذمہ داری کا خطرہ بہت گھٹ جاتا ہے؛ اور یوں بھی انجمن کی کامیابی کیواسطے ان اخلاقی صفات کی اشد ضرورت ہے۔ مزید برآں اس اصول کی پابندی سے لوگوں کو اپنے اخلاق درست کرنیکی بڑی ترغیب ہوتی ہے۔ ایماندار اور نیک چلن رہنے سے انکو کمی شرح سود پر بآسانی قرض مل جاتا ہے گویا اخلاقی صفات کا مالی معاوضہ موجود ہے؛

۳۔ مندرجۂ بالا اصولوں کی پابندی اسی وقت ممکن ہے جبکہ کل ممبر پاس پاس رہتے ہوں، ایک دوسرے کی حالت سے پورے طور پر واقف ہوں، انجمن کے کاروبار میں سرگرمی سے حصہ لیں، اور کسی ناقابل اعتبار شخص کو انجمن میں شریک نہ ہونے دیں؛ چنانچہ تیسرا اصول یہ قرار پایا کہ انجمن کی شرکت ایک مختصر رقبے تک محدود رہنی چاہئیے: مثلاً ہر گاؤں میں ایک جداگانہ انجمن ہو، بلکہ ایک سے زیادہ ہوں تو بہتر ہے۔ لیکن یہ خلاف احتیاط ہے کہ کئی گاؤں ملکر ایک انجمن چلائیں! اس حالت میں نہ ممبروں کو ایک دوسرے پر اطمینان ہو سکتا ہے اور نہ سب ممبر انجمن کے کام میں کماحقہٗ شریک ہو سکتے ہیں؛

۴۔ چونکہ ممبروں کو انجمن سے معقول فائدہ پہنچتا ہے، لہٰذا یہی مناسب ہے کہ وہ حسب

لیاقت انجمن کا کام بلا معاوضہ اعزازی طور پر سرانجام دیں، اور جہاں تک ممکن ہو انجمن پر تنخواہ کا بار نہ ڈالیں۔ بحالت مجبوری زیادہ سے زیادہ ایک محاسب رکھ لیں جو لین دین کا حساب تیار کرے، لیکن یہ کام بھی اگر کوئی خواندہ ممبر انجام دے تو بہتر ہے۔ مالی کفایت کے علاوہ اعزازی خدمت سے ایثار کی عادت پڑتی ہے۔ ایثار بجائے خود ایک بڑی اخلاقی خوبی ہے اور امداد باہمی کی تحریک میں تو روح رواں کا کام دیتی ہے ؛

۵ - قرض دیتے وقت یہ تحقیق کر لینا لازمی ہے کہ وہ رقم کس بجا طور پر صرف ہوگی تاکہ ممبر فضول خرچیوں سے بچے رہیں، اور بعد کو نگرانی رکھنی چاہیئے کہ قرض لینے کی جو غرض بیان کی گئی ہو اسکے خلاف روپیہ صرف نہ ہو: مثلاً اگر کوئی ممبر بیل خریدنے یا کنواں بنوانے کے خیال سے قرض لے تو وہ ہرگز مجاز نہیں کہ زرِ قرض بیاہ شادی یا کسی اور کام میں خرچ کرے ؛

۶ - انجمن جس شرح سود سے خود قرض لے اس سے کسی قدر زیادہ شرح پر ممبروں کو قرض دے، اسطرح پر جو کچھ منافع ملے اسکے حصے سے تو کاروبار کے ناگزیر خرچ چلا دے اور دوسرے حصے کو بطور سرمایۂ محفوظ جمع کرتی رہے، رفتہ رفتہ سرمایۂ محفوظ کی اچھی خاصی مقدار فراہم ہو جائیگی۔ اول تو اس اندوختے سے انجمن کا اعتبار بڑھ جائیگا، دوسرے بقدر مناسب عام مفید کاموں میں صرف ہو سکتا ہے: مثلاً ممبروں کے بچوں کیواسطے ایک مکتب یا پاٹ شالا کھول دیا جائے، جہاں مفت تعلیم ہو، یا چھوٹا سا دواخانہ قائم ہو جہاں معمولی دوا بلا قیمت ملے؛ لیکن ممبر کسی حالت میں اس فنڈ کو باہم تقسیم کرنے کے مجاز نہ ہوں گے۔ حتیٰ کہ اگر انجمن ٹوٹ جائے تو یہ فنڈ باتفاق رائے کسی کار خیر میں صرف ہو، بلکہ بہتر ہے کہ بطور امانت کسی بنک یا سرکاری خزانے میں داخل کر دیا جائے تاکہ اگر کوئی ایسی ہی انجمن آئندہ بنے تو اس کو مدد ملے ؛

۷ - اول تو غریب ممبروں کے پاس اندوختہ کہاں کہ وہ انجمن کے حصے خریدیں، وہ خود قرض کی جستجو میں رہتے ہیں۔ دوم حصے جاری کرنے میں یہ بھی پیچیدگی ہے کہ حصہ دار ممبر زیادہ مقسوم حاصل کرنے کے لالچ سے قرض کی شرح سود بڑھانے پر اصرار کرینگے، اور جب شرح سود بڑھی تو ممبروں کو انجمن سے کیا فائدہ پہنچا۔ پس اگر کوئی ممبر اپنا اندوختہ انجمن کے سپرد کرنا چاہے تو اسکے ہاتھ حصے فروخت کرنے کے بجائے اسکا روپیہ بدامانت جمع کر لینا بہتر ہے۔ اور اس پر بشرح معین سود دیا جائے، جس طرح کہ انجمن زرِ قرض پر بنک یا ساہوکاروں کو

سودا دا کرتی ہے، اس طرح پر انجمن اور ممبر اندوختوں سے یکساں مستفید ہونگے:

مندرجۂ بالا اصولوں پر غور کرنے سے واضح ہوگا کہ انجمن قرض امداد باہمی اچھی خاصی تربیت گاہ ہے، اور عملی طور پر ممبروں کو ایمانداری، نیک چلنی، کفایت شعاری، مردم شناسی، ہمدردی، اعتماد، ایثار، اور کاروباری بیداری کی تعلیم دیتی ہے۔ چنانچہ جہاں جہاں امداد باہمی کے اصول پر انجمنیں قائم ہوئیں، اخلاق اور معاشرت میں خود بخود اصلاح ہونے لگی؛ حتیٰ کہ بدرو یہ لوگ مالی فائدے کے لالچ سے راہ راست پر آگئے:

انجمن کا کاروبار دو ایک منتخب کمیٹیوں کے سپرد رہتا ہے، اور ممبروں کی عام پنچایت ششماہی یا سالانہ جلسے کر کے اسکی دیکھ بھال کرتی رہتی ہے؛ سب معاملات بکثرت رائے طے ہوتے ہیں: بنک یا ساہوکار سے قرض لینا، ممبروں کا اندوختہ بطور امانت جمع کرنا، ممبروں کو قرض دینا، انسے مطالبہ وصول کرنا، حساب و کتاب رکھنا، اسکی جانچ پڑتال کرانا، جلسے منعقد کر کے معاملات طے کرنا، حاصل کلام یہ کہ انجمن کے کاروبار کے متعلق پورے قواعد مرتب ہو چکے ہیں جنکی تفصیل امداد باہمی کی جداگانہ کتابوں میں مندرج ہے، بخوفِ طوالت اسکو یہاں قلم انداز کرتے ہیں:

امداد باہمی کے طریق پر سب سے اول جرمنی میں عملدرآمد شروع ہوا ضلع ہائن لینڈ میں کسی گاؤں کے ایک مقدم نے، جس کا نام رفیزن تھا، از راہ ہمدردی و فیاضی اپنی گرہ سے کچھ رقم جمع کر کے ۱۸۴۹ء میں اسی قسم کی ایک انجمن قائم کی تاکہ قرب و جوار کے غریب دیہاتی، قرضخواہوں کے پنجے سے نجات پائیں، اور کمتر شرح سود پر انکو قرض ملنے لگے۔ مندرجہ بالا اصول خود رفیزن نے وضع کئے اور جن انجمنوں میں ان پر عمل ہوتا ہے وہ اب تک رفیزن کی انجمنیں کہلاتی ہیں۔ بمقتضائے اختلاف حالات دیگر ممالک نے اس میں کچھ ردوبدل بھی کر دیا، چنانچہ خود جرمنی میں ایک شولز نامی زمیندار نے اپنی ریاست میں قرض بامداد باہمی کی جو انجمنیں قائم کیں تو اس نے رفیزن کے بعض اصول میں ترمیم کر دی؛ بالخصوص یہ کہ انجمن ہی نے حصے فروخت کئے اور ہر ممبر کیواسطے کم از کم ایک حصہ خریدنا لازمی قرار پایا، ممبروں کی ذمہ داری غیر محدود ہونی لازمی وضروری نہ رہی، شولز نے اپنی انجمنوں کا رقبۂ ممبری بھی زیادہ وسیع رکھا یعنی قرب و جوار کے مقامات کے لوگ بھی ملکر ایک انجمن بنا سکتے ہیں، سب کو ایک ہی گاؤں کا باشندہ ہونا ضرور نہیں؛ کاروبار کے قواعد میں بھی کچھ فرق ہے، مثلاً رفیزن کی انجمنیں طویل عرصے کیواسطے قرض دیتی ہیں: جیسے چھ ماہ یا سال دو سال۔ اس کے برعکس شولز کی انجمنیں دو چار ماہ سے زیادہ کیواسطے

قرض کم دیتی ہیں۔ تجربے سے ثابت ہوا کہ رفیزن کی انجمنیں کاشتکاروں کے واسطے بغایت مفید ہیں، شولز کی انجمنیں دستکاروں کیواسطے موزوں ہیں۔ حسب حالات و ضروریات ہر دو قسم کی انجمنیں جابجا پھیل رہی ہیں: چنانچہ امداد باہمی کی تحریک گو ہندوستان میں اس صدی کے شروع میں جاری ہوئی لیکن سرکاری سرپرستی اور امداد کی بدولت ۱۹۱۷ء میں انجمن قرض بامداد باہمی کی مجموعی تعداد سولہ ہزار سے اوپر تھی، جن میں ساڑھے سات لاکھ سے زیادہ ممبر شریک تھے، اور جنکے پاس کاروبار کیواسطے ساڑھے آٹھ کروڑ روپے سے زیادہ اصل موجود تھا۔ لیکن چونکہ ہندوستان خاص طور پر زرعی ملک ہے، رفیزن کی انجمنوں کی بہت کثرت ہے، شولز کی انجمنیں کہیں کہیں قصبات میں جاری ہو رہی ہیں :

خسرید بامداد باہمی

۳۔ منافع کی بحث میں واضح ہو چکا ہے کہ پھٹکل سودا خریدنے والوں کو چیزیں بالعموم گراں ملتی ہیں اور پھر بھی اچھی کم ملتی ہیں۔ اب فرض کرو کہ خریداروں کی ایک جماعت باضابطہ اپنی انجمن قائم کرے جو انکی مستقل ضروریات: مثلاً سامان خوراک ولباس وغیرہ، تھوک فروش کارخانوں اور تاجروں سے ارزاں خرید کر ممبروں کے ہاتھ فروخت کرے۔ اس طریق سے اول تو چیزیں عمدہ قسم کی ملیں گی، دوسرے ارزاں ملیں گی۔ ایسی انجمنوں کا طریق کاروبار یہ ہے کہ کچھ رقم تو خود ممبر بطور امانت جمع کر دیتے ہیں جس پر انکو بشرح مناسب باقاعدہ سود ملتا ہے، بشرط ضرورت کچھ رقم قرض لیجا سکتی ہے؛ سود، اصل، اور مصارف کاروبار ادا کرنیکے بعد جسقدر منافع بچے، آئندہ ایک مناسب حصہ سرمایہ محفوظ میں داخل ہو جاتا ہے، اور باقی ہر ششماہی یا سال کے آخر پر ممبروں میں تقسیم ہو جاتا ہے، اور لطف یہ ہے کہ جو ممبر جسقدر زیادہ مال انجمن سے خریدتا ہے اسی حساب سے اسکو منافع کا حصہ ملتا ہے۔ اس طرح پر ممبر اپنی انجمن کو چھوڑ کر کسی دکان کی طرف رخ نہیں کر سکتے، اور گو خریدتے وقت انکو بازاری نرخ سے سامان ملتا ہے، لیکن منافع ملنے کے بعد وہ کافی ارزاں پڑتا ہے۔ خردہ فروشوں کی دستبرد سے تنگ آ کر اکثر ممالک میں دستکار، کاشتکار اور مزدور پیشہ لوگ اس قسم کی انجمنیں جاری کر رہے ہیں اور وہ مفید ثابت ہوئی ہیں۔ کاروباری قواعد کی تفصیل کے لیے یہاں گنجائش نہیں، البتہ یہ تذکرہ ضروری ہے کہ امداد باہمی خواہ کوئی شکل اختیار کرے، ایثار، ایمانداری، اور باہمی اعتماد ممبروں کیواسطے لازمی ہے، اور شرط قواعد انہی اصولوں کی تائید کرتی ہے؛ مزید برآں ہر قسم کی انجمن امداد باہمی ایک خاص قانون کی تابع ہے۔ غرضکہ

باب پنجدہم

انجمن کے کاروبار میں بد معاملگی کرنا آسان نہیں ہے، اسکول اور کالجوں کے لڑکے اگر چاہیں تو کتابیں اور دیگر ضروریات نوشت و خواند خریدنے میں ان انجمنوں کے ذریعہ سے بہت فائدہ اٹھا سکتے ہیں، مزید براں کاروبار کا کچھ عملی تجربہ بھی حاصل ہوگا۔ ولایت کے بعض کالجوں میں ایسی انجمنیں مدت سے قائم ہیں اور خوب چل رہی ہیں ؀

فروخت بامداد باہمی

۴۔ جب کاشتکار یا دستکار، اپنا اپنا تھوڑا تھوڑا مال جداگانہ فروخت کرتے ہیں تو انکو اچھی قیمت نہیں ملتی: اول تو وہ تجارت کی حالت سے کافی باخبر نہیں ہوتے، دوسرے انکو روپے کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اچھی قیمت کا زیادہ انتظار نہیں کر سکتے، جو کچھ دام وقت پر ملے لے لیے؛ تیسرے ان میں کوئی جتھا نہیں ہوتا، جہاں بعض نے کسی مجبوری کی وجہ سے اپنے مال کا نرخ گھٹایا، اوروں کو بھی گھٹانا پڑا۔ اب اگر گاؤں گاؤں کے کاشتکار یا قصبوں کے دستکار: مثلاً موچی یا تیلی، باضابطہ انجمن بنالیں جو ان کی طرف سے کل مال بطریق تھوک فروشی نکالے، اور براہ راست بڑے بڑے کارخانوں اور تاجروں سے معاملات کرے تو ممبروں کو اپنے اپنے مال کی یقیناً زیادہ قیمت ملے۔ ایسی انجمنیں بھی کہیں کہیں کام کر رہی ہیں، اور ان پر وہی قانونی نگرانی قائم ہے۔ مصنوعات اور زرعی پیداوار کے علاوہ گھی، دودھ سی چیزیں بھی اس طریق سے فروخت ہوتی ہیں ؀

سکونت بامداد باہمی

۵۔ ترقی یافتہ ممالک میں جہاں مکانات کا کرایہ بہت بڑھا ہوا ہے، زمین بہت بیش قیمت ہے، اور ملازم بھی کمیاب ہیں۔ کئی کئی خاندان مل کے رہتے ہیں، اس طرح پر خانہ داری کے مصارف میں بہت کفایت ہو جاتی ہے۔ بعض بعض انجمنیں اپنے ممبروں کو مکانات بنانے کیواسطے پیشگی روپیہ دیتی ہیں اور زر قرض و سود متعدد برسوں میں بالاقساط وصول کر لیتی ہیں۔ حساب بیباق ہونے تک بار کفالت مکان پر رہتا ہے، لین دین کے اصول حتی الوسع ایسے فیاضانہ ہوتے ہیں کہ غریب لوگوں کو مکانات بنانے میں دقت نہ ہو ؀

امداد باہمی کی اور بھی بہت سی شکلیں ترقی یافتہ ممالک میں نظر آتی ہیں، اور وہ سب اس مشہور مقولے کی تصدیق کرتی ہیں کہ "اتفاق بڑی طاقت ہے"۔ یہاں پر امداد باہمی کا ایک نہایت مختصر خاکہ پیش ہو سکا، اس بحث کے واسطے جداگانہ کتاب درکار ہے ؀

باب ہیجدہم

ٹیکس

(۱) مالیات (۲) مفہوم ٹیکس (۳) تقرر ٹیکس (۴) اصول ٹیکس (۵) اقسام ٹیکس (۶) اشکال ٹیکس (۷) انکم ٹیکس (۸) ہاؤس ٹیکس (۹) محصول چنگی (۱۰) فیس اسٹامپ و رجسٹری داخل خارج و لیسنس۔

مالیات

۱۔ اصطلاح مالیات سے مراد کسی سلطنت کے آمد و خرچ کا انتظام و حساب ہے۔ اس فن کی مفصل بحث کیواسطے تو ایک جداگانہ کتاب درکار ہے، یہاں خرچ کی تفصیل نظر انداز کرکے صرف اسقدر بیان کافی ہے کہ ہر قسم کی ملکی ترقی اور عام بہبودی عمدہ حکومت کے قیام و استحکام سے وابستہ ہے: چنانچہ عمل پیدائش دولت میں سرکار بھی براہ راست یا بالواسطہ، حسب حالات شریک مانی جاتی ہے، اور حکومت کیواسطے خرچ ناگزیر ہے۔ رہی آمدنی، وہ بھی ملک کی پیداوار سے حاصل ہوتی ہے؛ لہٰذا حکومت بھی بحیثیت مجموعی ایک عامل پیدائش ہے، جو پیداوار میں سے حصہ لیکر اپنا کام چلاتی، اور بشرط امکان اندوختہ جمع کرتی ہے؛ بحالت ضرورت مثل عوام اسکو قرض بھی لینا پڑتا ہے۔ واضح ہو کہ ازمنۂ سابقہ میں حکومت امن و امان قائم رکھکر پیدائش دولت میں محض لبواسطۂ بعید شریک ہوتی تھی، لیکن جیسا کہ اس سے قبل جا بجا بتایا جا چکا ہے، ہر مہذب حکومت معاشی معاملات میں روز افزوں دلچسپی لینے لگی ہے، اور بشرط موقع عام زمیندار، اصلیدار، اور آجر وغیرہ کی مانند کاروبار میں بھی مصروف نظر آتی ہے۔ المختصر حکومت بھی ایک عامل پیدائش ہے، اور پیداوار میں سے اسکو جو حصہ ملے، وہ سرکاری محاصل کہلاتا ہے؛ ترقی یافتہ ممالک میں سرکاری محاصل کے بالعموم چار وسائل پائے جاتے ہیں:۔

(الف) سرکاری اراضی و جنگلات جنکی پیداوار سے معقول آمدنی ملتی رہتی ہے؛

ب۔ معاشی کاروبار: مثلاً نہر، ریل، ڈاک خانہ، یا افیون کی تجارت، ہندوستان میں، اور تمباکو کی فرانس میں:

ج۔ قرض جو بمجبوری قلت آمدنی، خرچ چلانے کے واسطے، یا بغرض حصول منافع، کاروبار میں لگانے کے واسطے کسی شرح سود پر عوام سے لیا جائے:

د۔ ٹیکس:

ان چاروں وسائل آمدنی میں سے اول تو عام کاروبار سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں، اور اگر کچھ فرق ہے بھی تو اس کا بیان مالیات کی جداگانہ بحث میں زیادہ برمحل ہوگا لیکن آمدنی کی چوتھی مد یعنی ٹیکس جو عوام اپنے حصۂ پیداوار میں سے سرکار کو ادا کرتے ہیں، براہ راست انفرادی ملک انفرادی آمدنی پر نہایت گہرا اثر ڈالتی ہے، اور اس کے عملدرآمد سے ایسے معاشی قوانین و نتائج اخذ کئے جاسکتے ہیں کہ جن کا بیان تقسیم دولت کے تحت جداگانہ طور پر ضروری معلوم ہوتا ہے؛ چنانچہ اکثر تازہ ترین تصانیف میں بھی یہی طریق اختیار کیا گیا ہے، اور ہم بھی اس کتاب میں یہی مناسب سمجھتے ہیں:

مفہوم ٹیکس ۲۔ ٹیکس سے مراد دولت کا وہ حصہ ہے جو لوگ غیر اختیاری طور پر سرکار کو مصارفِ حکومت کے واسطے ادا کریں۔ اس تعریف میں چند الفاظ غور طلب ہیں! اصطلاح دولت اپنے وسیع معنوں میں استعمال کی گئی ہے گویا مال و جائداد کے علاوہ خدمات بھی اس میں شامل ہیں: چنانچہ بیگار بھی ایک ناپسندیدہ قسم کا ٹیکس ہے۔ دولت کا انفرادی ہونا بھی ضرور ہے، کیونکہ جبتک وہ کسی کی انفرادی ملک نہ ہو، کوئی کیونکر اس میں سے سرکار کو حصہ دیسکتا ہے اور کسی کو دینے کا کیا حق حاصل ہے۔ قومی یا ملکی دولت کی تو سرکار کم و بیش خود ہی مالک ہوتی ہے، صرف انفرادی دولت میں سے اس کو عوام سے حصہ لینا پڑتا ہے۔ لفظ حصہ سے واضح ہوتا ہے کہ ٹیکس انفرادی ملک، اور آمدنی سے ادا کیا جاتا ہے: گویا ٹیکس دہندوں کیواسطے ایثار لازمی ہے، اگرچہ اس ایثار کے نتائج ان کے حق میں کہیں زیادہ مفید اور فیض رساں ثابت ہوں۔ غیر اختیاری طور سے مراد خواہ مخواہ جبر یہ اکراہ نہیں، بلکہ اس واقعے کا اظہار ہے کہ ٹیکس کی مقدار اور طریق و وقت ادائے سرکار خود مقرر کرتی ہے، اور اگرچہ آئینی حکومتوں میں، تقرر ٹیکس کا اختیار بہت کچھ عوام کے نمائندوں کے ہاتھ میں ہے، لیکن بحیثیت اداکنندہ عوام بے بس و ناچار ہیں، اور ٹیکس ادا کرنے میں ان کی خوشی یا مرضی کو دخل نہیں، جو ٹیکس